
فکر تونسوی
فکرنامہ

فکر نامہ

طنزیہ تحریروں کا انتخاب

فکر تونسوی

تقسیم کار
انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

اپنے ہی نام ——

اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں

ترتیب

پیش لفظ

فکرؔ تونسوی طنز نگاروں کی جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں، اُن میں تقریباً سب ہی کے قلم کی سیاہی سوکھ چکی ہے۔ انھوں نے لکھنا بند کر دیا ہے یا خود کو دُہرا رہے ہیں۔ لیکن جدت اور تازگی کی تلاش نے فکرؔ تونسوی کو ادبی موت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ فکرؔ صاحب طنز و مزاح کے لیے خام مواد کتابوں اور تخیّل سے نہیں، بلکہ براہ راست زندگی سے حاصل کرتے ہیں۔

عمر کی ایک منزل ایسی آتی ہے جب بڑے سے بڑے جدت پسند انسان کے فکر و خیال اور احساس میں جمود آجاتا ہے اور وہ اپنے ذہن کے دریچوں کو اس طرح بند کر لیتا ہے کہ نئی فکر کی تازہ ہوا بالکل نہیں آپاتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ

پرانی نسل نئی نسل کے مقابلے میں احساس برتری کا شکار ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ احساس برتری احساس کمتری کی دوسری شکل ہوتی ہے، اور وہی فن کار ادبی موت کے چنگل سے بچتا ہے جو نئی نسل اور نئے حالات کا ساتھ دیتا ہے۔ ایک حساس اور باشعور انسان کو ہر لحے بدلتی ہوئی زندگی نئی بصیرت اور نئی آگہی دیتی ہے جس سے نئے نئے موضوعات جنم لیتے ہیں میرے اس دعوے کا ثبوت روزانہ "ملاپ" کا مزاحیہ کالم ہے۔ جسے فکر تونسوی لکھتے ہیں۔ میری طرح سینکڑوں لوگ اخبار کی شاہ سرخی پڑھ کر مزاحیہ کالم "پیاز کے چھلکے" کے لیے صفحہ پلٹ لیتے ہیں، اور یہ پورا کالم پڑھنے کے بعد ہی اخبار کا باقاعدہ مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ فکر صاحب نے اس کالم میں کسی موضوع پر دوبارہ قلم اٹھایا ہو۔ اخبار کی خبروں کی طرح ان کا کالم ہمیشہ تازہ ہوتا ہے۔ صرف تازگی ہی اس کی خصوصیت نہیں، بلکہ اس میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی بصیرت، آگہی اور باریک بینی ہوتی ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے فکر صاحب صحافی ہیں اور انھیں ہر حال میں روزانہ ایک کالم لکھنا ہوتا ہے لیکن یہاں کی تخلیقی صلاحیتوں کا جادو ہے کہ ان تحریروں میں صحافیانہ انداز کے بجائے ادبی چاشنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملاپ کے مزاحیہ کالم کتابی صورت میں مرتب ہو کر اردو کے مزاحیہ ادب کا حصہ بن جاتے ہیں۔

فکر صاحب کی پیاز دیوار چین کی طرح ہے۔ جسے یاجوج ماجوج رات بھر چاٹ چاٹ کر بہت چھوٹا کر دیا کرتے تھے۔ لیکن صبح کو وہ پھر اپنی اصل صورت میں آ جاتی تھی۔ فکر صاحب ہر روز صبح کو پیاز کے چھلکے اتارتے ہیں لیکن پیاز رات کو پھر اتنی ہی ہو جاتی ہے۔

ابھی تک پیازر نے ہار مانی ہے اور نہ فکر نے۔ اُردو کے طنزیہ ادب کے لیے وہ منحوس ترین دن ہوگا جب ان دونوں میں سے کوئی اپنی شکست مان لے گا۔

بسیار نویسی اور زود نویسی کے باوجود طنز و مزاح کا اعلیٰ ترین معیار برقرار رکھنا ایک معجزے سے کم نہیں۔ اور فکر صاحب برسوں سے یہ معجزہ دکھا رہے ہیں۔

فکر نے اس دور میں ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا جب ہمارا ایک سیاسی نظام ختم ہو کر دوسرا نظام شروع ہوا تھا۔ لیکن جس کے اقتصادی نظام میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ہندوستانیوں کو یقین تھا کہ آزادی ملتے ہی ان کے سب دُکھ دور ہو جائیں گے یہ محض خام خیالی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ حکومت کرنے والے صرف ہاتھ بدلے تھے۔ ہندوستانیوں کی وہ دولت جو پہلے سمندر پار چلی جاتی تھی اب اس کی تکلیف دہ نمائش ہندوستانیوں ہی کے ایک محدود ترین طبقے میں ہو رہی تھی۔ جس نے ہم سب کو بے یقینی، احساس کمتری، عدم اعتماد اور معاشی بحران میں مبتلا کر دیا۔

فکر صاحب میں مصلح یا پیغامبر بننے کی صلاحیت نہیں۔ کیونکہ وہ خود کو سماج کا ایک عام فرد سمجھتے ہیں۔ انہیں بھی مصائب و آلام کا سامنا ہے۔ لیکن وہ ناامید ہو کر ذات کے نہاں خانوں میں گم نہیں ہوئے۔ وہ طنز و مزاح کے ہتھیار لے کر اس میدان جنگ میں کود ے ہیں۔ وہ اپنے فن کے ذریعہ انسان میں حوصلہ اور ہمت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ شمع کی طرح جل کر دوسروں کو روشنی پہونچانے کے

قایل ہیں۔ خدا اس شمع کو ہمیشہ روشن رکھے۔
"فکر نامہ" فکر صاحب کی ساری زندگی کی ادبی کاوشوں کا نچوڑ ہے۔ پوری کوشش کی گئی ہے کہ اس انتخاب میں اُن کی تمام نمائندہ تحریریں شامل ہو جائیں۔

خلیق انجم

جنرل سکریٹری

تعارف

میں فکر تونسوی کو ایک شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا۔ مجھے ان کے شاعر ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ صرف ان کے نام کے آگے تونسوی پر معترض تھا مگر جب شاعروں کے نام کے ساتھ جار چوی اور جھنجھانوی ایسے القاب دیکھ لیے تو اپنا اعتراض واپس لے لیا۔

پھر سنا فکر تونسوی نے شاعری ترک کر کے طنز نگاری اختیار کی ہے تو دل ڈوبنے لگا کیونکہ بڑے بوڑھوں سے سن رکھا ہے کہ اچھے شاعر کبھی اچھے طنز نگار ثابت نہیں ہوتے۔ حسِ مزاح کی کمی ہوتی ہے۔ مگر جب پے در پے فکر کے طنزیہ مضامین پڑھنے کو ملے تو ماننا پڑا کہ ہر کلیے کے ساتھ چند استثنا بھی لگے رہتے ہیں۔ دنیا کے لیے وہ اب بھی فکر تونسوی ہیں، میرے لیے فکر طنزوی ہو کر رہ گئے ہیں۔

ہر مقبول طنز نگار اس میدان میں وارد ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے کو، پھر اپنی بیوی کو طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ وہ ملا رموزی ہوں۔ شوکت تھانوی یا فکر تونسوی۔ یہ ہر دو ہستیاں اس لیے بھی مقبول ہیں کہ انھیں طنز کا نشانہ بنانے میں دعوٰے ازالۂ حیثیت عرفی کا کوئی خطرہ نہیں (ایدھا سیدھا تو ہین عزت لکھو تو کسی پر رعب نہیں پڑے گا۔" ازالۂ حیثیتِ عرفی"۔ بھاری بھر کم معلوم ہوتا ہے نا؟) "بیویوں کی ٹریڈ یونین" میں فکر کی بیوی آزادیٔ نسواں ________ کی قائل معلوم ہوتی ہیں۔ کسی دوسرے مضمون میں پرانے رسم و رواج کی عادی، کبھی وہ شاہ خرچ معلوم ہوتی ہیں،

کہیں پر پیسے کو دانت سے پکڑنے والی۔ کہیں پر اپنے اطوار و گفتار میں شہد و شکر کی طرح شیریں، کہیں پر نیزے کی آنی کی طرح تیز و تند۔ دراصل فکر دوسروں کی بیویوں میں جو عیب یا خرابی دیکھتے ہیں فوراً اپنی بیوی پر لاد دیتے ہیں۔ اس میں آسانی بھی رہتی ہے۔ بیویاں اپنے شوہروں کے مضامین کو "خرافات" سمجھ کر نہیں پڑھتیں۔ کسی دوسرے کی بیوی کا شوہر سر پھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اور بات کہنے کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے۔ کچھ عیب جُو اس امر کو صحیح نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں صحیح بات یہ ہے کہ فکر اپنی بیوی تو بدل نہیں سکتے، اس کی عادتیں بدلتے رہتے ہیں، طنز نگاری کی خاطر یا تنوع کی خاطر کون جانے؟

اپنے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین میں فکر اپنے آپ کو ہدفِ ملامت بنانے سے نہیں چوکتے، ایک تو انھیں اپنی شکل و صورت پر اعتراض ہے۔ مجھے بھی اعتراض ہے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہم میں سے کون فلمی ہیرو ہے۔ کرشن چندر، کنھیا لال کپور، مجتبیٰ حسین، فکر تونسوی، ضمیر جعفری، یوسف ناظم، سوئے ادب نہ ہو اس لیے بڑے بزرگوں کے نام نہیں گنتا۔ مگر اصل قصہ یوں ہے کہ جب خدا نے طنز نگاروں کو بنایا تو اتنا تو سوچ لیا تھا کہ یہ لوگ دوسروں پر ہنسیں گے۔ اس لیے ان پر دوسروں کے ہنسنے ہنسانے کا سامان بھی پیدا کر دیا گیا تاکہ توازن برقرار رہے۔

مگر یہ تو ایک فروعی امر ہے۔ فکر دراصل اپنی ذات کو سارے سماج کی خامیوں کا مرقع بنا کر ہنستے ہیں۔ ان کی ذات تو ایک کھونٹی ہے جس پر وہ افراد اور سماج۔ حالات اور کردار۔ نفسیات اور اخلاقیات۔ منافقت اور مذہبیت کے مظالم اور مکر و فن، شعبدے اور تضاد کے سراب اور ان کے رنگا رنگ ملبوس ٹانک ٹانک کر قارئین کو ان کی شعبدہ گری اور ملمع بازی کے اندر چھپی ہوئی بدصورت حقیقت سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ بادی النظر میں فکر اپنے آپ پر ہنستے ہیں۔ گہری نظر سے دیکھیے تو وہ دنیا پر ہنستے ہیں۔ اور گہری نظر سے دیکھیے تو وہ ہنستے نہیں ہیں، رو رہے ہوتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ طنز نگار کے آنسو کسی نے نہیں دیکھے۔ افسانہ نگار۔ ناول نگار۔ وقائع نگار

زندگی کے المیے پر آپ کو رلاتا ہے۔ طنز نگار ہنساتا ہے۔ وہ ادب کے صدف میں ایک آنسو کو منجمد کر کے اُسے دُرِ آبدار بنا دیتا ہے۔ اس ہنسی کی پرتوں کو ٹٹول ٹٹول کر اس ایک آنسو کی نرمی گرمی اور آنچ کو پا لینا کسی مہذب قاری ہی کا کام ہے۔ ورنہ آج کل اکثر مجلس قہقہہ مرتب ہوتی ہے۔ جہاں ہزاروں لوگ کسی ایک فقرے کی ظاہری تراش وخراش پر سوچے سمجھے بغیر بے تحاشا قہقہے لگاتے ہیں۔ مگر اس ایک آنسو تک کون پہنچ سکتا ہے!

فکر کے مزاح اور طنز کی کئی پرتیں ہیں۔ اسی لیے شاید اُس نے اپنے فکاہیہ کالم کا نام "پیاز کے چھلکے" رکھا ہے جو شمالی ہند کے روزنامے "ملاپ" میں بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے اور جس نے شمالی ہند کے لوگوں کی حسِ مزاح کی صحت اور تہذیب میں ایک بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ پیاز کے پہلے دو ایک چھلکے زیادہ کڑوے نہیں ہوتے۔ یہی حال فکر کے مزاح کا بھی ہے۔ پھر جوں جوں پیاز کے چھلکے اُترتے جاتے ہیں اُس کی کڑواہٹ بڑھتی جاتی ہے۔ یہی حال فکر کے طنز کا بھی ہے۔ آخری گٹھلی بڑی کڑوی ہوتی ہے۔ اس قدر کہ آنکھ میں آنسو آجاتے ہیں۔ اسی طرح جب آپ فکر کے مزاح کی آخری گٹھلی پر پہنچتے ہیں تو ذہن میں اس کی تلخی اپنی پوری تیزی اور تندی کے ساتھ چھا جاتی ہے۔ پیاز کے چھلکے ... اسم بامسمّیٰ اسی کو کہتے ہیں۔

فکری اعتبار سے وہ سوشلسٹ ہیں۔ انقلابی۔ آدرش وادی۔ وہ اس گلے سڑے سماج کو بدلنا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی معیشت کو توانا اور توانا دیکھنا چاہتے ہیں۔ نابرابری کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ پرانے فیوڈل اسالیب کی جگہ انسانیت پرست اقدار کو رواج دینا چاہتے ہیں۔ زندگی میں جہاں جہاں پر بدصورتی ہے، ظلم ہے، پسپائی ہے، اندھی اعتقاد پرستی ہے۔ اس کی جگہ فکر اک ایسے نظام نو کے حامی ہیں جہاں رنگ ونور کی شادابی ہو، باہمی الفت اور محبت کی باریابی ہو اور نئی فکر ونظر اور نئے سائنسی علوم کی کامیابی ہو

فکر اپنے طنز ومزاح میں ہمیشہ ان مقاصد کے لیے لڑتے ہیں جن کے لیے

صدیوں سے انسانیت پرست ادیب ہر ملک اور ہر عہد میں لڑتے اور جد و جہد کرتے آئے ہیں۔ فکر نے اپنے مقصد کی آفاقیت اور اپنے فن کی بلوغت پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ ان کا مقصد اعلا ہے اور کہنے کا ڈھنگ نرالا ہے اس لیے ادب کی تاریخ میں وہ ہمیشہ عزت و احترام سے یاد رکھے جائیں گے۔

کرشن چندر

فکر بیتی

میرے جنم پر دیوتاؤں نے آکاش سے پھول نہیں برسائے۔ کیونکہ وہ جیند کے راج محل پر پھول برسانے میں مصروف تھے۔ وہاں ایک شہزادے نے جنم لیا تھا یعنی جنم سے ہی میرے اور دیوتاؤں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے ——— اب تک کشیدہ ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ شہزادے اور ادیب کو ایک ہی تاریخ اور ایک نکھشتر میں پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ اسے آپ قانون فطرت کا نقص بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن دیوتاؤں کا رول بھی غیر شریفانہ نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ انھیں پھولوں کے استعمال کا مناسب ڈھنگ آنا چاہیئے تھا۔ اور اگر نہیں آتا تو خدا کو کچھ انٹیلیجنٹ دیوتا پیدا کرنے چاہئیں۔

میں تونسہ میں پیدا ہوا۔ اگر تونسہ میں پیدا نہ ہوتا تو لاڑکانہ میں پیدا ہو جاتا۔ ٹمبکٹو بھی کوئی بری جگہ نہیں تھی۔ لیکن ہر جگہ مجھے فکر ہی کہا جاتا اور ہر جگہ میرا باپ چوہدری نرائن سنگھ نہ میر منشی دھنپت رائے ہی ہوتا۔ جس کے گھر خلاف توقع ایک ادیب پیدا ہوا تھا۔ اور دیوتا پھول نہ برساتے ہوئے اس ٹیکنیکل بنا پر کہ میر منشی کی حیثیت کے نیچے ڈیڑھ سو کمرے نہیں ہیں۔ صرف ڈیڑھ کمرہ ہے۔

بیس برس بعد میرے باپ نے مجھ پر انکشاف کیا "تمھارے پیدائش کی خبر

مجھے جینتو ساربان نے سنائی تھی۔ تو میرے منہ سے صرف اتنا نکلا تھا " یہ ساتواں بچہ ہے اور شاید بھائیوں کی طرح بھوکوں مرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔"

یعنی میرے والد (مرحوم) کے لئے میری پیدائش کی اہمیت صرف ہندسوں تک محدود تھی، پانچواں، چھٹا، ساتواں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ناؤں کے ساتھ ساتھ ہندسوں سے بھی میرے تعلقات بگڑ گئے۔ آج تک بگڑے ہوئے ہیں۔

ہندسوں کو تو انسان کا مقدر نہیں بننا چاہئے۔

مگر جینتو ساربان مجھے ہندسہ نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ ایک بچہ سمجھتا تھا۔ جس میں معصومیت ہوتی ہے۔ وہ گاؤں میں واحد شخص تھا جس نے مجھے پیار سے دیکھا مجھے بیں گڑ کی ٹانگڑی بانٹی اور اتنا بھی نہیں سوچا کہ وہ ایک سستی اور گھٹیا چیز بانٹ رہا ہے۔ وہ صرف اس بات کا قائل تھا کہ خوشی بانٹنی چاہئے۔ چاہے وہ گھٹیا اور سستی ہی کیوں نہ ہو۔

اور پھر ایک دن مجھے یوں لگا جیسے جینتو ساربان کی بیٹی بھانو جوان ہو گئی ہے اور بھانو کو دیکھتے ہی میں نے بھی چھلانگ لگائی اور جوان ہو گیا۔ اس چھلانگ پر مجھے حیرت ہوئی اور مسرت بھی ہوئی۔ اور یہ مسرت تیجرلی تجربے نے ہم دونوں کے ہونٹوں پر گلاب کھلائے اور میرے باپ اور جینتو ساربان کی ڈاڑھی میں ایک دم سفید بال اگ آئے اور میں نے بھانو کے گھڑے پر ایک ہلکا سا "ٹن" کنکر پھینکا۔ جسے اٹھائے ہوئے وہ کنوئیں سے آ رہی تھی۔ اس "ٹن" سے اس کے سر اور چھاتی میں ایک دلکش تناؤ آ گیا۔

"تمھیں شرم نہیں آتی" بھانو نے تن تنائی چھاتی کو ہاتھ سے ڈھانپ کر کہا۔

"آتی ہے" میں مسکرایا۔

وہ منہ پھیر کر شرما گئی وہ شرمانے کی اوٹ میں مسکرایا کرتی تھی۔

اور پھر کئی دن تک ہم اپنے دل کی دھڑکنوں کی بھاشا سمجھتے رہے اور پھر دل ہی دل میں اعلان کیا کہ یہ پیار کی بھاشا ہے اور اس پیار میں جینتو ساربان

کو وہی معصومیت نظر آئی جو ایک بچے میں ہوتی ہے اور اس نے میرے باپ سے کہا "میر منشی! تمہارا بیٹا میری بھانو کے گھڑے پر کنکر پھینکتا ہے۔"

"اسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بھانو خاندان شریف ہے۔" میرے باپ کا خیال تھا کہ جن بچوں کو باسی سوکھے ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھانے کو ملتے ہیں وہ شریف خاندان کے بچے کہلا سکتے ہیں۔ مرغ وہاں کسی کی زرخرید غلام نہیں ہوتے

میرا باپ ایسی زمین میں خوش رہنا زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ مگر اس خوشی کو ایک دن نمبردار کے لڑکے داؤد خاں نے زبردست دھکا دیا۔ جب بھانو شباب کا سرخ رومال لیے کنوئیں سے آ رہی تھی اور میرے کنکر کا منتظر کھڑی تھی تو داؤد خاں نے اپنی ریشمیں قمیص کے بازو بھانو کے راستے میں پھیلا دیئے۔ وہ بازو کنکر نہیں تھے۔ بلکہ داؤد انہیں آغوش محبت سمجھ رہا تھا۔ اس نے بھانو کو چیلنج دیا۔ "مجھ سے عشق کرو۔ ورنہ . . . ."

"ورنہ . . . .؟" بھانو نے ورنہ بہتر کے لہجے میں کہا۔ ایسی بات وہ گاؤں بھر سوائے میرے ہر ایک سے کہہ سکتی تھی۔ مگر جنیو ساربان کے پاس صرف دو اونٹ تھے۔ اور نمبردار کے پاس تین گھوڑیاں، پانچ بیل اور چھ شکاری کتے تھے۔ ان سبھوں نے مل کر بھانو کو سوتے میں اٹھا لیا اور ایک پہاڑی کھوہ میں لے گئے۔ اور پھر پہاڑ کی کھوہ سے مجھے چیخیں سنائی دیں۔ اور الوؤں نے منحوس آوازیں نکالیں اور پہاڑی کوّے کائیں کائیں کرتے ہوئے کھوہ سے بھاگ گئے اور میری چھت پر آ گئے۔ یہ عشق کی معصومیت کی اور اس کی روح کی توہین تھی۔ جیسے آگے چل کر شاعر و ادیب کے تمدن میں دھنسا تھا۔

"ایسا کیوں؟ آخر کیوں؟" میں نے باپ سے پوچھا؛ جنیو ساربان سے پوچھا۔ دونوں نے ہم آہنگ ہو کر جواب دیا "ایسا ہی ہوتا ہے بیٹا! یہ جگ کی ریت ہے، جس میں نمبردار اور تحصیلدار ایک دسترخوان پر بیٹھ کر مرغی کھاتے ہیں۔ اور جن کے بچے باسی کڑھی کھاتے ہیں۔ مرغی ان کی فریاد نہیں سنتی۔

اور پھر میں راتوں رات گاؤں سے بھاگ گیا۔ اور گاؤں میں کسی کو بھی نہیں بتایا
کہ میں ایسے جگ کو بدل دوں گا اور مرغی اور باسی روٹی کا فاصلہ مٹا دوں گا۔ بھالو
کو بھی نہیں بتایا۔ کیسے بتاتا۔ اس نے تو کنویں میں چھلانگ لگا دی تھی۔ باسی
ٹکڑے نے اپنی توہین کے بدلے خودکشی کر لی تھی۔

چنانچہ خودکشی سے بھی میرے تعلقات بگڑ گئے۔ ایسی بھالو سے بھی بگڑ گئے
جو خودکشی کر کے سمجھتی ہے کہ اس سے تھانیدار اور نمبردار کے دسترخوان سے
مرغی بھاگ جائے گی۔

اور پھر ایک دن یوں ہوا۔ کہ میری ننھی معصوم بچی راج رانی جس کے پاس
نہ راج تھا نہ وہ رانی تھی۔ صرف ایک گلاسٹر کیلا اور کتابیں تھیں۔ بستے میں
باندھے اسکول جا رہی تھی۔ کہ یکایک خطرے کا ہارن بجا۔ آسمان پر ہوائی جہاز
منڈلانے لگے۔ ان ہوائی جہازوں میں کوئی لسنہ کیلا اور کتاب نہیں تھی۔ بلکہ بم تھے
اور انھوں نے کہا کہ یہ جنگ ہے۔ اور اگر تم اسکول جاؤ گی تو بم پھینک کر ہم تمھیں
ہلاک کر دیں گے۔ کیونکہ ہم نے کتابیں پڑھ کر ہی یہ بم بنائے ہیں۔ اور معصومیت پر
یہ بم مجھے یوں لگا جیسے نمبردار کا لڑکا داؤد خاں بھالو کے گھڑے پر اپنے گھوڑے
کا سم مار کر کہہ رہا ہو مجھ سے عشق کرو، ورنہ ۔۔۔۔۔"

اور مجھے غصہ آگیا۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ غصہ انسان کو اندھا بنا دیتا ہے۔ پھر
میں نے لاؤڈ اسپیکر اپنے کاندھے پر رکھ لیا اور گاؤں گاؤں گھومنے لگا۔ "ہم امن
چاہتے ہیں۔ امن۔ کس لئے؟ ننھی راج رانی کے لئے۔ اس کے بستے کے لئے
پرائمری مدرسے کیلئے معصوم آنکھوں میں گنگناتے ٹیگور اور کالی داس کے لئے۔

اور گاؤں کے اوبڑ کھابڑ راستوں پر مجھے کانٹے چبھے جھاڑیوں نے الجھایا
کیچڑ نے لت پت کیا، سوکھی سڑی چائے، ابلتی بھوک اور ہونٹوں کی پپڑیوں نے
مجھے پھانسے دیئے کہ یہ مقدس کاز ہے۔ ہیڑی پلٹا کھائے گی۔ اور مرغی اور باسی
روٹی کا فاصلہ مٹ جائے گا۔ اور کسی بھالو کا گھڑا خودکشی نہیں کرے گا۔ اور پھر

ہوائی جہاز کا بم سنرم سے گھل جائے گا اور معصوم راج رانی کا گلا سڑا کیلا ایک سیب میں بدل جائے گا۔ اور اس سیب پر ٹیگور کی گیتا نجلی لکھی جائے گی۔

لیکن جب میں امن کا لاوڈ اسپیکر کاندھے پر رکھے چل رہا تھا تو ایک ٹیلے پر مجھے بابا گوردھن سنگھ ملا جو پندرہ برس تک کیلے کو سیب میں بدلنے کی خاطر جیل میں رہا تھا۔ اس کی معصوم بھانجی کو کسی نے بم سے ہلاک کر دیا تھا اور وہ غصے میں آکر غدری بابا بن گیا تھا اور امریکہ بھاگ گیا تھا۔ وہاں سے دخانی جہاز میں بندوقیں بھرلایا تھا مگر جہاز کو بابا اور بندوق سمیت انڈمان جیل کی دلدل میں پھینک دیا گیا تھا۔

ایسا تھا بابا گودھن سنگھ۔ اس نے میرے کندھے پر امن کی فاختہ کو دیکھ کر استہزائیہ قہقہہ لگایا اور کہا۔

"تم بیوقوف ہو ینگ مین!"

کیا امن کی صدا لگانا بے وقوفی ہے بابا؟"

"کیسا امن؟ کس کے ساتھ امن؟ وہ نتھنے پھڑکا کر بولا۔" جو لوگ شکاری کتے چھوڑ کر ٹیگور کی گیتوں کو بھنبھوڑتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہم امن سے کیسے رہ سکتے ہیں۔ مرغی کو تم نے پالا ہے، مگر اسے نمبردار کا بیٹا تھانیدار کے ساتھ بیٹھکر کھا جاتا ہے۔ کیا ہم اس کے ساتھ امن سے رہیں! تمھارا باپ کیا کام کرتا تھا۔

"چوہدری نرائن سنگھ کا میر منشی تھا"

"بس وہی! اس نے امن کا لاوڈ اسپیکر زور سے گرا دیا۔" تمھارے چہرے پر جوانی میں جو جھریاں ہیں۔ وہ اسی نرائن سنگھ نے ڈالی ہیں۔ یہ جھریاں جب مٹ سکتی ہیں۔ جب ہم نرائن سنگھ سے جنگ کریں گے۔ امن نہیں۔"

کیا بابا گوردھن سنگھ میرے باپ کی طرح ایبوژن ہیں توسن رہنا جانتا تھا؟ چند ماہ بعد سنا کہ بابا گوردھن کے تعاقب میں پولیس نے اس کی ریڑھ کی ہڈی پر گولی چلا دی۔ الزام یہ تھا کہ اس نے کسی چوہدری نرائن سنگھ کی جاگیر میں آتشیں اسلحہ دبا رکھا تھا تاکہ اس کی فصل۔

تعلقات کشیدہ کرنے کے لئے ہی اس دنیا میں آیا تھا۔

نہایت احترام سے یہ سوال میں نے جیمنی داس رنگ ساز سے کیا، جو مجھ سے آٹھ گھنٹے روزانہ کام لیتا تھا اور دو آنے روزانہ دیتا تھا۔ میں اس کی بھارت رنگ ساز کمپنی میں حسیناؤں کے دوپٹے اور معززین کی پگڑیاں نارنجی، گلابی سرمئی رنگتا تھا کیونکہ مجھے بھوک لگتی تھی اور کمپنی کو اس بھوک کا علم تھا۔ دو آنے میں دال روٹی تو ملتی تھی۔ لیکن آلو گوبھی کی اسپیشل سبزی نہیں ملتی تھی۔ ڈھابے کے مالک سری چند کو میں نے لاکھ سمجھایا کہ اسپیشل سبزی کے لئے میرا من بے حد للچاتا ہے۔ لیکن وہ کہتا۔ لالچ بری بلا ہے۔ شاستروں میں اسے پاپ کہا گیا ہے

میں نے سوچا، شاستر دو آنے روزانہ پانے والوں کے لئے نہیں لکھے گئے۔

اور ایک دن بور ہو کر میں نے جیمنی داس سے کہہ دیا۔ ''ماسٹر جی! کبھی کبھی یوں لگتا ہے، جیسے میرے آپ کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے۔''

وہ بولا ''کوئی حرج نہیں۔ میرے تعلقات تو اس سپاہی سے بھی کشیدہ ہو گئے ہیں جو مجھ سے پانچ روپیہ ماہانہ رشوت لیتا ہے۔ تم کیا ہو تم کو اتنا شعور بھی نہیں کہ نارنجی اور نیلا رنگ ملنے سے کون سا رنگ جنم لیتا ہے، قرمزی یا بادامی۔''

میں نے کہا ''میں تو اتنا جانتا ہوں کہ تھانیدار کا رنگ جب کرنسی نوٹ کے رنگ میں ملتا ہے تو مچھلی کا رنگ جنم لیتا۔ جسے آپ ہر شام شاموں مچھلی فروش سے خرید کر کھاتے ہیں۔''

یہ سن کر جیمنی داس نے مجھے فحش گالی دی۔ اور ملازمت سے الگ کر دیا۔ اور کہا۔ تم دوپٹے رنگنے کا فن کبھی نہیں جان سکتے۔ زیادہ سے زیادہ تم پگڑی اور دوپٹے کی قوس قزح پر ایک نظم لکھ سکتے ہو۔

لہٰذا ہنو اور کیوں!

میں نے تھانیدار سے پوچھا: اس نے کہا۔ اگرچہ فی الحال جیمنی داس

سے میرے تعلقات کشیدہ ہیں۔ لیکن رنگوں کے متعلق اس کا نقطۂ نگاہ صحیح ہے
وہ رنگوں کی بھاشا زیادہ سمجھتا ہے جبھی تو مچھلی کھاتا ہے۔

میں نے دل ہی دل میں بھاشا ہیندار پر اپنی ہمت انڈیلی۔ اور بھاگ گیا، بھاگتا گیا۔ بھاگتا گیا حتیٰ کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

دراصل بھاگتے بھاگتے میں "تیل چنبیلی سپیشل" کی فرم کے قریب سے گذر رہا تھا جس کے مالک دھومی مل نے مجھے لسماندگی سے ہونکتے دیکھ کر میرے ہاتھ میں برش اور سیاہی کا ڈبہ پکڑا دیا کہ ہمارے تیل کا اشتہار شہر بھر کی دیواروں پر لکھ آؤ۔ تم بہت ترقی کر جاؤ گے۔ جس آدمی کو دو لقمے مل جائیں۔ اسے ترقی کہتے ہیں۔

مگر میں نے سوچا کہ دو لقمے بانٹنے کا سہرا انھیں ملتا ہے جو تیل کی ساخت میں گاہکوں سے فراڈ کرتے ہیں۔ ایک دن میں نے دھومی مل فراڈ سے کہا۔ "مجھے چار آنے عنایت کر دیجئے۔ کیونکہ آج خطرہ ہے کہ اشتہار لکھتے لکھتے مجھے بھوک لگ جائے گی۔"

وہ بولا: "میرے بزنس کا اصول ہے کہ مزدوروں کو جب پسینہ آئے اسے اجرت دے دو۔ لہٰذا جاؤ، پہلے پسینہ پیدا کرو۔"

میں نے کہا۔ "بڑا زریں اصول ہے۔ لہٰذا ہی ہی ہی!"

"ہی ہی ہی۔" اس نے میری تائید کی۔

اور پھر دن بھر مئی مہینے کی انگارے اگلتی دھوپ میں دیواریں لکھتے لکھتے مجھ پر ہندوستان بھر کا افلاس گذر گیا۔ مجھے پسینہ آیا۔ پپڑیاں جمیں۔ آنکھوں میں چنگاریاں تڑتڑائیں۔ جسم میں پے در پے تھرتھریاں آئیں۔ ہر مسام سے بھوک کے ببولے پھیلنے لگے۔ نروس سسٹم کو سینکڑوں جھٹکے لگے۔ اور میں دھومی مل کی فرم سے دس بارہ گز کے فاصلے پر غش کھا کر گر پڑا۔ میرا پسینہ دھومی مل نے دیکھا یا نہیں لیکن جب چھتیس گھنٹے کے بعد مجھے ہوش آیا تو میں ایک تانگے میں لیٹا تھا — اور

ہماچل پردیش کی ایک حسینہ مجھے پنکھا جھل رہی تھی۔

میں نے پوچھا: "کیا تم جیتہ ساربان کی بیٹی پدما تو ہو؟"

وہ پہاڑی جھیل سے اپنی ستھری جھانیاں چھپاتے ہوئے بولی۔" پہلے تم بتاؤ تمہارا گھر کہاں ہے۔ مجھے تم پر پیار آرہا ہے مجھے دلہن بنا کر گھر لے چلو!

میں نے کہا: "اس دنیا میں جنم لیتے ہی میرا گھر کھو گیا۔ جب تک میں اسے تلاش نہ کرلوں اس وقت تک تم میری دلہن بننا ملتوی کردو۔"

لیکن اس نے بتایا کہ بہت جلدی میں ہے۔ وہ چار منٹ میں کسی کی دلہن بننا چاہتی ہے۔ ورنہ وہ حرامی نوسر باز آجائے گا۔ جو مجھے بہکا کر لایا ہے کہ میں تمھیں شہر کی راجکماری بنا دوں گا۔ لیکن یہاں لا کر اس نے میرے کنوارپن کا ریٹ مقرر کردیا۔ اس لئے آؤ .... آدھ ریٹ کی اس دنیا سے بھاگ چلیں اور کسی پہاڑی کھوہ میں بیٹھ کر دلہا دلہن کا ازلی گیت گائیں۔

اور میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ کل جب وہ نوسر باز نشے میں میرے رخسار کو گنڈیری سمجھ کر چوس رہا تھا تو کہہ رہا تھا کہ میں انسانیت پرست ہوں۔ اس نے بے ہوش چھوکرے کو سڑک سے اٹھا لایا۔ کیونکہ اس کی ناک بڑی معصوم لگی، مجھے دھوکا نہ دینے والی لگی۔ میں دھوکے والی ناکوں کی خوب پہچان رکھتا ہوں میں اسے اپنا شاگرد بنا دوں گا۔

مگر پھر دلہا دلہن کے بھاگنے سے پہلے چھاپہ مار پولیس آگئی اور نوسر باز کے شاگرد کو گرفتار کر کے لے گئی اور پھر نوسر باز کو زندگی بھر نہ پکڑ سکی۔ پولیس کو اس کی اور میری ناک کی پہچان نہیں تھی۔ جبھی ناک اور پولیس سے میرے تعلقات کشیدہ ہو گئے آج تک کشیدہ چلے آرہے ہیں۔

اور پھر مجھے یاد نہیں۔ میں رک گیا۔ اور جیسے مجھ پر صدیاں گزر گئیں۔ ازل سے ابد تک پھیلنے والا انسانی کارواں گزر گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ کچھ گھاؤ ہیں۔ کچھ پٹڑیاں ہیں کچھ انگارے ہیں جو میرا مسلسل تعاقب کر رہے ہیں۔ انھوں نے گیا کے جنگل میں

مجھے روک لیا، وہاں شاید ایک گھنا پیڑ تھا اور وہاں ایک بودھ، ایک گیانی بیٹھا
تپسیا کر رہا تھا اور پھر لگا کے آسمان سے ایک قلم گرا اور صدا آئی "جہاں جہاں سے
بھاگے ہو، وہاں وہاں واپس جاؤ اور اس قلم سے تپسیا کرو اور اس تپسیا سے گھاؤ کو
اور پیڑی کو اور انگارے کو حسن، جذبے اور الفاظ عطا کرو اور یہ خدا کا حکم ہے اور
یاد رکھو، خدا کا حکم اٹل ہوتا ہے...."

اور اس صدا میں مسرت تھی جو میرے مساموں سے پھول کی طرح کھل اٹھی اور
میں نے قلم ہاتھ میں پکڑ لیا جس سے یہ پھول خوشبو دینے لگے۔ اور مجھے یوں لگا جیسے
یہ میرے مقصد حیات کی خوشبو ہے۔ کیلے اور سیب کے فاصلے کو ختم کرنے والی خوشبو
ہے۔ اور اسی خوشبو پر تیرتے تیرتے میں دنیا کو یہ بتانے کا اہل ہو سکا کہ دیوتاؤں نے
میرے جسم پر پھول کیوں نہیں برسائے۔ اور کہ خدا صرف ایک شرط پر انٹیلیجنٹ دیوتا
پیدا کر سکتا ہے۔ اگر بچہ خودکشی نہ کرے بلکہ گوردھن بابے کی طرح نو سر بازوں
سے جنگ کرے۔

جنم سے پُنر جنم تک

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقہ دامِ خیال ہے

آہ! فکر تونسوی

بالآخر ہندوستان کے (بزعم خود مشہور و معروف) ادیب جناب فکر تونسوی راہی ملک عدم ہو گئے۔ اس سے پہلے ان کے والد صاحب بھی انتقال کر گئے تھے۔ اور اس سے پہلے دادا صاحب بھی۔

مرحوم موضع تونسہ ملک پنجاب میں پیدا ہوئے تھے۔ مگر مرے دہلی میں۔ موت کے وقت بریلی میں ہوتے تو بریلی میں مرتے۔ جوانا مرگ نہیں تھے اور خوشی کا مقام ہے کہ وہ اپنی عمر سے نسبتاً زیادہ ہی جی کر مرے۔

مرحوم کو برسوں پہلے ایک پامسٹ نے بتا دیا تھا کہ آپ کو مرنے سے پہلے بیش بہا دولت ملے گی۔ مگر افسوس کہ پامسٹ کی صرف ایک بات صحیح نکلی یعنی وہ مر گئے اور دولت والی بات انتہائی بے بنیاد نکلی ــــ اس پامسٹ کے بارے میں عام مشہور تھا کہ اس کی وہی بات صحیح نکلتی ہے جو واقعی صحیح ہوتی ہے۔

مرحوم کے انتقال میں کوئی حرج نہیں تھا۔ صرف ایک لحاظ سے یہ موت دردناک ہے کہ وہ مرنا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ انھیں دنیا میں ابھی بہت سے کام کرنا تھے۔ مثلاً ـــ انھیں ایک صوفہ سیٹ خریدنا تھا جس کی تمنا وہ پندرہ سال سے لیے پھرتے تھے۔ ایک پبلشر سے تو تو میں میں کرنا تھی۔ جو ابھی تک مرحوم کی شرافت نسبی کے باعث ملتوی چلی آ رہی تھی۔ اور انھیں کسی حسینہ سے محبت بھی کرنا تھی۔ کیونکہ یہ کام کبھی گزشتہ چالیس

برس سے التوا میں پڑا تھا۔

مرحوم کو وہم تھا کہ وہ کسی اونچی جگہ سے گر کر مریں گے۔ چنانچہ مرحوم نے ہر اونچی چیز سے پرہیز کرنا تھا۔ اونچے پہاڑ، اونچی سواری اونچے جانور، اونچے آدمیوں حتیٰ کہ اونچے عہدے پر پہنچنے سے بھی بچتے تھے۔ ایک مرتبہ انھیں اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں ترقی کرتے کرتے وہ کمیونسٹ پارٹی میں لیڈر نہ بن جائیں۔ چنانچہ اسی ڈر سے کمیونسٹ پارٹی چھوڑ دی۔

لہٰذا وہ صرف پیدل ہی چلا کرتے تھے۔ پیدل چلنے کی انھیں کافی مشق تھی اپنے عہد افلاس کے پورے بیس سال پیدل چلتے کاٹ دیئے تھے۔

لیکن ۔۔ نوشتۂ تقدیر کو کیا کہیے کہ باوجود احتیاط کامل کے وہ اونچی جگہ سے ہی گر کر پرلوک سدھارے۔ ایک دن کتاب پڑھتے پڑھتے پیدل جا رہے تھے کہ سڑک کے ایک چھوٹے سے گڑھے میں پاؤں جا پڑا۔ گرے اور پھر اسی وقت اٹھے جب انھیں جنازے کے لئے اٹھایا گیا۔

احتیاط نے انھیں آخری وقت پر دغا دی، حالانکہ انھوں نے پوری زندگی احتیاط میں گزار دی تھی۔ احتیاطاً کبھی گول گپا تک نہیں کھاتے تھے کہ کہیں کھانسی نہ ہو جائے۔ اور جب کھانسی ہو جاتی تو اس کا علاج نہ کرواتے کہ کہیں ڈاکٹر غلط دوائی نہ دے دے۔

مرحوم اپنے پیچھے ایک بیوی، تین بچے اور چند دشمن چھوڑ گئے۔ دشمن دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جن سے مرحوم نے قرضہ لیا تھا اور دوسرے وہ جنھوں نے مرحوم سے قرضہ لیا تھا۔ رسم جنازہ کے وقت تمام دشمنوں نے اعلان کر دیا کہ آج سے دشمنی ختم اور اب ہمیں مرحوم سے کوئی گلا نہیں رہا۔

مرحوم اس سے پہلے بھی ایک بار فوت ہوئے تھے اور ڈیڑھ ماہ تک فوت رہے تھے۔ آخر تنگ آکر ایک اخبار کو چٹھی لکھ دی کہ وہ گنگاپور ضلع چمپارن میں بقید حیات ہیں۔ دراصل وہ موت کا اعلان کر کے عامۃ الناس کو ایک شاک (SHOCK)

دینا چاہتے تھے مگر سوائے بیوی اور مالک مکان کے کسی نے آنسو نہیں بہائے لہٰذا وہ اپنی موت سے بے حد مایوس ہو گئے اور اعلانِ موت کی تردید کر دی۔

مگر اس مرتبہ وہ حقیقتاً انتقال کر گئے ہیں۔ اور ان کی موت کی تصدیق بڑے بڑے اہلِ الرائے اور ثقہ حضرات نے کی ہے۔ ان کے جنازے میں عمائدینِ شہر شامل ہوئے۔ ایک ماتمی جلسہ بھی منعقد کیا گیا، جس میں ان کے پسماندگان کے لئے چندے کی اپیل کی گئی۔ ایک والیٔ شہر کی نے بر سرِ جلسہ اعلان کیا کہ انھوں نے ایک فرم سے ڈیڑھ سو روپیہ لینا ہے وہ وصول کر کے میرے چندے میں شمار کیا جائے (فرم مذکور دیوالیہ ہو چکی تھی)۔ ایک پبلشر نے وعدہ کیا کہ انھوں نے مرحوم پر جو ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ کر رکھا ہے اسے واپس لیتے ہیں اور اس واپسی کو ہی اُن کا امدادی فنڈ تصور کیا جائے۔ اس پر تالیاں بجائی گئیں اور پبلشر کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔

مرحوم چند ایک اوصافِ حمیدہ کے مالک تھے اور چند ایک اوصافِ حمیدہ کے مالک نہیں تھے۔ اس لئے بڑے متوازن انسان تھے۔

دوسروں کو اذیت نہیں دیتے تھے۔ اپنے بچے کو چپت مارتے تو بچے کے بجائے خود رونے لگتے۔ شفقتِ پدری کے سبب نہیں بلکہ اس ڈر سے کہ بچہ بُرا مان جائے گا۔ بڑے بوڑھوں سے بہت کم بولتے تھے کہ کہیں کوئی اختلافِ رائے پیدا نہ ہو جائے۔ کم تعلیم یافتہ لوگوں میں حسد کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ قرض لے کر اتنی جلدی لوٹا دیتے تھے کہ قرض خواہ کو شک پڑ جاتا کہ مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن کئی بار قرض لے کر کبھی واپس ہی نہ کرتے۔ اور اپنے آپ کو کافی رذیل محسوس کرتے۔ اصولی طور پر خودی کے قائل تھے۔ لیکن آخری عمر میں خاصے خوشامدی ہو گئے تھے۔ کہا کرتے تھے خوشامد کے بغیر خودی کو برقرار رکھنا انتہائی مشکل ہے۔ مگر اپنی خوشامد کا مذاق بھی اڑایا کرتے تھے غرض بڑے رنگا رنگ آدمی تھے۔

مرحوم کو اپنے خیالات ظاہر کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اور یہی شوق انھیں لے ڈوبا

یعنی اپنے خیالات، ظاہر کر بیٹھتے اور ـــ یوں اپنا ترکش خالی کر بیٹھتے۔ چنانچہ لوگ
انھیں تنہا پاکر ہلاک دیتے۔ اپنی طاقت کو پراسرار نہیں رکھ سکتے تھے، نتیجتاً معمولی
دھوبیوں اور حلوائیوں تک سے مار کھا جاتے اور پھر نسُوے بہاتے کہ دنیا کمینی ہے
کور ذوق ہے (آہ! دنیا کے متعلق مرحوم کا تجزیہ کتنا صلاۃ تھا؟)

مرحوم کی زندگی کا آغاز بے وقوفیوں سے ہوا۔ ماں روٹی کے سوکھے ٹکڑے
پانی میں بھگو کر کھلاتی تو پروٹسٹ نہ کرتے۔ ذوق و شوق سے چباتے۔ استادان
کی تعلیمی قابلیت کی داد دیتے تو وہ فخر کی بجائے شرما جاتے، ہمجولی انھیں دھکا
دے کر گرادیتے تو اس کا ذکر کسی سے نہ کرتے۔ زیادہ سے زیادہ گھر آکر طرز تپاک
اہل دنیا پر ایک نظم لکھ دیتے۔

غرض ایسی ہی پے در پے بے وقوفیوں میں ان کی روحانی نشوونما ہوئی
اور اگر فطرتاً ذہین نہ ہوتے تو لوگ ان کی ہڈیاں تک بیچ دیتے یہ ذہانت خدا کی
دین تھی۔ انکا اپنا اس میں کچھ نہیں تھا۔ اپنی تو صرف بیوقوفیاں تھیں۔ اس لئے والدین
کی مالی حالت پر رحم کھا کر تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور ایک رنگریز کے ہاں پگڑیاں اور
دوپٹے رنگنے کا کام کرنے لگے۔ بعد میں جب مشہور ادیب بن گئے تو لفظ اس
رنگ ریز کے بڑے مغرور رہنا گئے۔

مرحوم نے رنگ ریزی کے بعد کئی پیشے اپنائے۔ رنگ ریزی، کمپوزیٹری،
کلرکی، اسکول ماسٹری، پینٹری، کانداری، چپراسی گیری، طبابت ــ اور جب
کہیں کامیاب نہ ہوسکے تو والدین نے تنگ آکر ان کی شادی کردی۔ اگر اس
وقت شادی نہ ہوتی تو سنیاس دھارن کرلیتے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور
تھا۔ قدرت کو ان سے بڑے بڑے کام لینے تھے۔ اس لئے قدرت نے ان کا بیاہ
کردیا۔ اہلیہ محترمہ نے آتے ہی ان کی نجابت اور شرافت پر تابڑتوڑ حملے شروع
کردیئے۔ اور یہ اہلیہ محترمہ کی ہی دین ہے کہ وہ آخری عمر میں بڑے ڈپلومیٹ بن کر
کہتے تھے۔ اگر میں کمینگی کو اپناتا تو آج کسی اسٹیٹ کا چیف منسٹر ہوتا۔

مرحوم اچھے خاصے انسانیت پرست تھے۔ ہر وقت انسانیت کی بربادی کا خطرہ لاحق رہتا۔ جتنی دیر جئے، بہبودی آدم کے غم میں جئے۔ اور اگر عمرِ خضر بھی مل جاتی تو بھی بہبودیٔ آدم کرتے رہتے۔ کچھ پوری طرح تو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس قسم کی بہبودی آدم چاہتے تھے۔ لیکن ایک بات صاف تھی کہ انسانیت کو کافی زیادہ بلند کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً وہ چاہتے تھے کہ چور عدالت کے سامنے جاتے ہی مان لے کہ میں نے چوری کی ہے۔ انھیں بہت سمجھایا گیا کہ یہ ناممکن ہے مگر وہ مصر رہے کہ ممکن ہے صرف مرنے سے ایک ہفتہ پہلے بمشکل مانے کہ پچاس فیصدی ممکن ہے۔

بہرکیف انھوں نے زندگی بھر بنی نوعِ انسان کی خاطر کام کیا۔ مثلاً نظموں کی ایک کتاب قلم بند کی۔ مگر اس میں بہبودیٔ آدم کچھ زیادہ گہری ہو گئی کہ کسی آدم کی سمجھ میں نہ آسکی۔ ادیبوں کی کئی انجمنیں قائم کیں، جو آپس میں لڑ جھگڑ کر ختم ہو گئیں۔ دو ہفتہ دار اخبارات اور چار ادبی ماہنامے جاری کئے جو بنی نوع انسان کی عدم توجہی کے باعث یکے بعد دیگرے بند ہو گئے۔ ایک مرتبہ دیواروں پر بہبودی آدم کے نعرے لکھنے کے لیے نکلے تو تشدد و تیز دھوپ کے باعث سڑک پر بے ہوش ہو گئے۔ بہبودیٔ آدم کے سلسلہ میں ایک مرتبہ گرفتار بھی ہوئے تھے۔ لیکن میڈیکل گراؤنڈ پر رہا کر دیے گئے اور آئندہ گرفتاری سے توبہ کر لی ــــــ مگر عام طور پر انڈر گراؤنڈ انارکسٹوں اور باغیوں کو اپنے گھر میں پناہ دیا کرتے تھے ــــــ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وارنٹ سیاسی خیالات کے باعث نہیں، بلکہ قرضہ کی وصولی کے سلسلہ میں جاری کئے گئے تھے ــــ آخر بیوی نے زیور بیچ کر قرضہ چکا دیا۔ اس واقعہ کو یاد کر کے بڑے آبدیدہ ہو جاتے اور کہا کرتے، میری بیوی بنی نوعِ انسان کی سچی خادم ہے۔

تیسری مرتبہ جب گرفتار ہوئے تو اس لیے کہ عالمِ مستی میں ٹیکسی والے سے لڑ پڑے، جو ناجائز کرایہ طلب کر رہا تھا اور یہ کرایہ بہبودیٔ آدم کے منافی تھا۔ نتیجتاً ایک دانت ٹوٹ گیا ایک ناخن اتر گیا اور پاؤں کی ایک ہڈی مڑ گئی۔ ــــ

انسانیت کو بلند کرنے کے سلسلہ میں انھوں نے آدھ درجن طنزیہ کتابیں لکھ ڈالیں۔

جو سب کی سب مقبولِ عام و خاص ہوئیں۔ اگرچہ ان کے پبلشروں کو ہمیشہ شکایت رہی کہ ان کی کتابیں بکتی نہیں، جاسوسی ناول زیادہ بکتے ہیں (ایک بار انھوں نے ایک جاسوسی ناول بھی لکھا، وہ بھی نہیں بکا۔

اُن کی تمام کتابوں میں بہبودیٔ آدم کے ہی تذکرے نہیں، جن میں چارپائی سے لے کر خداوند تعالیٰ تک ہر ایک کے متعلق بات کی گئی ہے کہ یہ چیزیں بنی نوعِ انسان کی خدمت کے لیے ہی پیدا کی گئی ہیں (خدا کو بھی وہ پیدا شدہ چیز سمجھتے تھے، کافر تھے نا۔؟) افسوس ہے کہ ان کی کتابوں کے صرف ایک ایک ایڈیشن ہی چھپے اور بہبودیٔ آدم ادھوری رہ گئی۔

طنزیہ کتابوں کے علاوہ ایک سیاسی کتاب بھی لکھی جس میں ایک سیاسی رہنما کا قصیدہ تھا، مگر رہنما مذکور کے سیاسی زوال کے باعث کتاب مارکیٹ میں نہ آ سکی۔ یہ رہنما بھی بہبودیٔ آدم کے سلسلے میں ہی کام کر رہا تھا۔

علی بابا کی ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے ایک نہایت گھٹیا بازاری عشق سے بھرپور ناول بھی لکھا تھا، جو گاجر مولی کی طرح خوب خوب بکا صرف اسی کتاب کی رائلٹی سے ہی ان کی بیوی نے طلائی زیور بنوائے۔ مرحوم ان زیورات کو دیکھ دیکھ کر ہمیشہ سرد آہ بھرتے اور کہا کرتے:

محترمہ! یہ زیور نہیں، بنی نوعِ انسان کی ہڈیاں ہیں جو تم نے پہن رکھی ہیں۔۔۔ افسوس کہ انھوں نے مزید بازاری ناول لکھنے سے توبہ کر لی اور بنی نوعِ انسان کی مزید ہڈیاں سونا نہ بن سکیں۔

اور آج! جب کہ مرحوم اس دنیا سے اُٹھ گئے ہیں، اُن کے کارہائے نمایاں کی دوبارہ قدر و منزلت کرنا ضروری ہے..... اگرچہ ان کی خامیاں ان کے ساتھ لوٹ گئیں۔ اس لیے ہمیں کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اُن کی خوبیاں ہمارے درمیان رہ گئی ہیں، اور اب یہ دنیا کا فرض ہے کہ ان خوبیوں کو یتیموں کی طرح پالے پوسے اور جس عظیم کام کو مرحوم

ادھورا ..... چھوڑ گئے ہیں اسے پورا کرے۔ اور اگر پورا نہ کیا گیا تو خطرہ ہے کہ مرحوم کی روح ایک بار پھر یہاں آجائیگی اور ایک بار پھر دنیا میں انسانیت پرستی کا پروپیگنڈہ شروع ہو جائے گا۔ آمین۔ آمین!

میری وصیت

میں یہ وصیت نامہ اس لیے لکھ رہا ہوں تاکہ میرے بعد میری جائداد پر جو ڈیڑھ کمرے کے مکان پر مشتمل ہے جھگڑا لکھڑا نہ ہوجائے اور میرے وارث ایک دوسرے کا خون نہ کر ڈالیں۔ کیوں کہ گزشتہ دنوں ہمارے محلّے کے ایک بھائی نے دوسرے بھائی کا ایک گھٹنا اور ایک ٹانگ اس بات پر توڑ دی تھی کہ ان کا مرحوم باپ اپنے پیچھے جو اینٹیں چھوڑ گیا تھا، ان کی تقسیم پر جھگڑا ہوگیا تھا۔ ایک بھائی نے ایک اینٹ زیادہ اٹھائی تھی۔ اینٹ کا سائز چھ انچ ضرب دس انچ بتایا جاتا ہے۔

میں یہ وصیت پیشگی لکھ رہا ہوں، کیوں کہ میں نہیں جانتا کہ میں کب مروں گا مختلف جوتشیوں نے میری عمر مختلف بتائی ہے۔ ایک نے پچاس سال، ایک نے پچھتر اور ایک نے نوّے۔ یہ تینوں اندازے صحیح بھی ہوسکتے ہیں اور غلط بھی۔ کیوں کہ آج کل

کے جیوتشی مختلف پبلشروں کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ میری عمر اس وقت اڑتالیس سال ہے۔ یہیں ممکن ہے میں ایک سو اڑتالیس سال تک بھی زندہ رہوں۔ کیونکہ سُنا ہے کئی بوڑھے بڑی بڑی لمبی عمر تک جیتے رہتے ہیں۔ اتنی لمبی عمر تک زندہ رہنے کی صرف دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ زیادہ سے زیادہ دیر تک صبح کی سیر کا لطف اُٹھاتے رہیں اور دوسری یہ کہ ان کی خبر اخباروں میں شائع ہو سکے کہ فلاں صاحب ایک سو اڑتالیس سال کی عمر کے ہیں لیکن ابھی زندہ ہیں۔ (نہ جانے ان کے زندہ رہتے چلے جانے کی وجہ کیا ہے۔)

بہر کیف یہیں ممکن ہے، صرف اخبار میں خبر چھپوانے کی خاطر ہی مجھے بھی ایک سو اڑتالیس سال تک زندہ رہنے کی حماقت کرنی پڑے۔ حماقت انسان کی مجبوری ہے خواہش نہیں ہے!

میرے گھر کے چھ افراد ہیں، (ساتواں زیرِ تعمیر ہے)۔ میں نے زندگی میں جو کچھ کمایا ہے یہ افراد اسے اپنا فرضِ منصبی سمجھ کر کھا گئے۔ میرا بڑا لڑکا جب خود کمانے لگا تو مجھے گالیاں وغیرہ دے کر مجھ سے الگ ہو گیا۔

چند سال پہلے ایک بیمہ ایجنٹ نے مجھے موت کا ہوا دکھا کر گمراہ کر دیا تھا اور میں نے دو ہزار روپے کا بیمہ کروا لیا تھا۔ دو سال تک قسطیں ادا کرتا رہا۔ (اس دوران میں وہ بیمہ ایجنٹ خود مر گیا)، اچانک ایک دن میں اپنے دو چھوٹے بچوں کی باتیں سن کر راہِ راست پر آ گیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"پپّو! ڈیڈی نے بیمہ کیوں کروا رکھا ہے؟"

"ہمارے لیے!"

"ہمارے لیے کیسے؟"

"دیکھ بے وقوف! جب ڈیڈی مر جائیں گے تو یہ دو ہزار روپے ہمیں مل جائیں گے۔"

"نہ جانے ڈیڈی کب مریں گے؟" ــــــ "جب بھگوان چاہیں گے۔"

"نہ جانے بھگوان کب چاہے گا!" (ٹھنڈی آہ!)

اور میں راہِ راست پر آ گیا اور بیمے کی مزید قسطیں دینا بند کر دیں۔ کیوں کہ میں نے سنا تھا کہ بھگوان ننھے بچوں کی دعائیں جلد قبول کر لیتا ہے....... اس لیے میں وصیت

کہتا ہوں کہ اگر میری موت کے بعد بیمہ کمپنی میری جمع شدہ قسطیں واپس کرے تو وہ روپے میرے بچوں کو نہ دیے جائیں بلکہ کسی یتیم خانے کو دے دیے جائیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے بعد میرے بچے بھی یتیم کہلائیں گے لیکن موت کے بعد میرے لیے سبھی یتیم بچے برابر ہیں۔

میرا جو ڈیڑھ کمرے کا مکان ہے اسے میرے گھر کے چھ افراد میں تقسیم کر دیا جائے احتیاطاً عرض ہے کہ میں نے یہ مکان بھارت شدھار فنانس کمپنی سے قرض لے کر خریدا تھا اور میرے گھر والے نہیں جانتے کہ میں نے قرض کی قسطیں کن کن خفیہ طریقوں سے ادا کیں۔ مثلاً میں نے بچوں کی نیکروں میں سے کپڑا بچایا انھیں بوٹ نہ دیے جرابیں بچائیں۔ ایک بار میں نے اپنے چھوٹے بچے سنتوش کو چھوٹے سائز کی سلیٹ خرید کر دی یعنی سائز بچایا۔ میں نے بچوں کے دودھ میں پانی ملا کر انھیں بتایا کہ پتلا دودھ صحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔ میں نے تین تین بچوں کو ایک ایک چارپائی پر سلا کر ان میں برادرانہ اخوت پیدا کی، کانچ کی چوڑیاں پہنا کر میں نے بیوی کو زیادہ رومانٹک اور دلکش کہا اور اپنی تین چوتھائی عمر بیوی کو یہ سمجھانے پر صرف کی کہ تم چاند کی طرح حسین ہو۔ کیوں کہ چاند گہنے اور ساڑیاں نہیں پہنتا۔

یعنی اس طرح میں نے قرض کی قسطیں ادا کیں اور یہ باتیں میرے گنے ہیں کسی کو معلوم نہیں۔ اگر میں اپنا غم نہ چھپاتا تو گھر والے کبھی خوش نہ ہوتے اور یہی میری ذہانت تھی۔ انسان غریب ہو تو ذہین ہو جاتا ہے اور صرف ذہانت ہی نے غریبی کا ساتھ دیا ہے۔ فنانس کمپنیوں نے نہیں؛

لیکن میری ذہانت کے باوجود فنانس کمپنیوں کی دو قسطیں ابھی تک باقی ہیں اس لیے قانونی طور پر کمپنی ہی اس مکان کی مالک ہے۔ اگر میرے وارث میری دو قسطیں ادا نہ کر سکیں تو بلاشبہ اسے قرق ہونے دیں۔ میں اپنے مرنے کے بعد بھی اپنے اخلاق کو بلند دیکھنا چاہتا ہوں۔

میرے بعد میرے بچوں کا کیا مستقبل ہو گا؟ میں کوئی رائے نہیں چاہتا کیونکہ میری عقیدہ یہ ہے کہ "ہر بچہ اپنا مستقبل خود بناتا ہے۔" والدین تو بیچ کی کڑی ہیں

جیسے ہر بچہ آسانی سے توڑ دیتا ہے اور توڑنے کے بعد کوئی خوانچہ لگا لیتا ہے، کوئی کلرک بن جاتا ہے، کوئی بیرسٹر، کوئی غنڈہ اور کوئی تھانیدار ... کبھی کبھی کسی خوانچہ فروش کا بچہ وزیر بھی بن جاتا ہے اور اس وزیر کا بچہ جیب کاٹتے ہوئے بھی پکڑا جاتا ہے۔

اس لیے بچوں کے بارے میں باپ کو وصیت کرنے کا کوئی حق نہیں، البتہ فرداً فرداً میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرا لڑکا پاشی تو فلم ایکٹر بننے کے لیے بھاگ جائیگا آجکل وہ مقامی سینما میں بلیک کی ٹکٹیں بیچتا ہے۔ دوسرا لڑکا رام کمار کوئی نہ کوئی مٹھ چلائے گا۔ اگرچہ اس بے چارے کو ابھی یہ علم نہیں کہ اس کے اندر دھرم کے نام پر لوٹ مچانے کی کتنی صلاحیت موجود ہے۔

آج کل وہ ایک دیوی کا بھگت ہے جو ہزاروں کماتی ہے۔ رام کمار بھی ہزاروں کمائے گا۔ گورو بن کر کار پر چڑھے گا۔ کوٹھی میں رہے گا۔ بڑے بڑے انڈسٹریلسٹ اس کے میلے پاؤں دھوئیں گے جیسنائیں اس کے اردگرد رقص کریں گی اور رام کمار انھیں بتائے گا کہ یہ رقص بہ خوشبوئیں آتما اور پرماتما کے وصال کا ذریعہ ہیں۔

اور اگر رام کمار یہ سب کچھ نہ کرے گا یعنی وہ ذرا سا بھی چوک گیا تو گنگا میں جا کر چھلانگ لگا دیگا کیونکہ آتم ہتیا بھی آتما اور پرماتما کے وصال کا ذریعہ ہے۔ تیسرا لڑکا بھولے ناتھ چپڑاسی، قلی، بس کنڈکٹر، اور ڈویژن کلرک، ان میں سے کوئی عہدہ پانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر سماج نے اسے ان میں سے کوئی چیز حاصل نہ کرنے دی تو وہ کیمونسٹ پارٹی میں شامل ہو جائے گا، یا شاعر بن جائے گا۔ بھولے ناتھ بنیادی طور پر نیک اور مخلص آدمی ہے۔ اس لیے اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ کلرک بن جائے، پھر شادی کرے، پھر بچے پیدا کرے، جیسا کہ ہر بے بس گرہستی میں رواج چلا آرہا ہے۔ البتہ وہ منہ کا مزہ بدلنے کے لیے کلرکی کے ساتھ ساتھ کسی سیاسی پارٹی کا صدر بھی بن جائے اور شاعری وغیرہ بھی کرتا رہے تو کوئی حرج نہیں ـــ سوسائٹی ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔

میری دو لڑکیاں بھی ہیں جنھیں میں لڑکوں سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ بڑی لڑکی بالا عمر اٹھائیس سال ابھی تک کنواری بیٹھی ہے، وہ دوشیزگی میں بھی بیوہ سی معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس نے دوشیزگی اور بیوگی کی درمیانی منزل خواب ہی خواب میں پار کرلی ہے۔

میں نے کئی بار جان بوجھ کر آنکھیں بند کیں تاکہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے، وہ نہیں بھاگی، شائد اس کا خیال ہے کہ عزّت دار خاندانوں کی لڑکیاں کسی سے پیار نہیں کرتیں بلکہ پیار اور شادی کے مراحل خواب میں طے کر لینے کے بعد جوگن بن جاتی ہیں یا سماج سُدھار کا کام کرنے لگتی ہیں۔

بہرکیف بالا کا مستقبل طے شدہ ہے یعنی بیوگی اور سماج سدھار، جب اپنا سدھار نہ ہو سکے تو سماج ہی کا سدھار کرنا پڑتا ہے۔

دوسری لڑکی ونمالا ہے۔ عمر اکیس سال، اگر اس کی زندگی میں کوئی غیر متوقع حادثہ نہ ہو گیا تو وہ اپنی بڑی بہن کے نقشِ قدم پر چلے گی۔ گزشتہ دو برس سے وہ اکثر خاموش رہنے لگی ہے۔ یہ خاموشی خطرناک ہے۔ مجھے شک ہے کہ وہ میری موت کا انتظار کر رہی ہے۔ کاش میں جلدی انتقال کر جاؤں، تاکہ اس کی خاموشی کے طوفان کو کنارے توڑنے کا موقع مل سکے۔ مجھے اس سے سچ مچ بڑی محبت ہے میں نہیں چاہتا کہ پیار یا شادی سے پہلے اس پر بھی بیوگی کا زمانہ آجائے، بیوگی سے پہلے کم از کم شادی شدہ تو ہونا ہی چاہئے۔ شادی نہ سہی، پیار ہی سہی!

ونمالا کا خاموش طوفان گمبھیر ہے۔ یہ طوفان بدل سکا تو میری وصیت ہے کہ وہ ضرور کنارے توڑ دے اس سے میری تمنا کو تسکین ملے گی۔ سماج سدھار کے لیے میں صرف ایک لڑکی بھینٹ کر سکتا ہوں، دونوں نہیں!

میرے خاندان کی سب سے بڑی سمیا میری بیوی ہے، وہ ساری زندگی میرے ساتھ محبت اور نفرت کے درمیان لٹکتی رہی ہے، میرے بعد وہ دھاڑیں مار مار کر روئے گی کہ میرے سر سے سایہ اٹھ گیا حالانکہ میں اس کے سر پر ہمیشہ چلچلاتی دھوپ کی طرح پھیلا رہا۔ وہ میرے سر پر بجلی کی طرح کڑکتی رہی۔ میرے بعد دھوپ اور بجلی دونوں کا رول ختم ہو جائے گا، اور گہرا بھیانک اندھیرا چھا جائے گا۔ اسی اندھیرے سے بچنے کے لیے یہی کہا کرتی ہے کہ "ہائے بھگوان! مجھے میرے پتی دیو سے پہلے اس دنیا سے اٹھا لے" اگر بھگوان ایسا نہ کر سکا تو مجبوراً میرے بعد وہی میری جانشین ہوگی۔ وہ ایک دلیر عورت ہے۔ لیکن صرف میرے جیسے بزدل کے سامنے۔ جب بزدل درمیان سے نکل گیا تو اس کی دلیری بیکار ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ میرے بعد وہ خاندان کے

شیرازہ کو بکھرنے سے روک نہ سکے گی۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ جب شیرازہ بکھر جائے
وہ کسی ودھوا آشرم میں داخل ہو جائے۔ کیونکہ ہر ہندوستانی عورت کی دو منزلیں ہیں۔
گرہستی اور ودھوا آشرم درمیان کی سبھی منزلیں دھوکا ہیں، فریب ہیں، چھلاوہ ہیں۔

اس کے علاوہ میں اپنے پیچھے کچھ دشمن چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ یہ سبھی دشمن کبھی میرے
دوست تھے جب ایک ایک کر کے میرے دشمن بن گئے تو میں نے مزید دوست بنانا چھوڑ دیے
اس لیے اس وقت میرا کوئی دوست نہیں ہے اور بغیر دوست کے مرجانے میں مجھے بہت راحت
رہی ہے۔ مجھے اطمینان ہے کہ اب میرا کوئی دوست میرے بچوں سے ہمدردی کرنے نہ
آئے گا۔ صرف دشمن ہی آئیں گے جو کہیں گے، اب مرحوم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔

میں نے زندگی میں کچھ لوگوں کے ساتھ نیکیاں کیں جن کا اعتراف زندگی میں کسی نے
نہیں کیا۔ لیکن اب وہ انھیں اپنے دماغ کے قبرستان میں سے کھود کھود کر نکالیں گے
اور کہیں گے، وہ مرحوم عظیم تھا، نیک تھا جس کا پھل اسے ضرور ملے گا۔ اسے اگر کچھ
مزید نیکیاں کرنے کا موقع نہیں ملا ورنہ وہ اور نیکیاں بھی کرتا۔

میں نے کچھ لوگوں سے برائیاں بھی کی ہیں جنھیں لوگوں نے میری زندگی میں ہمیشہ یاد رکھا
ہے۔ لیکن میرے مرنے کے بعد وہ انھیں بھول جانے کی کوشش کریں گے یہ ان کے کردار کی
کی بلندی ہوگی۔ اخلاق ہمیشہ موت کے بعد بلند ہوتا ہے۔ لیکن انھیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ
انھوں نے بھی مجھ سے کافی برائیاں کی ہیں۔ اس لیے برائیوں کا حساب کتاب برابر سمجھا
جائے۔ اور اس سلسلے میں مزید تحقیقات بند کر دی جائے۔ اگرچہ مجھے شک ہے کہ میں نے نسبت گمبھیریاں کی ہیں۔

میرے گھر میں کچھ فرنیچر ہے، کچھ برتن ہیں، کچھ کپڑے ہیں جنھیں میرے گھر سے
آپس میں تقسیم کریں یا نہ کریں ایک ایک کرسی اور ایک ایک کابینٹ پر ایک دوسرے
گھٹنے توڑیں یا نہ توڑیں، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا۔
کہ یہ سب چیزیں مائع ہیں، گلاس بھی گھٹنا بھی۔ اس لیے

اس کے علاوہ میرے پاس کچھ کتابیں ہیں۔ ان میں اکثر مانگے کی ہیں۔ کچھ چرائی ہوئی
ہیں وہ کسی لائبریری کو دان کر دی جائیں۔ کچھ خطوط ہیں، جن میں کچھ ان دوستوں کے ہیں،

جو انھوں نے دشمن بننے سے پہلے لکھے تھے، کچھ رشتے داروں کے ہیں، جو زندگی میں بھی بے معنی تھے اور میرے مرنے کے بعد بھی بے معنی ہوں گے اور کچھ خطوط وہ ہیں جو میری محبوبہ نے مجھے لکھے تھے، دنیا کے ہر انسان کے پاس کم یا زیادہ ایسے پیغام ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن میری محبوبہ اب ایک شادی شدہ معزز خاتون ہے۔ اس لیے میری وارث ان خطوط سے بلیک میل کرنے کی کوشش ضرور کریں گے لیکن موت سے ایک دن پہلے میں ان محبت ناموں کو تلف کر دوں گا۔ میں اپنی محبوبہ کو بھی وصیت کر دوں گا کہ اگر اس کے پاس بھی میرے کچھ خطوط ہوں تو انھیں تلف کر دے۔ رسوا ہونے یا کرنے کا کیا فائدہ ـــــ رسوائی صرف زندہ انسانوں کے لیے مناسب ہے:

اپنا وصیت نامہ ختم کرنے سے پہلے میں اپنے وارثوں کو ایک ضروری اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ مجھے ایک جیوتشی پنڈت رگھو بردیال شاستری نے کہا تھا کہ میری موت کسی اونچی جگہ سے گرنے سے ہوگی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میرے وارثوں کو چاہیے کہ اس جیوتشی کو پکڑ کر اسے کسی اونچی جگہ سے گرا دیں، تاکہ اس کا جیوتش اگر میرے حق میں صحیح ثابت نہ ہو، تو اس کے حق میں ہی صحیح ثابت ہو جائے!!

عالمِ بالا پر

جب میرا انتقال ہوگیا اور شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہی حتّٰی کہ اس عظیم المرتبت ڈاکٹر نے بھی تصدیق کردی جس نے انتقال کے فوراً بعد اپنی فیس مانگ لی تھی تو میری موت پر تمام اعزّا اور اقربا رونے دھونے میں مصروف ہوگئے۔ چنانچہ اس مصروفیت سے فائدہ اُٹھا کر میں نے قفسِ عنصری سے پرواز کی اور کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشہ کے راستہ باہر نکل گیا۔

باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ اگرچہ قمقمے پوری آب و تاب سے جل رہے تھے، لیکن اس کے باوجود کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے آنکھیں مَل مَل کر دیکھنا چاہا لیکن آنکھیں غائب تھیں اور میں اپنی عینک بھی گھر چھوڑ آیا تھا۔ اللہ! میری آنکھیں کہاں گئیں۔ اور اگر آنکھیں نہیں ہیں تو یہ برقی قمقمے مجھے کیوں دکھائی دے رہے ہیں۔ میں خوف زدہ ہو کر رُک گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے یا تو میرے پاؤں نہیں ہیں یا دھرتی غائب ہوگئی ہے۔ میں نے گھبرا کر ہاتھوں کو چھوا۔ ہاتھ بھی نہیں تھے۔ میں نے سامنے فیکٹری ایریا کی طرف دیکھا۔ پورا ایریا غائب تھا۔ منہ موڑ کر اپنے گھر کی طرف دیکھا گھر بھی ندارد! یا الٰہی! یہ سب چیزیں کہاں گئیں؟ کیا یہ سب چیزیں مر گئیں؟ کیا میرے ساتھ ہی سب فنا ہوگئے۔ کیا جب ایک انسان مرتا ہے تو اس کے ساتھ ساری کائنات مر جاتی ہے۔ ساری سڑکیں مر جاتی ہیں۔ سارے مکان مر جاتے ہیں۔ سارا ٹریفک مر جاتا ہے؟

"ہا ہا ہا ہا" اچانک ایک تمسخرآمیز قہقہہ سنائی دیا۔ لیکن اگر میرے کان نہیں ہیں تو میں کس چیز سے سن رہا ہوں؟ سوچ کیسے رہا ہوں اور چل کیسے رہا ہوں؟ حواس خمسہ کی یہ شرارت بڑی حیرت انگیز تھی۔

"کون ہو تم؟"

میں نے قہقہہ سے خطاب کیا۔

(اور یہ قوت ناطقہ کہاں سے آ گئی؟)

اتنے میں ایک نرم و نازک ہاتھ نے مجھے اٹھا لیا اور مجھے لے کر ہوا میں اڑنے لگا۔

میں نے عرض کیا۔

"تم کون ہو—؟"

"تمھاری محبوبہ!"

رسیلی آواز میں جواب آیا۔

"کون ہو؟ کاشا؟"

"نہیں!"

"سلمیٰ ہو؟"

"نہیں!"

"تو پھر کون ہو شوبھا، درگا، مالتی، رام پیاری ......؟"

"میں ان سب کا مکسچر ہوں۔ یعنی ان میں سے کسی کے ہونٹ، کسی کی آنکھیں، کسی کے ہاتھ، کسی کے گیسو...... قہ قہ قہ قہ۔ مکمل محبوبہ، تمہاری تمناؤں کا مکمل عکس......"

"تم دنیا میں کیوں نہیں ملیں؟" میں نے فلمی قسم کا ڈائیلاگ بول کر رومانٹک بننے کی کوشش کی۔

"کیونکہ دنیا میں تم صرف میرے خواب دیکھتے تھے اور حقیقت سے لڑتے تھے، سماج سے ڈرتے تھے نا۔ قہ قہ قہ قہ....."

میں قدرے نادم ہوا۔

اس سے پوچھا۔

"اب تم مجھے کدھر لے جا رہی ہو؟"

"تشنہ تمناؤں کے پروں پر سوار کر کے محبت تمہیں اڑائے لیے جا رہی ہے اس قوت اعلیٰ کے حضور میں جو تمام تر تشنگیوں کی خالق ہے۔"

"میری محبوبہ تو فلاسفر بھی ہے۔" میں نے مسکرا کر سوچا۔

مجھے اس کا فقرہ یوں لگا جیسے اس نے کسی کتاب میں سے رٹ رکھا ہے مجھے شک ہوا کہ میری محبوبہ چور ہے، دوسروں کے فقرے چراتی ہے۔ یہ سوچ کر مجھے وہ شاعر حضرت نادار دولت آبادی یاد آ گیا جو اپنی غزل سنا کر ہمیشہ کہا کرتا تھا:

"صاحبان: یہ توارد ہے، سرقہ نہیں ہے، دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے!"

(اس کی تمام غزلیں توارد کا شکار ہو گئی تھیں۔)

نہ جانے خیر یہ نے میرے دل کی بات بھانپ لی یا کیا ہوا کہ اچانک اس نے جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ چھوڑ دیا اور میں جیسے یکہ و تنہا فضا میں جھولنے لگا اور پھر جیسے ایک گہرا نیلا بادل میری گردن سے لپٹ گیا۔ بالکل ایک رسّی کی طرح — اور مجھے یوں ... محسوس ہوا کہ وہ مجھے یوں اوپر ہی اوپر کھینچنے لگا ہے، جیسے کنوئیں سے پانی کی گاگر کھینچتے ہیں۔

میں چیخا۔

"ارے ظالم! میرا دم گھٹ جائے گا۔"

بادل نے بڑے شاعرانہ لہجے میں کہا:

"گھبراؤ نہیں ؏

دم ہوا کی موج ہے رم کے سوا کچھ بھی نہیں

مصرع سن کر میں نے داد کے لیے تالی بجانی چاہی۔ لیکن جیسے قریب

سے کسی نے کہا

"ہشش ! یہاں تصنع ممنوع ہے، خواہ مخواہ اپنی سزا میں کیوں اضافہ کرتے ہو؟"

میں نے آواز کی طرف دیکھا

"آپ کا اسم شریف؟"

"رلا رام پنساری"

میں اُسے پہچان گیا۔

رلا رام پنساری ہلدی اور کالی مرچوں کا تھوک سوداگر تھا اور اُن میں ملاوٹ کیا کرتا تھا، اس کی گردن میں بھی بادل کا رشتہ بندھا تھا، پھر میں نے دور تک غور سے دیکھا تو بہت سے بادلوں کی بہت سی رسیاں بہت سے انسانوں کے گلے میں بندھی ہوئی تھیں۔

"ہوں! تو سب حضرات انتقال فرما کر جا رہے ہیں۔"

میں نے اُن میں سے کئی لوگوں کو پہچان لیا۔

بنسی دھر وکیل تھا جس کی چار جوان بیٹیاں جہیز نہ ہونے کی وجہ سے کنواری بیٹھی تھیں — گوردنام ڈرائیور جس نے آٹھ آنے کی خاطر ایک دوسرے ڈرائیور کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا تھا۔ حیدر بخش کباڑیا جو گورنمنٹ اور بیوی دونوں سے دھوکا کیا کرتا تھا۔

کئی انتقال یافتہ حضرات ایسے بھی تھے جنھیں میں پہچان نہ سکا۔ کئی فرانس یا برطانیہ کے اطراف کے معلوم ہوتے تھے، جنھوں نے مجھے دیکھتے ہی نسلی تعصب سے اپنا منہ موڑ لیا۔

(خدا کے سامنے جا کر ان کی شکایت ضرور کروں گا۔)

کچھ دیر اڑتے رہنے کے بعد اچانک ایک دھماکا سا ہوا، جیسے ہزاروں

سر ایک ساتھ کسی چھت سے جا ٹکرائے ہوں، اور پھر جیسے ہزاروں سورجوں کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی اور ہزاروں ارغنون بجنے لگے اور حمد و ثنا کے ہزاروں گھنٹے ٹنٹنا اُٹھے!

مجھے شک ہوا کہ یہ شاید دنیا کے عظیم ترین طنز نگار فکر تونسوی کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میرا دل فرطِ مسرت سے دھڑکنے لگا، کیوں کہ خدا کے ساتھ قربت کا لمحہ نزدیک آ رہا تھا۔ میں خدا سے دو چار ڈائرکٹ باتیں کرنا چاہتا تھا اور بالخصوص دنیا کا اڈ سبر رچنے کی حقیقی وجہ تسمیہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔

اُس وقت میں روئی کے ایک ہلکے پھلکے گالے کی طرح اُڑ رہا تھا۔ فضا میں ہزاروں گالے میری طرح بھٹکے پھر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت سے رفیوجی اپنے گھر بار سے الگ ہو کر اپنے کلیم کے فارم ہاتھوں میں لیے گھوم رہے ہوں۔ رفیوجیوں کے ساتھ یوں بھٹکنا مجھے بُرا لگا۔ کیونکہ اس سے میری انفرادیت خطرے میں پڑ رہی تھی۔ چنانچہ میں نے زور سے پکارا۔

"اے خدا تو کہاں ہے؟"

ہزاروں آوازیں ایک ساتھ گنبد کی آواز کی طرح گونجیں۔

"اے خدا تو کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔

"بیٹا فکر تونسوی! یہاں تو انفرادیت قائم رکھنا انتہائی مشکل نظر آتا ہے۔" (لہٰذا دوبارہ خدا کو پکارنے کا حوصلہ نہ پڑا۔)

میں نہیں جانتا، میں کتنے ہزار برس اسی طرح خلا میں بھٹکتا رہا کیوں کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ عالمِ بالا کا ایک منٹ ہماری زمین کے سینکڑوں برسوں کے برابر ہے۔ وہاں وقت اتنا دھیما چلتا ہے کہ پورا مغلیہ عہد آدھے منٹ میں ختم ہو سکتا ہے وقت کی یہ کاہلی مجھے قطعی پسند نہ آئی۔ بہر کیف بالآخر وہ دو ثانیہ آ گیا جب ایک فرشتہ نے مجھے اپنی چھنگلیا پر چپکا لیا اور خلائے بسیط و بالا کے ایک دروازہ میں داخل کر دیا۔

دروازہ کے اندر ایک میز پر ایک کلرک ایک بہت بڑا رجسٹر کھولے بیٹھا تھا۔
مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟ اپنا نام اور پتہ لکھواؤ"

میں نے تڑپ کر کہا۔

"کیا مطلب؟ آپ مجھے نہیں جانتے؟ مجھے تو سارا ہندوستان جانتا ہے
میرا نام فکر تونسوی ہے!"

"کون سی مخلوق سے تعلق رکھتے ہو؟" مجھ سے دوسرا سوال کیا گیا۔

"رائیٹر۔ رائٹر۔ میرا مطلب ہے ادیب ہوں لیکھک، طنز نگار"

کلرک نے سر کھجایا۔ بے چارہ کوئی ان پڑھ ہو گا۔ رائیٹر کے معنی بھی نہیں جانتا
تھا۔ اس کے ساتھی کلرک نے مجھ سے کہا۔

"دیکھو گھبراؤ نہیں۔ اپنا صحیح صحیح پتہ لکھوا دو۔ تاکہ تمہارے لئے سزا و جزا کا فیصلہ
کرنا آسان ہو جائے۔"

میں نے جل بھن کر کہا۔ "تو لکھیئے۔ مکان نمبر سی، اکیاون موتی نگر۔ شہر دہلی
ملک ہندوستان۔"

"یہ ہندوستان کیا ہے؟ کون سے سیارے میں ہے؟"

"آپ ہندوستان کو بھی نہیں جانتے؟ اتنی بڑی عظیم سنسکرتی کا ملک! اور آپ
پوچھتے ہیں۔ ہندوستان کیا ہے۔ سخت افسوس آتا ہے آپ کی نامکمل معلومات
پر۔ ارے صاحب! ہندوستان وہ ہے جہاں کنبھ کا میلہ لگتا ہے۔ جہاں پیپل کی پوجا
ہوتی ہے۔ جہاں گائے اور مسجد پر فساد ہوتے ہیں۔

سب کلرک جو فرشتے سے معلوم ہوتے تھے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ جیسے
کہہ رہے ہوں۔

"ہوپ لیس کیس ہے۔"

میرا اپنا گلا بھی فرط غم سے بھر آیا۔ کیونکہ میرا تو خیال تھا کہ میری موت... جس پر

سارا ہندوستان آنسو بہا رہا تھا۔ اس کی اطلاع یہاں پہنچ گئی ہو گی۔ لیکن یہاں فکرؔ تونسوی تو ایک طرف ہندوستان تک کو کوئی نہیں جانتا تھا اور ادھر ہمارے ہندوستانی تھے کہ دن رات خدا کے گن گاتے تھے۔ چونکہ خدا کا نام لے کر نقب لگاتے تھے۔ یہاں خدا کے رجسٹر میں ہندوستان کے چوروں کا خانہ ہی غائب تھا۔

تھک کر میں نے کلرک سے کہا۔

" دیکھئے صاحب، آپ مجھے خدا سے ملا دیجئے۔ وہ مجھے آپ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔

" ویری سوری! " ایک فرشتہ نے کہا:" وصالِ خدا صرف تینا لوے جنم کے بعد ہی ممکن ہے۔ آپ صرف یہ بتا دیجئے کہ آپ کون سے سیارے سے آئے ہیں؟

" زمین کے سیارے سے۔"

" زمین کا سیارہ کہاں واقع ہے؟"

فکر تونسوی۔ دہلی۔ ہندوستان .... اور آپ یہ زمین کے سیارے کو بھی نہیں جانتے .... میں نے طنزاً کہا۔

" حضرات! آپ کا جغرافیہ بہت کمزور ہے۔ ارے صاحب زمین وہ سیارہ ہے جو چاند کے قریب واقع ہے۔ چاند یعنی چنداماں، جہاں ایک بڑھیا بیٹھ کر چرخہ کاتا کرتی ہے۔ جہاں پچھلے دنوں ہم نے ایک راکٹ بھیجا تھا۔

لفظ چرخہ جس پر ہماری پوری تحریک آزادی استوار کی گئی تھی بے کار گیا ایک بوڑھے فرشتے نے ملائمت سے کہا۔

" دیکھئے، آپ ذرا ہماری مجبوری کا احساس کیجئے۔ خدائے بلند و برتر کی کائنات بہت وسیع ہے۔ اس میں لاکھوں ستارے، لاکھوں چاند اور لاکھوں سورج ہیں۔ اس لئے ناراض نہ ہو جئے اور ذرا سا رکئے ..."

یہ کہہ اس نے ایک اور رجسٹر اٹھایا، تھوڑی سی ورق گردانی کی اور آخر ایک ننھے سے خانے پر انگلی رکھ کر بولا۔

"مل گیا! یہ صاحب دراصل زمین کے اس حقیر سیارے سے تشریف لائے ہیں جہاں انسان نامی مخلوق بستی ہے۔

انسان کے نام پر سب فرشتوں نے منہ بنا لیا۔

لہٰذا اس کیس کو......" بوڑھے فرشتے نے بات جاری رکھی۔ "آپ پسماندہ سیاروں کے سیکشن میں بھیج دیجیے۔"

اور پھر جب شفاف سا فرشتہ مجھے پھر اپنی چھنگلیا پر چپکا کر پسماندہ سیاروں کے سیکشن میں چھوڑ گیا تو میری جان میں جان آئی۔ کیونکہ یہاں میرا جانا پہچانا ماحول تھا۔ وہی غلاظت، وہی ظلمت، وہی تنگی، وہی گھٹن جو میری پیاری زمین کے ساتھ مخصوص تھی، مجھے یہاں مل گئی اور میری روح موتیے کے پھول کی طرح کھل اٹھی۔

پسماندہ سیاروں کے سیکشن میں ان گنت کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ ٹرانسپورٹ سروس کے فرشتہ نے مجھے عین اس کھڑکی کے پاس اتار دیا جس پر لکھا تھا۔

"اہل زمین کا دفتر اعمال!"

دفتر کے باہر انسان اور دوسرے حشرات الارض کا ایک ہجوم تھا۔ جو مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہا تھا۔ کوئی ڈسپلن نہیں تھا۔ کوئی کیو نہیں تھا۔ ایک بے ہنگم شور تھا، جیسے ہمارے یہاں کی کچہریوں یا انٹرویو دفتر کے سامنے نوکری کے خواہشمندوں کا ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو دھکے مار مار کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ہر شخص سب سے پہلے کھڑکی پر پہنچنے کا خواہش مند تھا۔ کچھ رو رہے تھے کچھ گا رہے تھے۔ کچھ ایک دوسرے کو فری اسٹائل مکا بازی سے لہولہان کر رہے تھے۔ ان میں مختلف قوموں، ملکوں اور تہذیبوں کے افراد تھے۔ زرد، سرخ، سفید اور سیاہ رنگ کے افراد اور وہ سبھی ایک دوسرے کی انگلیاں توڑ رہے تھے۔ اور ہر انگلی ٹوٹنے پر اللہ اکبر اور سچے شیو شمبھو کی قسم کے خدا پرستانہ نعرے لگاتے تھے اور قومی ترانے گاتے تھے اور فتح کی خوشی میں بندروں کی طرح کودتے تھے۔

کچھ دیر تک تو مجھے اپنی نسل کی مخلوق میں رہ کر لطف آتا رہا۔ لیکن ایک مرتبہ

جب ایک ہاتھی نے مجھے خواہ مخواہ مجھے سونڈ سے اٹھا کر اچھال پھینکا تو سارا مزا کرکرا ہو گیا۔

میں نے ہاتھی مذکور سے کہا۔

"حضرت! یہ غیر مہذبانہ حرکت کس سلسلے میں ہے؟"

لیکن وہ چونکہ ایک کلاسیکل سنگیت گانے والے کلاکار کو سونڈ پر اچھالنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس لئے میری بات کا جواب نہ دے سکا اور میں جو انتقال کے بعد نہ جانے کیسے کیسے بلند خیالات اور احساسات لے کر یہاں آیا تھا یکدم اداس ہو گیا۔ خدا سے ملاقات کی امیدیں تو پہلے ہی خاک میں مل چکی تھیں۔ اور اب اگر کوئی احساس باقی رہ گیا تھا تو صرف اپنی بے مائیگی کا، اپنی بے بسی کا اور اس فیصلہ کا جو میرے مستقبل کے بارے میں نہ جانے کب ہونے والا تھا۔

بالآخر ہمت کر کے میں بھی انسان بن گیا۔ دھکم پیل شروع کر دی۔ اور کسی نہ کسی طرح کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ اور کلرک فرشتہ کو جو ہمارے سنٹرل سیکرٹریٹ کے کلرک کی طرح بے حد تھکا ماندہ اور پریشان خاطر نظر آرہا تھا اپنا نام اور پتہ بتا کر عرض کیا۔

"جناب! براہ کرم ذرا میرے اعمال کی فائل ملاحظہ کیجئے۔ اور بتائیے کہ میری آئندہ پوزیشن کیا ہے؟"

کلرک فرشتہ نے بادل ناخواستہ فائل کھولی۔ اسے الٹا پلٹا۔ اور ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"کیا یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری ماں تمہیں سوکھے ہوئے ٹکڑے ابال کر کھلایا کرتی تھی؟"

"بجا فرماتے ہیں آپ!"

"کیا یہ صحیح ہے کہ تم انسانوں کی اخلاقی گراوٹوں اور ذلیل حرکات سے بہت دکھی رہتے تھے؟"

"صحیح ہے جناب!"

"اور کیا یہ بھی صحیح ہے کہ تم نے عمر بھر اپنی تحریروں سے نوعِ انسانی کی بہبودی کے لئے کوشش کی"

فرشتہ نے ایسے ہی متعدد سوالات کئے۔ جن کا جواب مجھے مجبوراً اثبات میں دینا پڑا۔ کیونکہ جھوٹ بولنے پر سزا بڑھ جانے کا خطرہ تھا۔ اگرچہ صرف سچ بولنے کے نقطۂ نگاہ سے میں نے فرشتۂ مذکور کو یہ بھی بتا دیا کہ میں نے اپنی بے وقوفیوں کے باعث کئی احباب کو جلی کٹی بھی سنائیں۔ ایک بار بیوی کو بھی زدوکوب کیا تھا۔ کئی بار اقتصادی تنگ دامنی کے کارن جھوٹ بھی بولے تھے۔ اور وہ چار مرتبہ کچھ انسانوں سے دھوکا بھی کیا تھا۔

بالآخر فائل پر میرے دستخط کرانے کے بعد فرشتہ کلرک نے کہا۔

"تمہارے بارے میں حکمِ الٰہی یہ ہوا ہے کہ تمھیں ایک بار پھر زمین پر واپس بھیجا جائے۔

"کس جرم میں؟

میں نے پوچھا۔

"کیونکہ تم ایک کھلے انسان ہو۔"

"تو کیا کھلا ہونا جرم ہے؟" میں تلملایا۔" میں دوبارہ زمین پر نہیں جانا چاہتا۔ چاہے مجھے جہنم میں بھیج دو۔"

تم حکمِ الٰہی سے سرتابی نہیں کر سکتے۔ زمین کے سیارے کو تمہاری بڑی ضرورت ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گا!"

میں نے پاؤں پٹک کر کہا۔

"تمھیں جانا ہی پڑے گا!"

فرشتہ نے گرج کر کہا۔

"میں نہیں جاؤں گا! — نہیں جاؤں گا!!" — میرا لہجہ تیز ہو گیا —

"مجھے خدا سے ملا دو۔ میں خدا سے ڈائرکٹ بات کروں گا۔ کہاں ہے خدا؟"

میرے اتنا کہتے ہی ایک ساتھ بہت سے قہقہے گونج اٹھے۔ اور پھر۔

"کہاں ہے خدا!؟"

"کہاں ہے خدا؟!"

کی کروڑوں آوازیں آنے لگیں۔ اور پھر سارا ماحول گھومنے لگا۔ ہزاروں گھنٹے ٹن ٹنا اٹھے۔ اور خدائے عظیم کی حمد و ثنا میں کروڑوں نغمے ایک ساتھ گائے جانے لگے۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے چھنگلیا پر اٹھا کر زور زور سے گھمایا اور پھر اچھال دیا۔ اور میں لڑھکنیاں سی کھا کھا کر گرنے لگا۔

نیچے۔

اور نیچے۔

اور نیچے۔

اور پھر ایک دم سکون سا چھا گیا۔ ایک عجیب پراسرار طمانیت سی پھیل گئی ایک خاموشی، شانتی اور تسکین۔!

جیسے سمندر کی تہہ میں کوئی ذرہ جا کر بیٹھ جائے۔

اور پھر میں نے سنا۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا

"اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ مریض بچ جائے گا!"

خدا کی جنت

اور پھر یوں ہوا کہ میں جنت کے دروازے پر پہنچ گیا۔

نہ جانے وہ کون تھا، ضرور کوئی فرشتہ ہی ہوگا، جس نے مجھے چٹکی پر اٹھا لیا اور جیسے ہزاروں میل کا سفر ایک ثانیے میں طے کر کے مجھے یہاں چھوڑ گیا وہ اتنی جلدی کا بنیا تھا کہ میں اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔

دروازے کے باہر خاکی وردی پہنے ایک مریل سا فرشتہ اسٹول پر بیٹھا سات نمبر کی بیڑی پی رہا تھا۔ میں نے اپنا شبہ دور کرنے کے لئے اس سے پوچھا
"جناب عالی! جہاں میں کھڑا ہوں کیا یہ جنت کا دروازہ ہے؟"

چپراسی فرشتے نے میری طرف دو دونی چار قسم کی نگاہ سے دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہو۔ مگر میں بتا دوں تو تم اس اطلاع کے کتنے پیسے دو گے! —— لیکن میری بیشیچر حالت دیکھ کر وہ شاید مایوس ہو گیا۔ اور جیسے وہ کوئی ذمے داری لینے کو تیار نہ ہو، کہنے لگا؟ "کون ہو تم؟"

"فکر تونسوی ہوں، کیا تم مجھے نہیں جانتے، ادبی رسائل نہیں پڑھا کرتے؟"

ادبی رسائل اور فکر تونسوی شاید اس کے لئے ناقابلِ فہم چیزیں تھیں، ہاتھ کے ایک جھٹکے سے جیسے اس نے "شٹ اپ" کہا اور بولا — "ادب شدب کو چھوڑو کام کیا کرتے ہو؟"

پہلے شاعری کرتا تھا، اب .... "

اسے جیسے کلیو (CLEWE) ہاتھ آگیا، جھٹ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔
" شاعر ہو؟ تو پھر یہاں کیوں آگئے، یہاں سے بال برابر فاصلے پر جہنم ہے، سبھی شاعر وہاں جاتے ہیں۔"

میں نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا۔ " قبلہ! مگر میں شاعری چھوڑ چکا ہوں۔ اس لئے جنت .... "

ترک شاعری کے علاوہ کوئی اور کوالیٹی؟

" ایک تشنہ لب بھکاری کو اپنا آخری سگرٹ دے دیا تھا۔ حالانکہ میں اسے خود پینا چاہتا تھا۔"

اس نے ایک اور بیڑی نکال کر سلگائی (مجھے آفر نہیں کی) اور اس سے پہلے کہ کوئی اور احمقانہ سوال کرتا کھٹاک سے جنت کے پٹ کھلے اور اندر سے جیسے ہزاروں لاکھوں فرشتے ایک دم پکار اٹھے۔

اور دوسرے لمحے میں جنت کے اندر تھا

حیرت ہوئی کہ خدا کیسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر جنت عطا کر دیتا ہے، بھکارن کو سگرٹ دے دو، ننگے کو لنگوٹ پہنا دو، اندھے کو سڑک پار کرا دو — تو پھر لوگ جنت کے حصول کے لئے بڑے بڑے مندر مسرائیں اور دھرمشالے کیوں بناتے ہیں؟ شاید خدا کو دھوکا دیتے ہیں۔ شاید خدا سے دھوکا کھاتے ہیں۔

جنت میں قدم رکھتے ہی مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ یہاں میری دادی اماں ضرور موجود ہوں گی۔ کیونکہ جب اس کا جنازہ اٹھا تھا تو سارے محلّے نے دعا مانگی تھی کہ اے خدا مرحومہ کو جنت میں جگہ دینا — اور کہتے ہیں، خدا رائے عامہ کا بہت احترام کرتا ہے۔

میرے دائیں پہلو میں دودھ کی ایک نہر بہہ رہی تھی اور ایک شخص جس کی مونچھیں کسی شہوت انگیز بیلے کی سی تھیں، اس نہر میں پانی کے گڑوے ڈالی

رہا تھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا اور پوچھا: "بھائی صاحب! کیا آپ نے اس جنت میں میری دادی پربھا دیوی کو دیکھا ہے؟"

اور جیسے نو وارد سے سبھی مذاق کرنے کے شوقین ہوتے ہیں، بولا "کونسی پربھا دیوی؟ یہاں تو ہر تیسری عورت کا نام پربھا دیوی ہے۔"

میں نے دادی کا حلیہ بیان کیا اور کہا: "مرحومہ کے پاس دنیا میں ایک گائے تھی، جس کا دودھ بیچ کر وہ گذر بسر کرتی تھی۔"

"کیا دودھ میں پانی بھی ملاتی تھی؟"

"اوں ہوں! وہ ایمان اور عزت سے روزی کماتی تھی!"

شخص مذکور نے ایک استہزائیہ قہقہہ لگایا: "ایمان اور عزت؟ قہ قہ قہ تو پھر جنت میں اس کا کیا کام؟ بال برابر فاصلے پر جہنم ہے، وہاں جا کر معلوم کرو۔"

اور یہ کہہ کر اس جنت مکانی نے زور سے ہانک لگائی۔ دودھ لے لو دودھ۔ گائے کا خالص دودھ جنت میں ٹیسٹ کیا ہوا۔"

کتنا بڑا جھوٹ بول رہا ہے یہ شخص۔ ملاوٹی دودھ کو بھی خالص کہے جا رہا ہے اس نے میری دادی کے متعلق بھی جھوٹ بولا ہوگا۔ وہ ضرور جنت میں ہوگی ۔ میں نے اس کی ہانک سے بچنے کے لئے کانوں میں انگلیاں دے ڈالیں اور تیزی سے آگے چل دیا۔

جنت کا ماحول انتہائی دلفریب و حسین تھا۔ ساری جنت ایر کنڈیشنڈ ہو رہی تھی۔ دودھ اور شہد کی نہریں تو یوں عام تھیں جیسے کسی امیر زادے کی الماری میں رنگا رنگ کی نکٹائیاں لٹک رہی ہوں۔ چاروں طرف نرم اور سرخ پھول کھلے ہوئے تھے۔ جیسے کنواری کنواری حسینائیں، پتوں میں سے پھوٹ پھوٹ کر باہر آ گئی ہوں۔ پیڑوں پر طرح طرح کے پھل، دیہاتی دوشیزاؤں کی طرح جیسے جھیلا جھول رہے تھے۔ اور رنگیلی اور سنہری پہاڑیوں کے عقب سے ایک مسحور کن سرمدی نغمہ ابرابر ابھر کر آرہا تھا۔

ماحول کے اس طلسم میں جیسے میں گھلتا جا رہا تھا۔ اگر یہ خواب نہیں تھا تو جنت تھی جنت نہیں تھی تو خواب تھا۔ بہرکیف دونوں میں سے جو بھی کیفیت تھی، دلآویز اور نشیلی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: ''بیٹا فکرؔ تونسوی! بڑے خوش نصیب ہو۔ دنیا میں تم ایک سنگترہ خریدتے ہوئے گھبرا جاتے تھے۔ کہ تمہارے افلاس اور سنگترے میں صدیوں کا فاصلہ تھا۔ لیکن یہاں صرف بھکاری کو ایک سگریٹ دینے کے بدلے میں تمہیں پھلوں کے باغ مل گئے۔ جنت میں افلاس کی نہیں، کردار کی عزت ہوتی ہے۔

لیکن جنت میں گھومتے گھومتے مجھے ایک اچنبھا ہوا کہ یہاں کی آبادی بہت قلیل تھی کہیں کہیں کوئی اکا دکا آدمی نظر آجاتا۔ نعمتیں زیادہ تھیں۔ انسان کم تھے دنیا اور جنت میں یہ فرق تھا کہ وہاں نعمتوں کی اور یہاں انسانوں کی فیملی پلاننگ ہو چکی تھی ۔۔ یہ صحیح ہے کہ جنت میں صرف خوش نصیب آتے ہیں اور خوش نصیبوں کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ لیکن میں نے سوچا۔ اگر یہاں چند بدنصیبوں کو بھی لے آیا جاتا۔ تو ذرا ورائٹی رہتی۔ ورنہ سنسان جنت میں کوئی کب رہ سکتا ہے!

گھومتے گھومتے ایک شجر سایہ دار کے قریب آکر رک گیا۔ جس کے نیچے ایک حسین جمیل سڈول بدن کی ننگی عورت کھڑی تھی اور ایک بھدا سا آدمی اس حسین بدن کو اپنی زبان سے چاٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا!

بھائی صاحب! کیا . . . ''

بھائی صاحب نے جیسے سہم کر کہا: ''یہ حور میری ہے تمہاری نہیں ہے۔''

مگر تم اسے چاٹ کیوں رہے ہو؟''

''اس کے بدن سے شہد کی طرح شیریں رس ٹپکتا ہے۔ اس شہد کو چاٹنے سے ہی جنت کا مزا آتا ہے۔ کیا تمہیں ابھی تک کوئی حور الاٹ نہیں کی گئی؟''

میں نے کہا'' نہیں، ابھی خدا سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ تم یہاں کب سے آئے ہوئے ہو۔ تمہارا اسم شریف؟''

''میں دھومی مل ہوں . . .''

۔ وہی جس کی ربڑ فیکٹری تھی اور جہاں نوجوان کنواریاں تین تین روپے روزانہ پر مزدوری کرتی تھیں ۔"

"ہاں اور یہی میری خدمت خلق تھی ۔ میں ان غریب کنواریوں کو روزگار دلاتا تھا اور ان کے کنوارے بدن چاٹا کرتا تھا ۔"

" ذلیل !" میرے حلق میں یہ لفظ اٹک گیا ، اور سوچا ، یہ عورت بھی حور نہیں ہوگی ، اسی ربڑ فیکٹری کی ملازمہ ہوگی ۔ جسے خدا نے جنت میں بلالیا ہوگا : تاکہ بدن چٹوانے کے کام آسکے ! خدا کو جنت کے لئے بھی دنیا ہی سے حوریں امپورٹ کرنا پڑتی ہیں ۔ میں نے دل پر جبر کر کے شخص مذکور سے پوچھا " خدائے ذوالجلال کا دفتر کہاں ہے ؟ جہاں میں اپنی آمد کی رپٹ کر سکوں ۔"

" میں نہیں جانتا " وہ شخص رکھائی سے بولا ۔

ننگی حسینہ نے شاید کچھ بتانے کے لئے اپنا منہ کھولا ۔ لیکن اس شخص نے جھٹ اپنا منہ اس کے ہونٹوں پہ رکھ دیا اور شہد چاٹنے لگا ۔ شہد ٹپکاتے ہونٹ سرد آہ بھر کر رہ گئے ۔

جنت کے نظارے دیکھ دیکھ کر کبھی یقین آتا یہی جنت ہے ، کبھی شک ہوتا یہ جہنم ہے ، یقین اور عدم یقین کی اس کیفیت نے مجھے نڈھال کر دیا ۔۔۔ ایک حور ایک تالاب میں نہاتے ہوئے کنارے پر کھڑے ایک بھینسے کو ٹکٹکی باندھ کر تک رہی تھی ۔ ایک درخت پر بہت سے کرنسی نوٹ اُگے ہوئے تھے ۔ جنھیں کچھ آدمی توڑتے اور حلق میں نگل جاتے ۔ ایک چھوٹی سی سبز پہاڑی پر ایک سرخ و سپید بچہ بیٹھا تھا ۔ وہسکی کے ایک ٹب میں کھجوریں ڈبو ڈبو کر کھا رہا تھا ۔

اور ان کی گٹھلیاں نیچے پھینک رہا تھا ۔ نیچے اپنے منہ کھولے کچھ ناتواں اور لاغر بچے کھڑے تھے ۔ جب بھی کوئی گٹھلی کسی بچے کے منہ میں آ گرتی ۔ وہ نعرہ لگاتا " انقلاب زندہ باد " ۔۔۔ اور باقی بچے نہایت نحیف آواز میں بولتے " ہمارے

لے کبھی کچھ انقلاب زندہ باد!"

میں نے ایک ناتواں بچے سے پوچھا۔" برخوردار جنت میں آکر بھی گٹھلیاں کھا رہے ہو، اور یہ تبل کھجور کیوں نہیں کھاتے؟"

وہ بچہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا اور ایک دوسرے بچے سے بولا۔

ذرا سننا یہ آدمی کیا کہتا ہے۔ اس کی بولی میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"کوئی مشرک ہوگا۔" دوسرا بچہ بولا۔

" جنت کی بولی نہیں جانتا۔" تیسرا بچہ کہنے لگا۔

" تو پھر جنت میں کیسے آگیا؟ چوتھے نے فرمایا۔

اور پھر سبھی بچے ایک ساتھ مجھ پر ہنسنے لگے۔

ہاں میں کیسے آگیا؟ کیسے؟ ــــ معصوم بچوں کا یہ سوال ایک گٹھلی بن کر میرے حلق میں پھنس گیا، اور میں ڈر گیا ــ مجھے سچ مچ جنت کی زبان سیکھنی چاہیے اگر مجھے جنت میں رہنا ہے تو مجھے جنت کی سی آنکھیں چاہئیں، جنت کے سے کان، جنت کی سی سوچ ــ جنت میں آکر اصلی فکر تونسوی کو مر جانا ہوگا اور جنت مرکا ہی فکر تونسوی کو زندہ کرنا ہوگا۔

پریشانی اور سراسیمگی میں ایک دم میری چیخ نکل گئی۔" اے خدا! اے خدا! تو کہاں ہے؟"

پھر وہی ڈراؤنی خاموشی چھا گئی۔ برے پھنسے ہو فکر تونسوی! یہ جنت ہے یا گینڈر! یہاں تو ہر چیخ کا ترجمہ چیخ میں کیا جاتا ہے۔ ہر فریاد کا مذاق فریاد میں اڑایا جاتا ہے ــ کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکلنا چاہیے۔ تم یہاں رہنے کے اہل نہیں ہو۔

میں گھبراہٹ میں ایک طرف کو بھاگا۔ لیکن، ایک عجیب نظارے نے میرے پاؤں روک لئے ــ پھولوں کے ایک نرم و نازک بستر پر ایک بوڑھا آدمی دراز تھا، اس کے چاروں طرف انواع و اقسام کے کھانے اور پھلوں کا دسترخوان

بچا ہوا تھا جنھیں کتے اور گیدڑ اور چوہے نوش فرما رہے تھے۔ مجھے گھن آگئی۔ لیکن گھن کے باوجود جستجو مجھے اس بوڑھے کے پاس لے گئی اور میں نے کہا "السلام علیکم"

اب اسے گھن آگئی منہ پھیر کر بولا "میں اسلام کا دشمن ہوں، اس لئے گڈ ایوننگ کہو۔"

میں نے فوراً اپنی مذہبی اصلاح کر ڈالی اور انگریزی میں پوچھا۔ ڈیل! آپ خود کھانا کیوں تناول نہیں فرماتا۔؟"

"میں جانوروں سے پیار کرتا ہوں۔"

"انسانوں سے نہیں کرتے؟"

شاید وہ خوش نہیں ہوا، اس نے ایک کتے کی طرف اشارہ کیا اور اشارہ پاکر وفادار کتا مجھ پر بھونکنے لگا۔ کتے سے شہ پاکر ایک چوہے نے میرے پاؤں پر کاٹ لیا اور اس سے پہلے کہ کوئی گیدڑ مجھ پر حملہ کرتا۔ میں سگ ٹٹ بھاگ گیا۔ اور جانوروں کے قہقہے دور تک میرا پیچھا کرتے رہے۔ یہ قہقہے مجھے مانوس معلوم ہوئے۔ دنیا میں ایسے قہقہوں کے کئی ٹیپ ریکارڈ بھرے جاچکے تھے اور ریڈیو اسٹیشنوں سے عام سنائے جاتے تھے۔

بھاگتے بھاگتے یوں لگا کہ جیسے ایک شفقت بھرا مہربان ہاتھ میرے کندھے پر آپڑا ہے۔ میں نے رک کر دیکھا ایک حسین وجمیل نورانی چہرہ میرے سامنے تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا "مجھ پر اس نے کتے چھوڑ دئے۔ اس نے غلط سمجھا میرا کوئی قصور نہیں حضور!

نورانی چہرہ مسکرایا۔ "غلط تم سمجھے۔ یہ بڈھا اپنی دولت کو اپنے احباب اور مصاحبوں میں تقسیم کیا کرتا تھا۔ دولت کی اس تقسیم پر خدا اس سے خوش ہو گیا اور چند روز کے لیے اسے جنت عطا کر دی۔"

میں نے کہا: "یہ کیسا خدا ہے؟ جو دولت کی منصفانہ تقسیم کے اصول ہی نہیں جانتا" میں نے احتجاج کیا۔ جنت میں آنے کے بعد خدا کا خوف میرے دل سے نکل گیا تھا۔

نورانی ہاتھ میرے کندھے تھپ تھپانے لگا "فکر تونسوی صاحب! خدا کی عظیم حکمت کو سمجھو کہ اس نے بڈھے کو جنت تو عطا کر دی، مگر بھوک چھین لی تم نے دیکھا نہیں نعمتوں کا ڈھیر اس کے سامنے تھا۔ مگر عامۃ الناس اسے کھا رہے تھے اور وہ خود کھانے سے محروم تھا۔ بھوک کا چھن جانا قہر الٰہی سے کم نہیں ہوتا۔

مگر فرشتے کا یہ فلسفہ مجھے ہضم نہ ہو سکا۔ یہ جنت کی فلاسفی تھی اس لئے میں خاموش ہو گیا۔ اور موضوع بدلنے کی خاطر پوچھا "اے مہربان! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں جنت میں ہوں یا جہنم میں؟"

"ابھی بتاتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے اپنی دائیں انگلی سے خلا میں ایک گول دائرہ سا بنایا، اور پھر جیسے دور، ہزاروں میلوں سے آواز آئی۔ اس دائرے میں داخل ہو کر ہمارے پاس آجاؤ۔"

کیا یہ خدا کی آواز تھی؟

میں خوش ہو کر ہلکے غبارے کی طرح دائرے میں داخل ہو گیا۔ اور پھر یوں لگا۔ جیسے نرم و نازک ہوا کے وشال سمندر میں تیرتا جا رہا ہوں، میں کہاں جا رہا ہوں وہ فرشتہ کون تھا؟ دائرہ کیا تھا، وہ جنت کہاں گئی۔ کیا سچ مچ میں خدا کے حضور میں جا رہا ہوں۔ کیا وہ بلانے والی آواز کوئی دھوکا تو نہیں تھی؟ میری منزل کہاں ہے؟ جنت یا جہنم؟ یا یوں ہی صدیوں تک، قرنوں تک اس سمندر میں تیرتے رہنا۔

اپنے ہی سوالوں کے ہجوم سے میں گھبرا گیا۔ اور ایک کربناک چیخ نکلی "اے خضر راہ! اے خضر راہ میں کہاں ہوں؟"

جواب میں میرے پاؤں کے تلووں سے جیسے ایک قہقہہ سا نکلا اور یہ قہقہہ نیچے اترتا چلا گیا اور قہقہے کے ساتھ ہی میں اتر گیا یہاں تک کہ میرے پاؤں ریشم ایسی مٹی سے جا لگے۔ اس نرم مٹی کے لمس سے میرا تناؤ ایک دم ختم ہو گیا۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ اور میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے سامنے کھڑا ہوں۔ جو بیر بہوٹی کی طرح لال کھیو کا پھلوں سے لدا ہوا ہے۔ اور اس کے نیچے ایک عورت ......

او مائی گاڈ! یہ تو وہی عورت ہے جس کے خواب جنم جنمانتر سے دیکھتا چلا آرہا ہوں۔ بالکل وہی سراپا جس کا میں ہی خالق تھا جس کا ایک ایک انگ میں نے ہی تراشا تھا۔ نسائی حسن کے جس روپ کو خدا نے ادھورا چھوڑ دیا تھا اسے میں نے ہی مکمل کیا تھا۔ اور میں اس مکمل روپ کو تخیل کی وادی سے نکال کر حقیقت بنانے کے لئے صدیوں سے بھٹکتا پھرتا تھا۔ اور آج وہ مل گئی تھی بالکل وہی میرے سامنے، کانچ کی طرح بلوری جیتون کا لباس پہنے میرے سامنے کھڑی تھی۔

میرا دل ایک دم اچھل کر حلق تک آگیا۔

"یہی تمھاری جنت ہے لیٹ جاؤ۔" پیڑ پر سے ایک آواز آئی۔

میں نے پیڑ کے اوپر نگاہ ڈالی ایک قوس قزح رنگ کا نہایت ہی خوبصورت ناگ اپنی زبان باہر نکالے مجھ سے مخاطب تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک لال کھیو کا پھل توڑ کر نیچے پھینک دیا۔

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں خدا ہوں۔"

خدا؟۔ میرا سر غرور خدا کے سامنے جھک گیا۔" مگر اے خدا! تیری شکل سانپ کی سی کیوں ہے؟

"کیونکہ میں شیطان بھی ہوں۔"

شیطان؟ بڑا کنفیوژن تھا۔ یہ کیسا خدا ہے جو شیطان بھی ہے؟ یہ کیسا شیطان ہے جو خدا بھی ہے۔ میرا دماغ چکر لینے لگا۔ جنت اور میرے درمیان صرف ایک پھل کا فاصلہ تھا۔ میں کروں؟ کس کو خضرِ راہ بتاؤں ہر شے بڑی گنجلک ہو رہی تھی۔

بے تابانہ میں اس سراپا محبوبہ کی طرف بڑھا۔ "ڈارلنگ!"

محبوبہ بھی بے تابانہ میری طرف بڑھی "ڈیر!"

"ہم آغوشی ممنوع ہے! بے وقوفو!" پیڑ پر سے آواز آئی۔

اچانک لال بھبھوکا پھل زمین سے اوپر اٹھا۔ اور ہم دونوں کے ہونٹوں کے درمیان آکر رک گیا۔ اب دو پیاسے ہونٹوں کے درمیان صرف یہی پھل حائل تھا۔

"اس پھل کو کھا جاؤ!"

"اس پھل کو مت کھاؤ!"

"اس پھل کو کھا جاؤ!"

"اس پھل کو مت کھاؤ!"

دونوں منفی اور مثبت آوازیں مسلسل آنے لگیں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی۔ ایک دوسرے سے لڑتی ہوئی، بالکل دو متضاد جھکڑوں کی طرح دو مہیب پہاڑوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں۔ اور جوں جوں یہ مہیب جھگڑا تیز ہوتا گیا۔ میں اور میری محبوبہ مارے خوف کے ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے اور قریب اور قریب اور پھر یوں لگا۔ جیسے ہمارے درمیان اس پھل کا فاصلہ بھی مٹ گیا۔ وہ پھل بھی جیسے شیریں رس بن کر ہم دونوں کے ہونٹوں میں گھل گیا۔ اور پھر ہونٹ مل گئے۔ لال بھبھوکا ہونٹ گرم گرم، پیار سے پیاسے ہونٹ اور ہم دونوں کے بدن لال بھبھوکا ہو گئے۔ اور عجیب پراسرار نشیلی لہروں کے جھولوں میں جھولنے لگے۔ اور دور سے۔ جیسے کسی بے بس خدا کی آواز

آتی رہی۔" یہ گناہگار ہیں، انھیں جنت سے نکال دو۔"

اور بے بس خدا کی اسی آواز میں گھل مل کر آئی ہوئی بے بس شیطان کی آواز چیختی رہی۔" ہاں انھوں نے ثواب کمایا ہے، انھیں جنت سے نکال دو۔"

اور پھر خدا اور شیطان جیسے ایک دائرے میں گھومتے ہوئے ایک دوسرے کا تعاقب کرنے لگے اور پھر ہر شے گھومنے لگی، پیڑ، نہریں جنت —— اور ہزاروں لاکھوں گھنٹے ایک دم بج اٹھے، اور جھکڑ چلتا رہا اور ہم جھٹکے کھاتے رہے۔ پھر شعلے، انگارے ہمارے ارد گرد بھیانک رقص کرنے لگے۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز ہم دونوں کو جدا نہ کر سکی۔ اور پھر جیسے کوئی نڈھال ہو جائے ایسے ہی ہم ایک دھماکے کے ساتھ جیسے کروڑوں میل کی بلندی سے نیچے آ گرے —— اور پھر ایک دم پیارا پیارا سکون سا چھا گیا۔

اور ہم نے اپنی سہمی ہوئی آنکھیں کھول دیں اور کیا دیکھا کہ میں پھر جنت کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ اور وہی فرشتہ اسٹول پر بیٹھا بیڑی پی رہا ہے۔ اس نے میری طرف مسکرا کے دیکھا اور بولا۔" جنت سے ہو آئے؟ کیسی لگی؟"

میں نے کہا۔" اچھی ہے۔ بالکل ہماری دنیا ایسی۔ عشق وہاں بھی شجر ممنوعہ ہے اور یہاں بھی۔"

وہ بڑے فخر سے بولا۔" میں نے تمھیں کہا تھا؟ جنّت اور جہنم میں صرف بال برابر کا فرق ہوتا ہے۔"

قبر سے واپسی

اور پھر مرنے کے ایک ہفتہ بعد قبر میں میری آنکھ کھل گئی۔

مگر یہ ہوا کیسے؟ میرا تو باقاعدہ انتقال ہو گیا تھا۔ اگر انتقال نہیں ہوا تھا تو میری، قبر کیسے بن گئی؟ ہو سکتا ہے کہ قبر کسی اور کے لیے کھودی گئی ہو اور موقع پا کر دفن مجھے کر دیا گیا ہو۔ مگر نہیں، سماج ابھی اتنا کرپٹ نہیں ہوا کہ دوسروں کی قبر پر قبضہ کرنے کے لیے خود لاش بن کر لیٹ جائے۔

تو کیا یہ ڈاکٹر کی غلطی تھی؟ مگر ڈاکٹر تو بڑا کوالیفائڈ تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے جتنے زندوں کو قبرستان پہنچایا تھا، ان میں سے ایک بھی زندہ ہو کر نہیں لوٹا تھا۔ میں بڑا پریشان ہوا۔ کس سے تصدیق کرائی جائے کہ میں مر چکا ہوں یا نہیں؟ چنانچہ میں نے قبر میں لیٹے لیٹے آواز دی: "کوئی ہے؟"

جواب میں جیسے گنبد کی سی صدا آئی: "کوئی ہے؟"

میں نے پوچھا، "تم کون ہو؟ ڈاکٹر ڈنگا سنگھ ہو؟"

جواب آیا، "نہیں، میں نکیر تو نسوی ہوں۔"

تھینک گاڈ! میں نے سوچا، اپنی ہی جان پہچان کا بندہ مل گیا۔ یہ میرے ساتھ بلیک میل نہیں کرے گا۔ چنانچہ میں نے پوچھا، "تم کہاں ہو؟"

"میں تمہارے اندر ہوں۔"

"اندر چہو؟ مگر تم تو باہر نکل گئے تھے! انتقال کر گئے تھے! لوٹ کیوں آئے؟"

جواب میں کچھ سسکیاں سی سنائی دیں۔ جیسے کوئی نادم ہو، بے حد پچھتا رہا ہو۔ جیسے کوئی بچہ گھر سے جھگڑ کر نکل جائے اور دن بھر بھوکا پیاسا رہنے کے بعد گھر لوٹ آئے اور دیوار سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگے۔

میں نے پوچھا "روکیوں رہے ہو فکر تونسوی؟ میں پوچھ رہا ہوں انتقال کے بعد لوٹ کیوں آئے؟"

وہ بولا "دراصل غلط فہمی سی ہو گئی تھی۔ یعنی انتقال میرا نہیں ہوا تھا، تمہارا ہوا تھا۔ میں تو تمہاری روح تھی۔ تمہارے جسم سے نجات پا کر بڑی خوشی ہوئی تھی کہ چلو اس بے ہودہ انسان سے پنڈ چھوٹا۔ اب کسی معقول جسم میں جا کر کچھ دن عیش کروں گی۔ چنانچہ ہفتہ بھر تک مختلف جسموں کے دروازے کھٹکھٹاتی پھری۔ ایک بادشاہ کے گھر گئی، ایک رئیس کے گھر، ایک نواب کے یہاں، ایک اسمگلر کے در دولت پر ——— یہاں تک ایک مٹھ کے مہنت کے یہاں بھی گئی۔ مگر کسی نے بھی دروازہ نہیں کھولا۔ سب نے جواب دیا "گو بیک! ہم یہ بلا اپنے گلے نہیں منڈھیں گے۔ جہنم میں جاؤ۔"

میں ہنس دیا۔ "تو چلی جاتیں جہنم میں۔"

وہ بھی ہنس دی "آ تو گئی ہوں جہنم میں۔ فکر تونسوی اور جہنم دونوں ایک دوسرے کا ترجمہ ہی تو ہیں۔"

"کتنا غلط ترجمہ ہے!" میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "کاش! اس جسم کا دروازہ بھی تم پر بند رہتا۔"

"کیسے بند رہتا؟ تم تو اپنے تھے۔ غیر تھوڑے تھے! چلو نکلو اس قبر سے باہر چلیں۔"

اور میں اپنی، گھسی پٹی روح کے ساتھ قبر سے باہر نکل آیا۔ قبر کی مٹی ابھی کچی تھی۔ پختہ نہیں کی گئی تھی۔ شاید میرے رشتہ دار اور مداح پختہ قبر کے لئے بھی

چندہ فراہم کرنے میں مصروف ہوں گے۔ جیسے ہی میں نے قبر سے سر باہر نکالا، دو آدمی جو شاید میری قبر کی مٹی کھود رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگے۔ میں نے پیچھے سے آواز دی "تم کون ہو بھائیو! میری قبر پر دیا جلانے آئے تھے۔ یا میرا کفن چرانے؟ اور اب دوبارہ بھی آؤ گے یا یہ تمہارا آخری وزٹ تھا؟"

مگر میری آواز پر ان کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی ــــ اتنی تیز کہ ان میں سے ایک تو جھاڑی میں الجھ گیا، اور جھاڑی سمیت ہی بھاگتا چلا گیا، اور جیسے دل ہی دل میں کہتا گیا "واہ فکر تونسوی! ہمیں تم سے ایسی توقع نہیں تھی، بیکار میں ہمارا قیمتی وقت ضائع کر دیا۔ اتنے وقت میں تو ہم کسی کے کھیت سے گنے توڑ لیتے یا خدا کی عبادت کر لیتے۔"

مجھے ان کی مایوسی پر واقعی صدمہ ہوا کہ میں زندگی میں تو کسی کے کام نہیں آسکا، مرنے کے بعد بھی کسی کے کام نہ آیا۔ اگر وہ کفن چور تھے تو کم از کم دو چار گز کفن ہی حاصل کر لیتے۔ اور اگر دیا جلانے والے تھے تو خدا ان کے کچھ گناہ ہی بخش دیتا۔ میری بدولت انھیں کچھ تو مل جاتا ــــ مگر آہ! یہاں بھی انھیں فکر تونسوی کے سوا کچھ نہیں ملا۔

میں نے دیکھا کہ میری قبر کے باہر ایک تختی لگی ہوئی تھی، کچی قبر کی طرح یہ ایک کچی سی تختی تھی جس پر کچی سیاہی سے تحریر تھا۔

یہاں طنز نگار فکر تونسوی ابدی نیند سو رہا ہے۔ وہ مر گیا، لیکن
اپنی چھوڑی ہوئی حماقتوں کے باعث ہمیشہ لافانی رہے گا۔"

تاریخ پیدائش : جس دن قیصر جرمنی مرا تھا۔

تاریخ وفات : جس دن کوئی بھی نہیں مرا، سوا فکر تونسوی کے۔

تختی پڑھ کر مجھے یاد آیا کہ یہ سب فقرے میرے ہی ایک مضمون سے چرائے گئے تھے۔ مجھے اپنے احباب اور رشتے داروں کے ذہنی افلاس پر بڑا افسوس ہوا۔ میری موت پر وہ اور چند فقرے بھی نہیں لکھ سکتے تھے تو تختی کے نیچے

کم از کم میرے مضمون کا حوالہ دے دیتے۔

جب میں قبر سے باہر نکلا تو کھلی فضا اور ٹھنڈی ہوا تھی جس میں قریب کی ربڑ فیکٹری کا کڑوا کسیلا دھواں ملا ہوا تھا۔ یہ فیکٹری ابھی حال ہی میں سیٹھ جھگن لال نے تعمیر کی تھی۔ قبرستان کے قریب اسے فیکٹری کی اجازت کیسے مل گئی ــ ؟ یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا مجھے ضرور معلوم ہوا تھا کہ سیٹھ جھگن لال اب بھی گورنمنٹ کے ساتھ خط و کتابت کر رہا تھا کہ اس قبرستان کو یہاں سے ہٹا کر آبادی سے دور لیجایا جائے اور یہ قبرستان مجھے الاٹ کر دیا جائے۔ تاکہ میں فیکٹری کو پھیلا کر ملک اور قوم کے لئے زیادہ سے زیادہ ربڑ پیدا کر سکوں۔

میں نے سنا تھا کہ لاشیں سڑاند پیدا کرتی ہیں۔ مگر یہاں لاشوں کے بجائے ربڑ سڑاند پیدا کر رہی تھی۔

اپنے کفن کو تہبند کی طرح جسم پر لپیٹے ہوئے میں نے شہر جانے کی ٹھانی اردگرد کی قبروں میں پڑے ہوئے مردوں پر حسرت کی ایک نگاہ ڈالی اور ان سے کہا:۔

اب تو جاتے ہیں مے کدہ سے میر پھر ملیں گے اگر خدا لایا

شہر کے بڑے گیٹ کے باہر ایک سٹال پر آج کا اخبار دیکھا، خرید نہیں سکا کیوں کہ پیسے ہی نہیں تھے۔ اخبار میں وہی پرانی خبریں تھیں ــ گھیراؤ، ہڑتالیں پھر سی جھیتو اندولن، کیبرے ڈانس کے اشتہار۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ اخبار پڑھ کر یوں لگا جیسے باسی روٹی کھا رہا ہوں۔ اچانک ایک اخبار پر نظر پڑ گئی جو میرے ایک جیوتشی دوست جناب کھجو رانند کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔ لکھا تھا۔

فکر تونسوی کا انتقال ــ پیش گوئی سچ نکلی

مشہور جیوتشی آچاریہ جناب کھجو رانند جی نے دو برس پہلے ہی بطور نگر

فکر تونسوی کی موت کی پیش گوئی کی تھی کہ آپ باون سال، اور ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اپنے بال بچوں اور قرض خواہوں کو روتا دھوتا چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ یہ پیش گوئی منٹ، اور سکنڈ کی حد تک صحیح نکلی ۔ لہذا اپنے مستقبل کے حالات جاننے کے لئے جیوتشی کھجورا نند کی خدمات حاصل کیجئے۔

اشتہار پڑھ کر میں اداس ہو گیا۔ میرے زندہ سلامت لوٹ آنے پر بے چارے کھجورا نند کے بزنس کو شدید دھکا لگے گا۔ کیا میں دنیا کا بزنس تباہ کرنے کے لئے واپس آیا ہوں ؟ میں کھجورا نند سے مل کر اسے مشورہ دوں گا کہ تم ایک خنجر اٹھا کر مجھے دوبارہ مار دو ۔

میں نے ایک اسکوٹر رکشا والے سے کہا " گل مہر پارک چلو گے ؟"

ہمارے دہلی شہر میں یہ رواج تھا کہ اگر اسکوٹر رکشا والے سے چاندنی چوک چلنے کے لئے کہا جائے تو جواب دے گا کہ میں تو انڈیا گیٹ جاؤں گا۔ اور اگر انڈیا گیٹ چلنے کے لئے کہا جائے تو کہے گا کہ شاہدرہ چلنا ہے تو لے چلوں گا۔

مگر اس اسکوٹر والے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ ٹکٹکی باندھ کر مجھے گھورنے لگا۔ میرے بدن پر سستا سا ریشمی کفن بندھا دیکھ کر بولا۔ " آپ کون ہیں یہ مردے کا کفن کیوں باندھ رکھا ہے ؟"

میں نے کہا " میں فکر تونسوی ہوں۔ یہ کفن میرا اپنا ہے - چرایا ہوا نہیں ہے"

"فکر تونسوی ہو؟" اسکوٹر ڈرائیور گھبرا کر اپنی سیٹ سے اچھلا ۔" مگر وہ تو انتقال کر گیا ہے۔ اور تم ؟" یہ کہتے کہتے وہ اسکوٹر چھوڑ کر تیزی سے بھاگ گیا۔ شاید وہ مجھے بھوت سمجھ کر بھاگا تھا۔ میری حالت بھی کسی بھوت سے مختلف نہیں تھی بے ہنگم بڑھی ہوئی داڑھی، سر کی بجائے بدن پر کفن، بھوک پیاس سے ہڈیاں باہر اور آنکھیں اندر، جسم پر جگہ جگہ مٹی لتھڑی ہوئی اور پاؤں سے بھی ننگا (حیرت ہے کہ دفن کرتے وقت مردے کو جوتا کیوں نہیں پہنایا جاتا ؟)

تھکن، بھوک، توہین اور اداسی ــ جو عام ہندوستانی کے نصیب

میں ہے۔ میں بھی ان کا مجموعہ بنا ہوا تھا۔ اب میری پوزیشن بے حد عبرت ناک تھی نہ میں اپنے گھر جا سکتا تھا۔ نہ واپس قبرستان جا سکتا تھا۔ سگریٹ پینے کی خواہش تیزی سے اٹھی مگر جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا، بلکہ سرے سے جیب ہی نہیں تھی پہلے اپنے آپ کو فکر تونسوی کہہ کر کسی بھی دکان دار سے سگریٹ ادھار لے سکتا سکتا تھا۔ مگر اب؟ حالانکہ میں سو فی صدی وہی فکر تونسوی ہوں۔ لیکن مجھے کوئی سگریٹ تک ادھار نہیں دے گا۔ مرنے کے بعد فکر تونسوی اپنا اعتماد اپنی ساکھ کھو چکا تھا۔ آہ! صرف سات دن میں فکر تونسوی کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

تھکا ہارا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں قریبی کمیونٹی ہال کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا سیڑھیوں کے اوپر کپڑے کا ایک بڑا سا نیلے رنگ کا ماٹو لگا ہوا تھا۔

طنز نگار فکر تونسوی کی یاد میں ماتمی جلسہ۔

رائٹرز اینڈ جرنلسٹ ایسوسی ایشن کی طرف سے

ماٹو پڑھ کر میرے دل میں ہوک سی اٹھی۔ جی چاہا کہ عوت کے بعد عزت کا کفن پہنانے والے احباب سے ملوں اور ان کے گلے سے لپٹ لپٹ کر رووٴں اور کہوں، "یارو! میری جدائی میں ٹھنڈی آہیں مت بھرو میں لوٹ آیا ہوں۔"

میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا ہال کے اندر داخل ہوا اور احساس کمتری کے مارے سب سے پچھلی بنچ پر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ سارے ماحول پر اداسی اور غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اسٹیج کے سیاہ پردے کے پیچھے سے ایک ماتمی دھن بج رہی تھی۔ کتنی لطیف دھن تھی۔ ماتم میں بھی کتنی گہرائی اور کتنا وقار ہوتا ہے جی چاہا کہ یہ دھن بجتی رہے ۔۔ بجتی رہے اور میں مرا رہوں۔ مرا رہوں۔

اتنے میں جلسے کا سکریٹری مائک پر آیا۔ میں اسے جانتا تھا۔ اس نے ایک ادبی میگزین میں ایک مرثیہ لکھا تھا: "فکر تونسوی کے طنز کی موت اسی دن واقع ہو گئی تھی جس دن اس نے طنزیہ مضامین لکھنے شروع کئے تھے۔" اور میں نے یہ

فقرہ پڑھ کر کہا تھا: "اگر یہ فقرہ دل کش نہ ہوتا تو میں اس حاسد شخص کے منھ پر طمانچہ لگا دیتا۔" اب سکریٹری نے رندھے ہوئے گلے سے کہنا شروع کیا: "دوستو! مقامِ تاسف ہے کہ آج ہمارا محبوب و مقبول طنز نگار فکر تونسوی ہماری محفل میں موجود نہیں ہے۔ وہ ہمارے طنزیہ ادب کو سونا کر کے چلا گیا۔"

ماتم گسار احباب نے وفورِ جذبات سے داد کی تالیاں بجائیں۔ ایک تالی میں نے بھی بجائی اور طنزیہ ادب کو سونا کرنے کے غم میں شریک ہوا۔

اگلی نشستوں پر دو صاحب بیٹھے کھسر پھسر کرنے لگے۔ ایک نے کہا "حرام زادہ بکواس کر رہا ہے۔ فکر تونسوی سے تو یہ انتہائی نفرت کرتا تھا۔"

دوسرا بولا "اور میں نے سنا ہے کہ اس نے مرحوم کی بیوہ کی امداد کے لئے پانچ ہزار روپے چندہ اکٹھا کیا ہے جس میں آدھا ہڑپ کر گیا ہے۔"

"ہی ہی ہی! کہیں نہ کرتا! یہ خود کشی تو ایک بیوہ ہے۔"

اس کے بعد صدرِ جلسہ نے مرحوم فکر تونسوی کی قد آدم تصویر کو ایک پھول مالا پہنائی۔ پھول مالا کی خوشبو اور ملائمت مجھے اپنے بدن میں محسوس ہونے لگی۔ بعض اوقات ٹریجڈی بھی کتنی ملائم اور معطر ہوتی ہے! میں جیسے مستی میں لہرا سا گیا۔ صدرِ جلسہ نے پھول مالا پہنانے وقت گلوگیر لہجے میں ایک شعر پڑھا:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

حاضرین میں سے ایک ینگ ٹرک قسم کا ادیب بے اختیار چلا اٹھا: "ہائے! ظالم نے کتنا صحیح شعر کتنے غلط موقع پر پڑھا ہے۔"

میرے ایک انتہائی مداح دوست نے اسے گردن سے پکڑا اور کشاں کشاں باہر جا کر پھینک آیا۔

اس کے بعد صدرِ جلسہ نے ماتم گسار احباب کو تقریریں کرنے کی اجازت دی۔ اور ہر ایک نے ثابت کر دیا کہ صرف وہی فکر تونسوی کو قریب سے جانتا تھا۔ ایک ڈاکٹر صاحب

نے کہا مرحوم کو جب بھی کھانسی ہوتی تھی۔ مجھ سے ہی گولیاں لے جاتا تھا۔ اور یہ گولیاں ادبی خدمات کے سلسلے میں دی جاتی تھیں۔ ایک جرنلسٹ دوست نے دعویٰ کیا کہ ایک بار مرحوم نے میرے ساتھ شملے تک کا سفر کیا تھا تو اس نے انھیں راستے میں آلوچے کھلائے تھے۔ ایک پبلشر نے تین بار ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے تین بار اس بات کا ذکر کیا" مرحوم اپنی موت سے کچھ دن پہلے مجھ سے ایک سو روپے ادھار لے گئے تھے اور ان سے اپنی قمیص پتلون سلوائی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مرحوم کا میموریل ہال بنایا جائے تو اس پتلون قمیص کو میری خاص یادگار کے طور پر اس میں ضرور رکھ دیا جائے گا۔"

میرا جی چاہا کہ اٹھ کر اس پبلشر کا پردہ چاک کر دوں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش بیٹھا رہا کہ مرحوم لوگوں کا اعتبار کون کرتا ہے۔

ایک اور صاحب اٹھے۔ وہ انتہائی گھٹیا شاعر اور انتہائی امیر آدمی تھے۔ وہ بڑے عیش میں تھے میز پر مکا مارتے ہوئے گرج کر بولے: میں... میں....

میں ساہتیہ اکیڈمی سے پوچھتا ہوں کہ مرحوم کو ادبی ایوارڈ کا مستحق کیوں نہیں سمجھا گیا تھا؟ اور اگر زندگی میں نہیں سمجھا گیا تو کم از کم موت کے بعد ہی انھیں ایوارڈ دے دیا جائے۔"

اس پر شیم شیم، نعرے لگائے گئے۔ یہ جلسے نے فکر تو نسوی کو "شیم شیم" کہا گیا یا ساہتیہ اکیڈمی کو؟ بہرکیف، غصے اور جوش کی متفقہ تالیوں کی گونج میں اس تجویز کی تائید کر دی گئی۔

ماتمی میٹنگ کے خاتمے سے چند منٹ پہلے صدر جلسہ اٹھ کر چلے گئے، کیونکہ انھیں ایک سفارت خانے کی کاک ٹیل پارٹی میں شرکت کرنا تھی۔ مگر جاتے جاتے وہ ماتمی فنڈ میں ایک سو ایک روپیہ چندہ دینے کا اعلان کر گئے، اور باقی ماندہ حضرات نے انسانیت کے بوجھ تلے یوں کہ جس طرح چندہ ادا کیا اس کے لئے پورے ایک ایکٹ کے ڈرامے کی ضرورت ہے۔

ایک ایکٹ کے اس ڈرامے میں کلائمکس اس وقت پیدا ہوا جب سیاہ ساڑھی میں ملبوس میری بیوہ بیوی کو مائیکروفون پر آنسو بہانے کے لئے لایا گیا۔ اس نے سہاگ کی آخری چوڑی سٹیج پر توڑی، مانگ کا سیندور اور بندی مٹائی آنکھوں کا کاجل پونچھا اور پھر ان میں آنسو بھر لائی۔ اس ماتمی حالت میں میری بیوی مجھے نہایت دل کش اور دل ربا لگی۔ بیواؤں کی شخصیت میں بھی ایک عجیب سی سستی، بھیگی بھیگی جاذبیت ہوتی ہے۔ میں نے جی ہی جی میں کہا: "اے ظالم! تو میرے جیتے جی بیوہ کیوں نہیں بن گئی؟"

اس کی مسلسل سسکیوں سے محفل کی تمام آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، مگر یہ غم کے نہیں، خوشی کے آنسو تھے، کہ کم از کم میری موت کے بعد تو مجھے بیوی کی محبت ملی، ورنہ اس سے پہلے جب بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آتے تھے، اپنی ماں کی یاد میں ہی آتے تھے۔

اور پھر میری بیوی کی خاموش ماتم گساری سے محفل پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ کسی کے منہ سے کوئی لفظ تک نہیں نکلتا تھا۔ نہ آہ کا نہ واہ کا۔ چنانچہ محفل کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر سکریٹری نے جلسہ کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اور "فکر تونسوی میموریل کمیٹی" کے پانچ معزز ممبران میری بیوی کی دلجوئی کے لئے قریبی ریسٹوران میں چلے گئے۔ یہ ریسٹوران کافی اور آملیٹ کے لئے بہت مشہور تھا۔ کاش! میں ان سے اتنا کہہ سکتا: "حضرات میرے نام کے چندے میں سے ایک کافی اور آملیٹ اس بدنصیب کو بھی مل جائے۔"

ہال ماتم کرنے والوں سے خالی ہو گیا میں آخری آدمی تھا جو اپنی نشست پر بیٹھا رہا، بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا— نہ جانے کتنے سال بیٹھا رہا، نہ جانے کتنی صدیاں کہ اچانک کسی نے میرا کندھا جھنجھوڑا اور ایک کرخت سی آواز آئی: "صاحب اٹھئے میٹنگ ختم ہو گئی۔"

اور میری صدیوں کی نیند کھل گئی۔ میرے سامنے کمیونٹی ہال کا چپراسی کھڑا تھا۔ میں نے ہڑبڑا کر پوچھا "میں کہاں ہوں۔"

چپراسی ہنس دیا۔ "فکر صاحب! آپ کمیونٹی ہال میں ہیں۔ آپ ملک کے مشہور شاعر جناب گھائل نامرادی کے ماتمی جلسے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ جلسہ کب کا ختم ہو گیا۔ آپ گھر نہیں جائیں گے کیا؟

میرا پُنرجنم

اور پھر یوں ہوا کہ میرا پنر جنم ہو گیا۔ چاروں طرف نظر ڈالنے پر معلوم ہوا۔ کہ میرے ساتھ میری بیوی نے پنر جنم نہیں لیا، معلوم ہوتا تھا، وہ مجھ سے بور ہو چکی تھی اور میرا بھی یہی خیال ہے۔ کہ بیوی سے ایک جنم کی رفاقت ہی کافی ہوتی ہے بیوی ایک لطیفہ ہے جو دہرانے سے باسی ہو جاتا ہے۔

میں دوبارہ جنم نہیں لینا چاہتا تھا، کیونکہ میرا یہ پختہ یقین تھا کہ آتما ایک مرغے کی مانند ہے جو ہر جنم میں ککڑوں کوں ہی کرتی ہے۔ اگر کبھی ککڑوں کوں کی بجائے میاؤں میاؤں کرنے لگے تو نیا جنم لینے میں کوئی برائی نہیں۔ اس لئے میں چاہتا تھا۔ یا تو میری آتما پرم آتما میں مل جائے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو۔ تو مجھے انسان کی بجائے اُلّو بنا دے لیکن پرم آتما نے اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر مجھے پھر انسانی چولا دے دیا۔ کہ انسان کو اُلو بننا بھی نصیب نہیں۔

جس گھر میں پیدا ہوا۔ وہ میرے سابقہ مکان سے تین گز کے فاصلے پر تھا حالانکہ خدا کی دھرتی اتنی وسیع تھی۔ کہ وہ مجھے کہیں اور پیدا کر سکتا تھا۔ اگر میں اتنا ہی کیا گذرا تھا۔ یعنی ادیب تھا تو مجھے کانگو میں پیدا کر دیتا جزیرہ سماٹرا میں پیدا کر دیتا لندن بھی کوئی برا نہیں تھا۔ اس سے ذرا ورائٹی رہتی لیکن ہوا یہ کہ محلے کی ایک گلی سے میری لاش نکلی اور دوسری گلی سے میری آتما پھر داخل ہو گئی۔ بعض آتمائیں اتنی

سست رفتار ہوتی ہیں۔ کہ صرف دو گھڑوں کا فاصلہ دو جنموں میں طے کرتی ہیں۔

میرے سابقہ والد صاحب کا نام کشن داس تھا، موجودہ والد کا نام لیشن داس۔ دونوں کسی ایک غزل کے دو قافیے معلوم ہوتے تھے۔ دونوں پڑوسی تھے اور رواج کے مطابق جانی دشمن تھے۔ اور پھر ابھی دونوں کا پنر جنم بھی نہیں ہوا تھا۔ انسانی رشتوں کی تاریخ میں شاید سب سے پہلی دُرگھٹنا تھی کہ ایک بیٹے کے دو والد تھے، دونوں جائز تھے اور دونوں ابھی زندہ تھے۔

چنانچہ میں چھ برس کا ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں دو کشتیوں میں سوار ہوں۔ مجھے ارد گرد کی ہر شے جانی پہچانی لگی۔ وہی در و دیوار، وہی گلی۔ وہی گلی کے سرے پر گندی نالی کے قریب کھانستا ہوا بابا مکندرا۔ وہی بیوہ رام دلاری کے دھول مٹی میں لوٹتے ہوئے ننگے بچے۔ جنھیں میرے دو جنموں کے دوران کبھی تن ڈھانکنے کے کپڑے نہیں مل سکے تھے۔ اور وہی میرا آوارہ بھائی کالو جو سنیما کی ٹکٹیں بلیک میں بیچا کرتا تھا اور مجھے کہا کرتا تھا۔ "لیو شٹ اپ! بھگوان جسے بھی پیدا کرتا ہے اسے روزی ضرور دیتا ہے۔ چاہے کسی ڈھنگ سے دے"

شروع شروع میں تو مجھے تعجب ہوتا رہا اور میں خاموش رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ گذشتہ جنم کی بہت سی یادیں میرے ذہن کے سمندر میں سے لاشوں کی طرح ابھر ابھر کر باہر آنے لگیں۔ اور میں بے چین ہو اٹھا۔ اور آخر ایک دن اپنے موجودہ والد صاحب سے کہا "جناب معاف کیجئے! آپ میرے والد نہیں ہیں۔"

والد صاحب مسکرا دیئے۔ ہر والد اپنے بچے کی معصوم شرارت پر مسکرا دیتا ہے اور بلند آواز میں میری موجودہ والدہ کو پکارنے لگے۔ "سنا تم نے! تمہارا بیٹا کیا فرما رہا ہے۔ ہی ہی ہی!"

میں نے کہا۔ "مگر وہ بھی میری والدہ نہیں ہیں۔"

اس پر والد صاحب گمبھیر ہو گئے۔ ایک ہلکا سا تھپڑ عرض کرتے ہوئے بولے "تو پھر نا ہنجار! تم کون ہو؟"

"میں فکر تونسوی ہوں"

فکر تونسوی ۔۔ ؟ والد صاحب کو یہ نام کچھ مانوس معلوم ہوا۔ شاید وہ میری تحریروں کا مطالعہ کرتے رہے تھے بڑے یقین سے بولے ۔۔۔ " مگر وہ تو انتقال کر چکا ہے۔"

میں نے کہا " بجا فرمایا۔ مگر اس کا مستقل انتقال نہیں ہوا۔ دراصل اسے کسی نے قتل کر دیا تھا۔ اور ۔۔۔۔"

والد صاحب بولے ۔" میں جانتا ہوں"

میں نے کہا ۔" ہاں، اور اس کے بعد ۔۔۔"

وہ بولے اور اس کے بعد تم سیدھے ہمارے گھر میں آ گئے ! اور پھر دو سکنڈ سوچنے کے بعد انھوں نے میرا مزید امتحان لینے کی خاطر پوچھا۔ " اچھا، تمھارے پہلے والد صاحب کیا کام کرتے تھے۔

میں نے کہا " ہلدی میں ملاوٹ کرتے تھے "

یہ سنتے ہی ان کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔ اور مزید پیلا ہونے کے شوق میں کچھ اور سوال کئے جن کے میں نے سو فی صدی صحیح جواب دیئے مثلاً رام دھن بجاج کی بیوی برہم کماریوں کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ علاقے کے اسکول کے پرنسپل صاحب گھڑیاں سمگل کرنے کے جرم میں گرفتار ہو گئے تھے اور مندر کے پروہت درشنا نند ایک بھگتنی کو بھگوان کے ڈائرکٹ درشن کرانے کے لئے اغوا کر کے لے گئے تھے۔

اس پر والد صاحب کی حالت غیر ہو گئی۔ اور جب انھوں نے والدہ صاحبہ کو بتایا کہ ہمارے گھر میں جس لڑکے نے جنم لیا ہے۔ وہ پچھلے جنم میں شاعر اور ادیب تھا تو والدہ نے سر پیٹ لیا۔ کہ ہائے بھگوان ! ہم نے کون سے برے کرم کئے تھے۔ کہ ہمارے گھر میں شاعر پیدا ہو گیا۔ مگر میں نے والدہ صاحبہ کو سمجھایا۔ کہ اب میں اس جنم میں شاعر اور ادیب نہیں بنوں گا۔ بلکہ ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس کروں گا۔

مگر والدہ رکتے ہوئے بولی "تمہارا صرف جسم بدلا ہے روح تو وہی ہے۔ اور روح اپنا کردار تھوڑے بدلتی ہے۔"

ہوتے ہوتے سارے شہر میں واویلا مچ گیا۔ کہ کشن داس کیش ایجنٹ کے گھر جس بچے درشن کمار نے جنم لیا ہے۔ وہ دراصل فکر تونسوی ہے۔ یہ خبر میرے سابقہ والد صاحب کشن داس تک بھی پہنچی تو انھیں بہت رنج ہوا۔ اور ایک دوست سے کہنے لگے۔ "دھتکار ہے ایسے بیٹے پر۔ جب اسے معلوم تھا۔ کہ کشن داس سے ہماری دیرینہ عداوت ہے۔ تو اس میں کیوں پیدا ہوا۔ وہ بالکل ناخلف ثابت ہوا۔ بعض بیٹے زندگی میں ناخلف ہوتے ہیں۔ مگر یہ مرنے کے بعد ناخلف نکلا۔

اور پھر یہ سن کر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ کہ وہ آواگون کی تھیوری کے ہی خلاف ہو گئے ہیں۔ اور کہتے پھرتے ہیں۔ وہ میرا بیٹا ہی نہیں ہے۔ نجانے کون ہے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ پہلے آواگون کے زبردست حمایتی تھے اور کہا کرتے تھے۔ "بیٹا! تمہاری ماں پچھلے جنم میں بھینس تھی۔ ایک بار میں نے اس بھینس کو ڈنڈا مارا۔ تو اس نے دھمکی دی تھی۔ کہ میں اس کا بدلہ لوں گا۔ چنانچہ اب وہ میری بیوی بن کر پچھلے جنم کے ڈنڈے کا بدلہ لے رہی ہے۔"

میرے درشن کے لئے غول کے غول ہمارے گھر آنے لگے۔ آنے والوں میں میری محبوبہ بھی تھی۔ جو پہلے میرے ہجر میں روتی تھی اب وصال پر رونے لگی۔ کیوں کہ اب مجھ پر عشق کی بجائے بچپن سوار تھا۔ اور میں بھی اپنے سابقہ والد صاحب کی بجائے اپنی بیوی کو دیکھ آیا اور اس کی بیوگی پر چوری چھپے روتا رہا۔ کیونکہ یہ ایک عجیب بے ڈھنگی صورت حالات تھی۔ کہ ایک عورت کا خاوند زندہ تھا۔ مگر سماج اسے بیوہ کیے جا رہا تھا۔

اخباروں نے ایک شرارت یہ کی کہ میرے سابقہ اور موجودہ جنم دونوں کے فوٹو ساتھ ساتھ شائع کیے اور اس طرح اپنے گاہکوں کو احمقانہ مسرت عطا کی۔ دوسری طرف آواگون کے حمائیتوں اور مخالفوں میں خانہ جنگی کی خبریں آنے لگیں۔ اور ان

میں زخمی ہو کر ہسپتال میں بھی پہنچ گئے۔ میرے پچھلے جنم کے احباب مجھ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔ "فکر تونسوی! تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے پنرجنم ہو گیا ہے۔ خدا تم سب کو پنرجنم عطا کرے۔"

محلے کی رام دیئی مجھے ملنے کے لئے آئی۔ مجھے دیوتا سمجھ کر چرن چھوتے ہوئے بولی۔ "بیٹا! تم بھگوان سے مل کر آئے ہو۔ اُدھر تم نے میرے بیٹے دولت رام کو تو نہیں دیکھا؟"

میں دولت رام کو جانتا تھا۔ اس کے نصیب میں دولت کم اور زخم زیادہ لکھے تھے۔ وہ شاعر رواج کے مطابق بھوکا ننگا تھا۔ وہ گھٹیا، سستی ٹھرا شراب پیتا تھا۔ اور پیتے پیتے بھگوان کو پیارا ہو گیا تھا۔" میں نے کہا "لیکن ماں جی! زخمی صاحب......... تو ادھر کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ ممکن ہے میری طرح پنرجنم لے چکے ہوں۔"

وہ بولی۔ "لیکن کہاں ـــــ بیٹا! اس کی تو کوئی سدھ خبر ہی نہیں"

میں نے دانشمندوں کی طرح جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے وہ اسی محلے میں پیدا ہو چکے ہوں، لیکن ماں جی! نیا جنم تو کرموں کے مطابق ملتا ہے۔"

وہ بولی۔ "کرم تو اس کے اتنے اچھے تھے بیٹا! کہ وزیر بن سکتا تھا۔"

"پھر وہ نرک میں گیا ہو گا ماں جی۔" میں نے کہا۔

رام دیئی مجھے گالیاں دیتی ہوئی چلی گئی۔

میری موجودہ والدہ صاحبہ بجا فرماتی تھیں۔ کہ میرا جسم بدلا تھا۔ روح وہی تھی۔ وہ کھرا پن، وہی بے لاگ لپٹ گفتگو، یعنی وہی راست بازانہ حماقتیں۔ اب لوگ میری باتیں سن کر خوش نہیں ہوتے تھے، نالاں ہو جاتے تھے۔ دھیرے دھیرے انھوں نے ہمارے گھر آنا جانا بند کر دیا۔ محلے کے معززین نے اپنے بچوں کو میرے ساتھ کھیلنے

کودنے سے منع کر دیا۔ عورتوں نے میری ماں سے مردوں نے میرے باپ سے بول چال بند کر دی اور اب ماں باپ مجھے سانپ کا بچہ سمجھ کر پالنے لگے۔

امید و یاس کے ماحول میں میں بہت اداس ہو گیا۔ راتوں کو تنہائی میں زار و قطار رو دیا کرتا کہ اے خالق کل! میری یادیں مجھ سے چھین لے۔ پچھلے جنم کا ہر عطیہ واپس لے لے۔ لیکن خالق کو شاید یہ منظور نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ زندگی میرے لئے دوبھر ہوتی گئی، خالق نے مجھے نیا جنم ضرور دیا تھا، نئی عقل نہیں دی تھی۔ اس لئے دنیا خوا مخواہ مجھ سے خوف کھانے لگی، مجھ سے دور بھاگنے لگی۔ اور میں چھ برس کا ننھا سا لڑکا اتنی وسیع، عریض دنیا میں تنہا ہو گیا۔ اور اپنی زندگی صرف اپنے سا تک گذارنے لگا۔

لیکن اچانک ایک دن تنہائی کا یہ حلقہ ٹوٹ گیا۔

دراصل اخباروں میں برابر مطالبہ ہونے لگا۔ کہ فکر تونسوی کو جس آدمی نے قتل کیا تھا ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا۔ اس لئے کیوں نہ اب فکر تونسوی سے ہی قاتل کا نام پوچھ لیا جائے۔ قانون اگر نالائق ہے تو پنر جنم سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے۔

اس مطالبے پر شہر بھر میں میرا مردہ پھر زندہ ہو گیا۔ ایک ہجوم نے غصے میں آ کر تھانے کو آگ لگا دی۔ آخر تنگ آ کر سرکار نے ایک پولیس افسر میرے پاس بھیج دیا اور وہ بولا۔" صاحب!"

میں نے کہا وہ فوت ہو چکا ہے

وہ بولا "آہ! اس کی موت ہی تو ہماری مصیبت بن گئی ہے۔ آپ ہی ہیں، اس مصیبت سے چھٹکارا دلائیے اور بتائیے کہ آپ کو کس نے قتل کیا؟"

میں نے کہا۔ "ایک سکوٹر ڈرائیور نے"

"وجہ"

"بہت معمولی۔ اس نے مقررہ کرائے سے بیس پیسے زیادہ طلب کئے تھے

میں نے اسے شرم دلائی۔ جس پر اس کا پارہ چڑھ گیا۔ اور اس نے چھرا نکال کر میرے پیٹ میں بھونک دیا۔"

پولیس افسر بولا۔ "صرف بیس پیسے کے لئے؟ اتنے بڑے ادیب کو صرف بیس پیسے کی خاطر مار ڈالا۔"

"جی ہاں! ان دنوں بیس پیسے میں ایک سنگترہ آجاتا تھا۔ مگر ادیب لوگ پانچ پانچ پیسے میں مل جاتے تھے۔ ریٹ کا فرق تھا نا جی!"

پولیس افسر کو طیش آگیا۔ بولا۔ "ہم اسے پھانسی پر لٹکا دیں گے، آپ اس کا نام بتائیے۔ سکوٹر کا نمبر بتائیے۔"

مجھے اس کا حلیہ اور سکوٹر نمبر پوری طرح یاد تھا۔ لیکن ... لیکن۔ کیا یہ اسے پھانسی دیں گے؟ میرا ننھا سا جسم کانپ اٹھا۔ یوں لگا، جیسے پھانسی کا پھندا آہستہ آہستہ سکوٹر ڈرائیور کی بجائے میری طرف بڑھ رہا ہے، نہیں نہیں، میں اس کا حلیہ نہیں بتاؤں گا۔ مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے اور میں سچ مچ بھاگ کھڑا ہوا، زور زور سے بھاگتا گیا۔ بھاگتا گیا، گلی، سڑک، بازار۔ اور پھر میں پیچھا کرنے والوں کی نظر بچا کر ایک تنگ و تاریک گلی میں گھس گیا۔ اور پھر یوں محسوس ہوا، جیسے اس اندھیرے میں ایک چہرہ ابھرا ہے، یہ چہرہ بھیانک تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمکیلا چھرا تھا۔ اور میں نے اسے پہچان لیا یہ وہی تھا، بالکل وہی وہی سکوٹر ڈرائیور۔

اور اس نے میرے پیٹ میں چھرا گھونپ کر ایک بار پھر مجھے قتل کر دیا۔

زورِ خطابت

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مشاعرے میں صدارتی خطبہ

معزز حاضرین اور ان کے اطفال کرام!

آپ نے مجھے اس مشاعرے کی صدارت کا اعزاز عطا کر کے حماقت کا ثبوت دیا ہے یا ذہانت کا۔ میں نہیں جانتا۔ لیکن گزشتہ کئی دنوں سے مجھے شک ہو رہا تھا کہ مجھ سے کوئی نہ کوئی نازیبا حرکت سرزد ہونے والی ہے۔ ایک خوف یہ بھی تھا کہ شاید مجھے کسی قبر کا مجاور بنا دیا جائے گا یا کسی اجتماع کی صدارت سونپ دی جائے گی۔ جیسے گائے بانجھ ہو جائے تو اسے گئوشالہ میں ڈال دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شاعر، شاعری ترک کر دے تو اسے کان سے پکڑ کر مشاعرے کی صدارتی کرسی تک پہنچا دیتے ہیں۔

بھائیو! اس "گئورکھشا" پر میرے ساتھ ہمدردی کیجئے۔

پرسوں کی بات ہے۔ یہی سکریٹری صاحب جو مرغابی کی طرح گردن پھیلائے خوش خوش نظر آ رہے ہیں میرے پاس ماتمی چہرہ لئے ہوئے تشریف لائے اور بولے۔ "فکر صاحب! براہ کرم آپ ہمارے مشاعرے کی صدارت قبول فرمائیے"

میں نے کہا: "مگر آپ نے تو جناب لبھو لبھورا صاحب کو صدر بنانے کا اعلان کر رکھا ہے"

وہ بولے "افسوس! کہ کل وہ اچانک انتقال فرما گئے"

سامعین حضرات! میں نے بہت مشکل سے آنسوؤں کو روک کر اسٹیج سکریٹری سے کہا۔ آپ مجھے جس راستے پر ڈال رہے ہیں وہ سیدھا لفظی طورا کی طرف جاتا ہے۔ لیکن شعر و ادب کی خدمت کے لئے میں جہنم یا جنت دونوں جگہ جانے کے لئے تیار ہوں۔ بھائیو! آپ نہیں جانتے کہ میرے جہنم جانے کی پیش کش پر اسٹیج سکریٹری صاحب کس قدر مسرور ہوئے۔ جو لوگ دوسروں کی خوشی کے لئے مر جاتے ہیں۔ سنا ہے ان کا جنازہ مشاعرہ گاہ سے سیدھا قبرستان تک پہنچ جاتا ہے!

اور سامعین حضرات! جب مجھے ایک آراستہ کار میں بٹھا کر اس مشاعرہ گاہ تک لایا جا رہا تھا! تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ایک بکرا ہوں اور مجھے قربانی کے لئے قصائی کے پاس لے جایا جا رہا ہے۔ ابھی ابھی ایک صاحب نے میرے صدر بننے کی تائید فرمائی تھی۔ آپ کو ان کی تائید سے گمراہ نہ ہونا چاہئے۔ یہ ضروری نہیں کہ تائید انھوں نے دل کی گہرائیوں سے کی ہو۔ نہیں جناب! تائید کرنا ایک عادت ہے۔ جیسے سگریٹ پینے کی عادت، جھوٹ بولنے کی عادت، گالی دینے کی عادت۔ صرف عادت پر ادب عالیہ کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ آپ یہ نہ سوچئے کہ انھیں میرا صدر بننا پسند تھا۔ بلکہ ان کی ٹریجڈی یہ ہے کہ وہ منہ پھٹ نہیں ہیں۔

جب سے اسٹیج سکریٹری نے میری گردن میں پھولوں کے ہار ڈالے ہیں۔ میں اپنے آپ کو آپ لوگوں سے الگ تھلگ محسوس کر رہا ہوں۔ جیسے میں آپ سے زیادہ معزز شخص ہوں۔ اندازہ لگائیے، صرف پچیس پیسے کے ہار سے انسان معززین جاتا ہے پھر بھی سماج میں اس کی عزت ہمیشہ خطرے میں رہتی ہے۔ کیونکہ پھولوں کا ہار نہایت کمزور بنیاد ہے۔ کل ـــــ کوئی بھی شخص پچیس پیسے کا ہار خرید کر اپنی گردن میں ڈال لے گا اور کہے گا۔ "میں صاحب صدر ہوں ـــ" اس کا مطلب ہے حضرات! کہ نہ میں معزز ہوں نہ آپ ہیں۔ معزز یہ ہار ہے! اگر ابھی ابھی ایک صاحب پچاس پیسے کے دو ہار پہن کر اسٹیج پر آ جائیں اور کہیں کہ میں آپ سے ڈبل معزز ہوں! تو میں صدارت کا بائیکاٹ کر دوں گا۔ کیونکہ یہ اصول کا سوال ہے۔ آپ جانتے

ہیں اصولوں کے لئے لوگ "آنم واہ" تک کر لیتے ہیں۔ عزت یا تو اصول میں ہوتی ہے یا ہاروں میں۔ صدارت میں کبھی نہیں ہوتی۔

جناب! اگر یہ ہاروں والی صدارت کا قصہ آپ کو پسند نہ آیا ہو تو ایک اور صدر کا قصہ سن لیجئے۔ جس نے صدارت خریدی تھی اس نے مشاعرے کے منتظمین کو ایک سو ایک روپیہ چندہ عنایت فرمایا۔ جب وہ صدارت کے لئے اسٹیج پر تشریف لائے تو صدارتی کرسی پر کوئی دوسرے صاحب تشریف فرما تھے۔ انھوں نے منتظموں کو ایک سو ایک بار جھاڑنے کے بعد پوچھا۔ یہ کیا مذاق ہے؟" اسٹیج سکریٹری نے معذرت طلب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا کوئی قصور نہیں۔ ان صاحب نے ایک سو اکیاون روپے کی پیش کش کر دی تھی۔ اس لئے ہم انھیں صدر بنانے پر مجبور ہو گئے۔

دوستو! میں ان دردناک حادثوں کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں تاکہ آپ کو یقین دلا سکوں کہ میں آپ سے زیادہ معزز نہیں ہوں۔ موجودہ صدارت کے دوران مجھے برابر یہ کھٹکا لگا رہے گا کہ آپ میں سے کوئی بھی خوددار شخص اٹھ کر اسٹیج پر آجائے گا اور کہے گا "مسٹر صاحب! کرسی صدارت خالی کیجئے اس پر میں بیٹھوں گا! کیونکہ میری عزت آپ سے زیادہ ہے!"

لیکن اس کے باوجود جناب! مجھے نہ جانے کیوں یہ امید ہے کہ آپ ایسی اوچھی حرکت نہ کریں گے۔ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں میری باتیں سن کر آپ کے چہرے زرد پڑ گئے ہیں اور زرد چہرے کبھی خوددار نہیں ہوتے۔

اور شاید اب آپ انتظار کر رہے ہوں گے کہ میں کوئی صدارتی فرض ادا کروں گا۔ نہیں صاحب کرسی صدارت پر بیٹھنے کے بعد صدر اپنے فطری انجام تک جا پہنچتا ہے اور اب میری حالت زیادہ سے زیادہ اس قیدی کی سی ہے جس کی آزادی کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ صدر بن کر تین چار گھنٹے مسلسل کرسی پر معزز بن کر بیٹھے رہنا کتنا ذہنی عذاب ہے! اب میرے پاس

اپنا کچھ باقی رہا جو کچھ ہے. آپ حضرات کا ہے. میں آپ کی تمناؤں کا غلام بن کر کرسی پر بیٹھا رہوں گا. ہلکی سی کروٹ بھی لوں گا تو آپ سوچنے لگیں کے صاحب صدر بور ہو رہے ہیں اور بور ہونا صدارت کی شان کے شایاں نہیں. میرا سگریٹ سلگانا بدتمیزی سمجھا جائے گا. میز پر عینک اتار کر رکھنا غیر مہذب مخل تصوّر ہو گا. یعنی میں اپنی حالت زار پر نہ رو سکوں گا نہ ہنس سکوں گا. جناب میں سانس تک نہ لے سکوں گا. ورنہ شعراء حضرات سمجھیں گے میں انھیں ہوٹ کر رہا ہوں. اب میں آپ کی آنکھیں بچا کر ہی انگڑائی لے سکوں گا. اگر تازہ ہوا کے لیے دو چار منٹ کے لئے کھلی فضا میں جاؤں گا تو آپ سمجھیں کے مشاعرہ ختم ہو گیا ہے۔

ہاں پیارے دوستو! میں کوئی ایسی حرکت نہ کروں گا جو انسان کی معصوم اور بھولی بھالی فطرت سے تعلق رکھتی ہو. آہ! آپ نے ایک نیچرل انسان کو ان نیچرل بنا کر رکھ دیا ہے. اور اس کے باوجود آپ کہتے ہیں کہ آپ نے میری عزت کی ہے۔

ابھی ابھی آپ کے سامنے بڑے بڑے مقتدر شعراء اپنی تخلیقات پیش کرنے کے تشریف لا ئیں گے. جب سے شاعری نے جنم لیا ہے میرا اور آپ کا یہ اندھ وشواس رہا ہے کہ شاعری آسمان سے اتری ہے اور شعراء حضرات پیغمبر ہوتے ہیں. ایک بار میں نے پیغمبر بننے کا تجربہ کیا تھا. اور جس طرح کئی تجربے ناکام ہو جاتے ہیں. اسی طرح میرا پیغمبر بننا بھی ناکام ہو گیا. حادثہ یہ ہوا کہ میں آسمان سے جو پیغام لایا تھا. زمین پر کسی کی سمجھ میں نہ آیا. کیونکہ آسمانی بات کا تعلق اپنی سمجھ سے نہیں، دوسروں کی سمجھ سے ہوتا ہے. اسے ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے. ایک بار ایک کوا میری منڈیر پر یہ پیغام لے کر آیا کہ میری محبوبہ آنے والی ہے. تو جواب میں فرط مسرت میں اس کوے کو پھل کھلائے، چائے پلائی سگریٹ تک پیش کیا. لیکن اس پیغام کا نتیجہ یہ نکلا کہ میری محبوبہ کی بجائے کچہری کا بیلف آگیا جو مجھے سرکاری قرضہ ادا نہ کر سکنے کے جرم میں گرفتار کر کے لے گیا!

چنانچہ حضرات! میری پیغمبری کا بھی یہی انجام نکلا کہ میں کوے کے پیغام کا

مفہوم نہ سمجھ سکا۔ اس لئے پکڑا گیا۔ میری شعریت بھی دوسروں کی سمجھ کی غلام تھی۔ اس لئے ناکام ہوگئی کیونکہ میں ہتھکڑی کی بات کرتا تھا تو لوگ اسے محبوبہ کی زلفیں سمجھتے تھے۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ میں شاعر کی بجائے صدر بنا بیٹھا ہوں!

میں نے شاعری ترک کردی۔ لیکن ترک شاعری کے باوجود میں نے دیکھا کہ شاعری کی عظمت کم نہ ہوئی۔ مصیبت یہ ہے کہ ہر دور میں کئی شاعر ایسے ضرور پیدا ہوتے ہیں جو شور مچاتے ہیں کہ شاعری کا زوال قریب ہے اسے پھر بلندی عطا کرنی چاہیئے یہ اول درجے کے شعراء کہلانے لگتے ہیں۔ یہ دیکھ کر دوسرے اور تیسرے درجے شعراء بہت پریشان ہو جاتے ہیں کہ اعلیٰ شاعری کو برباد کرنے کے لئے ان کا مشن فیل ہو رہا ہے۔ ان میں سے کئی دریا میں چھلانگ لگا کر مر جاتے ہیں اور مرنے سے پہلے دریا کے کنارے پر کاغذ کا ایک پرزہ چھوڑ جاتے ہیں کہ یہ جاہل دنیا اس کی عظمت کو سمجھ ہی نہ سکی۔ لیکن کچھ شعراء جو دریا کے ٹھنڈے پانی سے ڈرتے ہیں خودکشی نہیں کرتے تنقید نگار بن جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک شاعر نے انتقام لینے کی غرض سے ایکسپورٹ امپورٹ کا دھندا شروع کر دیا اور خوب نام اور دام کمائے۔ اس طرح ایک اور شاعر نے شاعری سے بدلہ لینے کے لئے "ناشاعری" شروع کر دی جس کے یہ چند مصرعے مجھے ابھی تک نہیں بھولے۔

میں اپنے والد کی کھجلی کا ایک مسّہ ہوں
جی میں آتا ہے کہ
اپنے والد کی قبر پر گروں
اور کہوں
مجھ سے اپنی یہ جائداد واپس لے لو۔
میرے اندر کا جو چولہا ہے، لنڈھورا ہی کھلا۔
اور پھر قبر پر زور سے قے کروں۔
قے یعنی جائداد لوٹا دوں!

لیکن سامعینِ کرام! شاعر چاہے خودکشی کر لے، چاہے کھجلی کا مسّہ بن جائے۔

لیکن صرف ایسے ہی شاعروں کی بدولت مشاعروں اور میگزینوں کی رونق قائم رہتی ہے۔ یہ اتنا بڑا سماج جو مزدوروں سے لے کر یتیم خانوں سے ہوتا ہوا راج محلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ صرف دو چار عظیم شاعروں کے بھروسے پر نہیں چل سکتا۔ غالب ٹیگور۔ اور اقبال سے اس سماج کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر غالب اور اقبال کے پیچھے کئی ڈویژن شاعر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک آدھ ڈویژن اس مشاعرے میں بھی موجود ہے۔ اگر اس مشاعرے میں صرف ٹیگور ہوتا تو مشاعرہ پندرہ بیس منٹ میں ختم ہو جاتا۔ لیکن اب اللہ کے فضل سے یہ مشاعرہ رات کے تین بجے تک چلے گا۔ بڑے شاعر صرف بڑی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن سماج کو چھوٹی باتوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ چند دن ہوئے کافی ہاؤس میں دو شاعروں نے ایک دوسرے کے منہ پر کانچ کے گلاس پھینک کر ایک دوسرے کو لہو لہان کر دیا۔ کیونکہ دونوں ایک دوسرے کو گھٹیا شاعر کہہ رہے تھے حالانکہ دونوں اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ ٹیگور گھٹیا شاعر تھا۔

حضرات! میں دیکھ رہا ہوں کہ شعراء حضرات میرے خطبے سے بور ہو رہے ہیں اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے ہوٹ کرنا شروع کر دیں میں اسٹیج سکریٹری سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مشاعرے کا آغاز کر دیں اور مشاعرے کی حسین روایت کے مطابق پہلے گھٹیا شاعروں اور پھر ان سے کم گھٹیا شاعروں کو!!

محلّہ سُدھار کمیٹی

بھائیو، بہنو! تھوڑی سی والداؤ اور بہت سے بچو!

آپ نے یہ اچھا نہیں کیا کہ مجھے محلہ سدھار کمیٹی کی اس سالانہ میٹنگ کا مہمان خصوصی بنا دیا۔ میں مہمان خصوصی بننے سے ہمیشہ بدکتا ہوں کیونکہ یہ ایک ایسی عزت ہے جو انسان کو غیر فطری بنا دیتی ہے۔ اور اس سے راست گفتاری چھین لیتی ہے۔ مثلاً اب میں اتنا بھی نہیں کہہ سکتا کہ جس کرسی پر بیٹھا ہوں اس کی ایک ٹانگ ٹوٹنے کے قریب ہے اور میں پورے وقت ایک پہلو بیٹھ کر اپنے آپ کو سنبھالے رہا ہوں۔

حضرات! کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ پورا محلّہ ایک کرسی ہے۔ جس کی ایک ٹانگ ہمیشہ ٹوٹنے کے قریب رہتی ہے اور ہم سب ایک پہلو بیٹھے اپنے آپ کو سنبھالتے رہتے ہیں۔ اس سنبھالنے پر ہمارا کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے وقت کا یہ انتہائی بھونڈا استعمال ہے لیکن ہمیں اپنے محلّے سے چونکہ بے حد محبت ہے۔ اس لئے محبت کی خاطر ہمیں یہ بھونڈا پن کرنا ہی پڑتا ہے — جناب والا! محبت انسان کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ یہ تو ہماری ذہانت ہے کہ ہم نے اس بدنصیبی کو قربانی کا دلفریب نام دے کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا ہے۔ ورنہ خدا نے تو ہمیں جذبہ محبت عطا کر کے ہمارے ساتھ کافی بڑا

کیا تھا۔

میں نے ابھی ابھی آپ سب صاحبان بلکہ "صاحبات" تک کی تقریریں سنیں جو محلہ سدھار کے عظیم مقصد سے کی گئی ہیں۔ ان تقریروں سے ہی مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ہمارا محلہ بگڑے ہوئے انسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس لیے ہمارا سدھار ہونا چاہیے۔ آہ! یہ کتنی شرمناک بات ہے کہ خود ہی اپنے آپ کو ذلیل انسان کہہ کر ذلیل کریں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل تسلیم کر لینا بہادری ہے۔ اور ہم بہادر لوگ ہیں۔ صاحبان! اگر ایسا ہے تو میں حیران ہوں کہ آپ بہادر انسانوں کا سدھار کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ وقت کا بھونڈا استعمال نہیں ہے کہ آپ پیغمبروں کو نصیحت کریں کہ آپ کے کپڑے میلے ہیں، انھیں دھو لیجیے۔ حالانکہ پیغمبر اگر کپڑے نہیں دھوتا تو اس کی کوئی گہری اور فلسفیانہ وجہ ہوگی۔ جو اسے خود اچھی طرح معلوم ہوگی۔

اس لیے جناب! میری مانیے تو اس محلہ کا سدھار مت کیجیے، اگر آپ کے کپڑے میلے ہیں تو صابن سے دھو لیجیے صرف صابن کے پراپیگنڈہ کی خاطر اتنے زیادہ لوگوں کو ایک میٹنگ میں اکٹھا کرنے کی کیا ضرورت ہے! — چند دن ہوئے اس محلہ کے ایک بزرگ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے "ڈاکٹر صاحب! اس محلہ میں چوہوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ مگر کوئی ان کا تدارک کرنے والا نہیں ہے۔" میرا خیال ہے کہ وہ چوہوں کی سینہ زوری پر آبدیدہ نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کی آنکھوں میں کنکر گرے تھے۔ ورنہ چوہے تو چوہے دان کے ذریعے بھی آسانی سے پکڑے جا سکتے ہیں۔ اگر ہم چوہے دان اور صابن کا استعمال نہیں جانتے تو جناب ہمیں خدا سے دعا کرنی چاہیے کہ ہمیں اگلے جنم میں انسان نہ بنائے بلکہ چوہے بنا دے۔ جو کپڑے نہیں پہنتے اور جنھیں صابن کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا کہ چوہوں نے کبھی چوہا سدھار کمیٹی بنائی ہو۔ اور ککروں کی آڑ میں آنسو بہائے ہوں بھائیو اور بہنو! برا نہ مانیے تو میں کہوں گا کہ چوہے ہم سے زیادہ فطری زندگی گزارتے

نہیں۔

آپ شاید مجھ پر شک کر رہے ہوں گے کہ میں محلّہ کا سدھار نہیں چاہتا ایسا ہی شبہ مجھ پر اس محلہ میں بھی کیا گیا تھا جہاں میں دو سال پہلے رہتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے بھائیو! کہ دنیا کے ہر محلہ میں رات کو بے تحاشا کتّے بھونکتے ہیں جس سے اہل محلہ پریشان رہتے ہیں۔ ہر محلّہ میں ایک جھگڑالو عورت رہتی ہے جو خلل امن کا باعث بنی رہتی ہے۔ ہر محلّہ میں دو چار آوارہ گرد نوجوان لڑکے پیدا ہو جاتے ہیں جن سے محلّہ کا اخلاق تلوار کی دھار پر رہتا ہے اور ہر محلّہ میں پانچ دس ریٹائرڈ بوڑھے بھی ضرور رہتے ہیں جو نصیحتوں کے چراغ اپنے سرہانے جلا کر بیٹھتے رہتے ہیں۔

اور دوستو! یہ سب خدا داد نعمتیں ہیں۔ ان سے ہم بچ نہیں سکتے۔ ان میں سے میں کسی بھی محلہ کو ان نعمتوں سے محروم کر دیا جائے تو وہ محلّہ نہیں رہتا بلکہ جنت بن جاتا ہے اور معاف کیجئے، جنت ایک انتہائی اکتا دینے والی چیز ہے، جنت شوکیش میں ایستادہ "پلاسٹک" کی ایک چیز ہے۔ جس کے لب اگرچہ لعلیں ہیں مگر ان پر کسی کا بوسہ ثبت نہیں ہوا، کیونکہ اس بوسے میں نہ حلاوت ہوتی ہے نہ حرارت ــــ سچ بتایئے کیا آپ پلاسٹک کی اس حسینہ کو کوئی محبت نامہ بھیج سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر آپ اس جہنم کے خلاف کیوں شور مچاتے ہیں۔ میں تو جب محلّہ کی کسی جھگڑالو عورت یا آوارہ گرد لڑکوں کو دیکھتا ہوں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے جنت کے ساتھ جہنم بھی پیدا کر دیا اور ہمارے محلّہ کو پلاسٹک کی حسینہ بننے سے بچا لیا۔ جناب والا! خدا پر اعتبار کیجئے وہ ہم سے زیادہ ذہین اور دور اندیش ہے۔ جس نے ہمیں زندگی کی حلاوت اور لذت بخشنے کے لئے انگور ہی عطا نہیں کئے۔ بلکہ ریٹائرڈ بوڑھے بھی عطا کر دیئے جو لومڑی کا رول ادا کرتے ہیں۔

آج کی میٹنگ میں ایک معزز مقرر نے اشارتاً ذکر کیا ہے کہ ہمارے محلّہ میں ایک شاعر رہتا ہے جو رات کو شراب میں دھت ہو کر آتا ہے اور ادھم مچاتا ہے۔

انھوں نے تجویز کیا کہ اسے محلہ سے باہر نکال دیا جائے ــــ صاحبان میری رائے ہے کہ اسے محلے سے مت نکالئے ورنہ وہ کسی دوسرے محلہ میں چلا جائے گا۔ اور وہاں ادھم مچائے گا اور پھر نکال دیا جائے گا۔ کیونکہ ہر محلہ میں محلہ سدھار کمیٹی موجود ہے ــــ بہترا میں اس شاعر کو سمجھا دوں گا کہ وہ شاعری ترک کر دے اور کہیں لوئر ڈویژن کلرک بن جائے۔ شاعری ترک کرتے ہی وہ میگساری ترک کرے گا کیوں کہ لوئر ڈویژن کلرک کے اندر، ہلدی، نمک اور ایندھن خریدنے کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے اور شراب خریدنے کی جرأت اور استطاعت مر جاتی ہے۔ شراب ہی لطیف اور نفیس احساسات کو جگاتی ہے ــــ ہلدی اور نمک لطیف احساسات کو سلا دیتے ہیں۔ بلکہ مار دیتے ہیں۔ اس لئے اگر ہمیں اس شاعر کا سدھار کرنا ہے تو اس کے اندر بسے ہوئے شاعر کو مار دینا چاہیئے۔ ہمارے محلے کو شاعری کی ضرورت نہیں، ہلدی اور نمک کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ ہلدی اور نمک کبھی ادھم نہیں مچاتے۔ حضرات! اگر آپ سب لوگ شاعر نہیں بن سکتے تو اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ آپ کے لطیف احساسات ایندھن کے ڈھیر کے نیچے دب گئے ہیں، سو گئے ہیں، مر گئے ہیں۔

ہاں میں، اس شاعر کو سمجھا دوں گا کہ وہ مر جائے اس کی لاش کو کندھا دینے کے لئے پوری محلہ سدھار کمیٹی موجود ہے۔

چند دن ہوئے محلہ میں کیرتن کرانے کے لئے چندہ اکٹھا کیا گیا تھا میں نہیں جانتا کہ اس کیرتن سے محلے میں کتنے فی صدی روحانی جذبات پیدا ہوئے۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ کیرتن کے بعد پولیس آئی اور ہمارے محلے کے لالہ کانشی رام جی کو ڈپے کی بلیک کے جرم میں گرفتار کر کے لے گئی۔ حالانکہ لالہ جی نے کیرتن کے لیے سب سے زیادہ چندہ دیا تھا اور کیرتن کے بعد اپنے ہاتھ سے مقدس پرشاد بانٹا تھا (کیا یہ افواہ سچ ہے کہ اس نے اپنے بچوں کو نسبتاً زیادہ پرشاد دیا تھا؟) بہرکیف مجھے پولیس کا یہ فعل پسند نہیں آیا کیونکہ اس نے کیرتن کے روحانی اثرات پیدا ہونے کا بھی

انتظار نہیں کیا۔ دراصل لالہ کالنشی رام سے زیادہ ہمیں پولیس میں روحانی جذبات پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ کیرتن کے تقدس کو اس طرح ہتھکڑیاں پہنائی جاتی رہیں گی۔

جب میں نے جیل میں لالہ کالنشی رام سے ملاقات کی اور پوچھا کہ کیرتن کا یہ غلط نتیجہ کیوں نکلا تو انھوں نے فلاسفروں کی طرح جواب دیا۔ "لوہے کی بلیک ایک انفرادی مسئلہ ہے۔ آپ اسے کیرتن کے جماعتی نتیجے سے کیوں ملاتے ہیں۔ دیکھ لینا مجھے کیرتن کا پھل الگ ملے گا۔ اور میں چھوٹ جاؤں گا۔"

"کیسے؟" میں نے تشریحاً پوچھا۔

وہ مسکرائے اور بولے۔ "بھگوان نے میری عبادت سے متاثر ہو کر پولیس کی بدھی بھرشٹ کر دی ہے اور وہ میرے ساتھ رشوت کی بات چیت چلا رہی ہے کیرتن کا پھل رائگاں نہیں جاتا فکر صاحب! آپ کی عبادت میں سچی عقیدت اور خلوص ہونا چاہیے۔ میں پوچھتا ہوں ذرا بتایئے، پولیس کی بدھی بھرشٹ کرنے میں کسی کا ہاتھ ہے؟"

بھائیو۔ بہنو! لالہ کالنشی رام کی یہ تشریح اگرچہ انوکھی اور قابل فہم تھی لیکن اگر وہ واقعی رہا ہو گئے تو کیا ہم میں سے کسی کی جرات ہے کہ کیرتن کے روحانی اثرات سے انکار کریں۔ البتہ صرف ایک شبہ میرے دل میں ابھی تک رینگ رہا ہے کہ اس کیرتن کے بعد محلے کے بھگوان داس چپراسی کا سامان جب اس کے مالک شری نارائن داس نے باہر پھینک دیا تو کیرتن کا پھل بھگوان داس چپراسی کو کیوں نہیں ملا۔ حالاں کہ کیرتن میں اس نے سب سے زیادہ شردھا اور عقیدت اور خلوص کے ساتھ ڈھول بجایا تھا اور رات بھر جگنیا اور گاتا رہا تھا۔ کیا کوئی ایسا اہتمام نہیں ہو سکتا کہ خدا بھی اپنی بدھی بھرشٹ کر لے۔ یہ محلہ سدھار کمیٹی کا فرض ہے کہ وہ رشوت کا بندوبست کرے اور بھگوان داس چپراسی کو دوبارہ مکان دلا دے ورنہ خطرہ ہے کہ محلے میں کیرتن کی روایت غلط شکل اختیار کر جائے گی۔ اور کیرتن کے روحانی اثرات میں تضاد پیدا

ہو جائے گا۔ کم از کم عبادت کی سطح پر تو چپراسی اور آکرن مرچنٹ میں فرق مٹ جانا چاہئے۔ ورنہ ہمارے محلّے کے لوگ کیرتن کے لئے چندہ دینے سے ہچکچانا شروع کر دیں گے۔ ذرا سوچئے اگر چندہ جمع کرنے میں رکاوٹ پیدا ہو گئی تو کیا کیرتن منڈلی والے کم اجرت پر کیرتن کرنے سے انکار نہیں کر دیں گے

محلّے کی ایک تعلیم یافتہ خاتون مسز وملا نے اپنی تقریر میں دھمکی دی ہے کہ اگر محلّے کے بچوں میں گندی گالیاں دینے کی قبیح عادت ختم نہ کی گئی تو میں محلہ چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ حضرات مجھے یقین ہے کہ وہ محلہ نہیں چھوڑیں گی۔ کیونکہ ان میں لیڈرانہ صفات پائی جاتی ہیں اور وہ محلہ کی عورتوں کی لیڈر بننا چاہتی ہیں اگر محلہ کے تمام بچے آج فیصلہ کر لیں کہ وہ گندی گالیاں نہیں دیں گے تو مسز وملا کے لئے یہ انتہائی رنجیدہ فیصلہ ہو گا۔ کوئی لیڈر یہ نہیں چاہتا کہ گندی اور بری چیزیں ختم ہو جائیں۔ ہماری کمزوریاں، گندگیاں اور برائیاں ہی مسز وملا کا من بھاتا کھاجا ہیں۔ ان کا خاتمہ مسز وملا کا خاتمہ ہو گا۔ ایک تیر انداز سے اگر یہ کہا جائے کہ تم بغیر نشانہ کے تیر چلاؤ تو اسے اپنے آرٹ کی توہین سمجھے گا۔ اسے آپ پر غصہ آئے گا۔ اور ممکن ہے، غصہ میں محلہ چھوڑ کر چلا جائے۔ اگر مسز وملا ابھی تک محلہ چھوڑ کر نہیں گئیں تو صرف اس لئے کیونکہ یہاں کے بچے برابر گندی گالیاں دیے جا رہے ہیں اور مسز وملا ان کی ماؤں کو برابر پھوہڑ، بدتمیز اور بدنصیب کہے جا رہی ہیں۔ جناب عالی — ایک تعلیم یافتہ عورت کے ذریعے غیر تعلیم یافتہ عورتوں میں احساس کمتری جاگ اٹھا ہے اور جب لوگوں میں احساس کمتری پیدا ہو جائے تو وہاں ایک نہ ایک لیڈر ضرور پیدا ہوتا ہے جو اس احساس کمتری کی ستار پر اپنا نغمہ الاپتا ہے۔

اس لئے حضرات! مسز وملا کی دھمکی کو بھی ایک قسم کا نغمہ سمجھئے۔ خدا نہ کرے کہ ہمارے محلّے کی عورتیں پھوہڑ اور بدتمیز نہ رہیں اور یہ نغمہ بند ہو جائے جسے سن سن کر ہمارے محلّے کی عورتیں مست ہو رہی ہیں — یہ صحیح ہے کہ گندی گالی تہذیب کے زوال کی علامت ہے۔ اور مسز وملا نہیں چاہتیں کہ اس کے اپنے بچے بھی گندی گالیاں

سیکھ جائیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسز دیلا یہ کبھی نہیں چاہتی تھیں کہ ایسے قیمتی محلے کو جہاں بد تہذیبی زوروں پر ہے۔ چھوڑ کر چلی جائیں۔ دراصل مسز دملا اس محلہ کی عورتوں اور بچوں میں تہذیب کی داغ بیل ڈالنا چاہتی ہیں۔ چاہے اس کے لئے انھیں کتنی قربانی دینی پڑے۔ چاہے اس کے اپنے بچے گندی گالیاں سیکھ جائیں۔ جناب! لیڈروں میں قربانی کا زبردست جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس لئے مسز دملا کو قربانی کا موقع دیجئے۔ ورنہ ان کی افسردگی اور بڑھ جائے گی اور آنکھوں کے سیاہ حلقے اور گہرے ہو جائیں گے جو محلہ کی بدتمیزی پر کڑھتے رہنے کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔

بھائیو اور بہنو! —— اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے میں آخری گذارش کروں گا کہ اس محلے کے سدھار کے غم کو اتنا گہرا مت بنائیے۔ بلاشبہ آپ اس میں چند سطحی تبدیلیاں لے آئیے۔ مگر کوئی بنیادی تبدیلی لانے کی مصنوعی کوشش نہ کیجئے۔ بیشک آپ چوہوں کو محلہ بدر کرنے کے لئے بلیاں پالنے کا پلان بنائیے ان کے ساتھ کچھ کتے بھی لے آیئے گا تاکہ بلیوں کی زندگی "ڈل" نہ ہو جائے۔ محلے کی صفائی ستھرائی کے لئے کوئی مشترکہ فنڈ قائم کر لیجئے۔ (فنڈ اتنا کم نہ ہو کہ اس میں غبن کی گنجائش نہ رہے) چوروں کو ڈرانے کے لئے ایک باتنخواہ پہرے دار بھی رکھئے (پہرے دار سوفی صدی حقہ کش اور احمق ہو تاکہ چوروں سے نہ مل جائے) محلہ میں کسی کا انتقال ہو جائے کسی کا جنم ہو جائے کسی کی شادی ہو جائے یا کسی کا لڑکا لڑکی بھاگ جائے تو بیشک سب مل کر آنسو بہائیے یا قہقہے لگائیے (اور یہ سب کچھ اس لئے کیجئے کہ آپ سب کے ساتھ بھی یہ سانحہ ہو سکتا ہے)۔

غرض یہ سب کچھ کیجئے۔ جس کا آپ کے دل سے کوئی گہرا تعلق نہ ہو۔ جناب! میں یہ تھوڑی سی کڑوی بات اس لئے کہہ رہا ہوں کیونکہ ہم اس سے زائد کچھ کر بھی نہیں سکتے ورنہ ہم میں سے کوئی فرد محلہ سدھار کمیٹی کو یہ اجازت دے گا کہ اس کے دل

اور روح کی سلطنت پر حملہ کر دے ۔ کیا آپ محلہ سدھار کمیٹی کو یہ اجازت دیں گے کہ وہ آپ کو انڈا کھانے کا حکم دے جبکہ آپ ٹماٹر کاٹ کر کھا رہے ہوں ۔ ایک بار میں نے محلے کے ایک شخص سے کہا ۔ " جناب ! آپ کے چہرے پر جو ڈاڑھی ہے وہ انتہائی بدنما لگتی ہے ۔ آپ روزانہ شیو کیا کیجئے ۔ " تو وہ مجھ سے اتنا ناراض ہوا کہ میں اب اس سے ڈر کے مارے وہ دس روپے بھی نہیں مانگتا جو اس نے مجھ سے قرض لئے تھے ۔ اسی طرح ایک بار محلہ کے ایک معزز آدمی نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ آپ پان مت کھایا کیجئے ۔ اس سے آپ کے دانت جھڑ جائیں گے ۔ میں حیران ہوا کہ میرے دانت جھڑنے سے اس آدمی کو کیا دلچسپی ہے ؟ ۔ کیا صرف اس لئے میں اس کی بات مان لوں کہ میں کبھی کبھار اس سے اخبار پڑھنے کے لئے مانگ لاتا ہوں ؟

اس لئے جناب ! ہم ایک محلے میں رہنے کے باوجود الگ الگ انسان ہیں محلہ سدھار کمیٹی اگر ہم الگ الگ انسانوں کو ایک لاٹھی سے ہانکنا چاہتی ہے تو یہ اس کی سنگدلی ہے بلکہ ایک غیر فطری حرکت ہے ۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ نے مجھے خصوصی مہمان کی عزت دے کر غیر فطری باتیں کہنے پر پابند کر دیا ۔ آپ کے ماتھے پر اس وقت جو شکن پڑ رہے ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں نے اس پابندی کو کیوں توڑ دیا ہے اور اس کرسی کے ٹوٹنے والے پائے کا ذکر کیوں کر دیا جو شاید لالہ کاشی رام کے گھر سے لائی گئی ہے اور جو آج کل بلیک کے جرم میں جیل میں بند ہیں ۔

لیڈروں کی محفل میں

معزز رہنمایانِ قوم!

آپ نے مجھے اپنی محفل میں مدعو کر کے جس عظیم روایت کو توڑا ہے، اس کے لئے میں ممنون بھی ہوں اور حیرت زدہ بھی۔ روایت یہ ہے کہ لیڈر بولتا ہے اور عوام سنتے ہیں۔ لیکن آج عوام بولے گا اور لیڈر سنیں گے۔ یعنی آج ہم دونوں غلط نشستوں پر بیٹھے ہیں۔ روایت سے اس بغاوت کے کارن میری پوزیشن مضحکہ خیز ہوئی ہے یا آپ کی، میں نہیں جانتا۔ لیکن ایک بات صاف ہے کہ آپ کے سامنے تقریر کرتا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی الھڑ لڑکی، بڑی بوڑھیوں کو نصیحت کرنے بیٹھ جائے کہ دھوپ میں بال سفید کرنے کے کیا گر ہیں۔

حضرت! یہ آخری فقرہ میں بڑی محنت سے تیار کر کے لایا تھا تاکہ آپ بے قابو ہو کر اس پر تالی بجائیں۔ لیکن آپ تو گم سم بیٹھے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ایک اچھے سامع اور نالائق سامع میں کتنا فرق ہوتا ہے اور تاریخ میں جتنے لیڈر ذلیل و خوار ہوئے ہیں، صرف نالائق سامع کی وجہ سے ہوئے ہیں۔

لیڈر صاحبان! اس محفل کے معزز میزبان نے جسے اپنی لیڈری کے عروج میں پھانسی کی سزا ہوئی تھی، مگر ایک ٹکنیکل وجہ سے (کہ سزا کے حکم میں ان کے والد صاحب کا نام غلط لکھا گیا تھا) پھانسی نہیں مل سکی تھی۔ وہ آج کل مکھن

اور کریم کی ایک بہت بڑی فیکٹری چلاتے ہیں ۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا ہے ۔ کہ میں لیڈر اور سیاست کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں مگر یہ مشورہ ناقابلِ عمل ہے کیونکہ نہ تو میں بہادر ہوں کہ سچ بول سکوں اور نہ سیاست داں ہوں کہ جھوٹ بول سکوں اور ایک اچھی تقریر کے لئے یہ دونوں گن لازمی ہیں ۔

لہٰذا اس پیچیدہ صورتِ حال سے بچنے کے لئے میں آپ کو اپنے پڑوسی ننھا سنگھ کی بات سناتا ہوں ۔ ننھا سنگھ بڑھئی ہے ۔ وہ نہایت نفیس اور خوبصورت کرسیاں بناتا ہے ۔ لکڑی بھی "جینوئن" استعمال کرتا ہے اور یہ اس کی خاندانی روایت ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ شیر کے متعلق اس کی معلومات نہایت محدود ہیں ۔ بالکل ایسے ہی جیسے سیاست کے متعلق میری معلومات ناقص ہیں ۔ یعنی یہ ضروری نہیں کہ جو آدمی "جینوئن" کرسی بنا لیتا ہو وہ شیر کے شکار کو بھی جایا کرے ۔ ایک بار کچھ لیڈروں نے میرے "جینوئن" خیالات کی بنا پر مجھے سیاست میں گھیر کے سازش کی تھی ۔ بلکہ ایک سیاسی پارٹی کا لیڈر تک بنا دینے پر تل گئی تھی ۔ لیکن کچھ مدت بعد مجھے دیانت داری سے خیال ہونے لگا کہ جینوئن خیالات سب سے بڑی حماقت ہیں یہ کتنا صحیح مگر کتنا کرب انگیز خیال ہے ۔ کہ آپ ایک جینوئن کرسی بنا سکتے ہیں مگر بنانا نہیں چاہتے ۔ یا بنانا چاہتے ہیں مگر بنا نہیں سکتے ۔

رہنمایانِ ملت ! میرے محلے اور میرے شہر میں ان گنت ننھا سنگھ رہتے ہیں جنھیں اپنی اس کم نصیبی پر ناز ہے کہ وہ شیر کا شکار کرنا نہیں جانتے ۔ صرف کبھی کبھار بال بچوں کو چڑیا گھر لے جاتے ہیں ۔ اور شیر کو دیکھ آتے ہیں ! بالکل ایسے جیسے وہ کبھی کبھار آپ کی تقریر سننے آجاتے ہیں ۔ جنابِ والا ! جب تک دنیا میں ننھا سنگھ بڑھئی موجود ہے ۔ شیر اور لیڈر کی عظمت کا خوف بھی موجود رہے گا ۔ ننھا سنگھ کی کم نصیبی اور جینوئن کرسی بنانے کی حماقت جب تک زندہ ہے اس وقت تک شیر کی طرح چڑیا گھر کے پنجرے میں بند رہے گی اور آپ کی لیڈری محفوظ رہے گی (تالیاں بجانے کا ایک اور نادر موقع)

صاحبان! میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے ماتھے پر کچھ بل آگئے ہیں۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ لیڈر جینئس بھی ہوتا ہے آپ تعجب کریں گے۔ کہ میں بھی اسے تسلیم کرتا ہوں۔ کیونکہ حضرات! جینئس ہونا ــــ ایک لچکیلی چیز ہوتی ہے۔ پگھل جانے والی مائع حقیقت مثلاً ہٹلر اور سٹالن دونوں اپنے اپنے نقطہ نگاہ سے جینئس تھے۔ لیکن دونوں میں بعد المشرقین بھی تھا۔ بظاہر یہ بات بڑی احمقانہ لگتی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ جینئس لس بعد المشرقین اور قریب الطرفین دونوں سانچوں میں بڑی آسانی سے ڈھل جاتی ہے۔

مگر قومی رہنما ڈ ننھا سنگھ بڑھئی کے لئے یہ بات بڑی پریشان کن ہے کہ وہ کیسے جینئس مانے۔ کیونکہ وہ سیدھا سادا آدمی ہے۔ اسے جب بتایا جاتا ہے کہ اب ہٹلر جینئس نہیں رہا اور اب سٹالن بھی جینئس نہیں رہا۔ تو وہ اداس ہو جاتا ہے۔ اور کئی کئی دن تک اپنی پیاری بیوی کا بوسہ تک نہیں لے سکتا۔ جناب عالی کہیں ایسا تو نہیں کہ دنیا میں طلاق کے جتنے واقعات ہوئے ہیں۔ وہ آپ کی وجہ سے ہوئے ہیں۔ اور دنیا میں جو بڑی بڑی قومیں اور تہذیبیں فنا ہو گئیں وہ آپ کے جینئس ہونے کی وجہ سے فنا ہوئیں، خدا کے لئے حضرات! ننھا سنگھ کی پریشانی دور کیجئے اور اس کے لئے جینئس لس کو پرکھنے کا کوئی پیمانہ دریافت کر ڈالئے۔

کبھی کبھی مجھے شک ہوتا ہے کہ آپ جینئس نہیں ہیں۔ یعنی اس طرح آپ کا اور بڑھئی کا علم ایک ہی سطح پر آ جاتا ہے۔ کیا آپ میں ایسے لیڈر موجود نہیں ہیں جو جینئس کرسیاں بناتے بناتے لیڈر بن گئے اور کئی اپنی جینئس لس کا شکار ہو کر چڑیا گھر کے پنجرے میں قید کر ڈالے گئے۔ اور اس بے بس شیر کو دیکھنے کے لئے کئی لوگ آنے لگے۔ حضرات! کیا یہ جینئس لس ہے کہ چڑیا گھر کے منتظم، پنجرے میں بند شیر کو دکھانے کے لئے دس دس پیسے ٹکٹ لگا دیں اور اس واقعے کو تاریخ کی کتابوں میں شامل کر کے اسکولوں میں پڑھایا جائے۔

ملک و ملت کے پروانو!

کہتے ہیں لیڈر پیدائشی ہوتا ہے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ میں نے ایک ڈپٹی کمشنر دیکھا جو سادھو بن گیا۔ مجھے شک ہوا کہ ڈپٹی کمشنر دراصل پیدائشی سادھو تھا۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے کئی پیدائشی ڈرائیور دیکھے، پیدائشی پہلوان، پیدائشی مہاجن۔ اس لئے مجھے یقین ہو گیا کہ دنیا کی ہر چیز پیدائشی ہوتی ہے۔ لہٰذا لیڈر بھی ضرور پیدائشی ہوتا ہوگا۔ یعنی اس کا پیدائشی ہونا کوئی سماجی حادثہ نہیں ہے چند دن ہوئے میں نے اخبار میں ایک مضمون پڑھا جو ایک لیڈر کے متعلق تھا کہ وہ بچپن میں اپنی چھوٹی بہن کو خوب پیٹا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ مضمون میں اس چھوٹی بہن کا ذاتی بیان بھی درج کر دیا گیا تھا۔ افسوس کہ میں یہ مضمون پڑھ کر متاثر نہیں ہو سکا، کیونکہ میرا خیال ہے کہ ننانوے فی صدی لڑکے چاہے بڑے ہو کر کلرک کیوں نہ بن جائیں اپنی چھوٹی بہنوں کو ضرور پیٹا کرتے ہیں۔

اس لئے حضرات! آپ یقین کیجئے کہ آپ پیدائشی لیڈر ہیں۔ اور اگر آپ میں سے کوئی اب بسکٹ فیکٹری کا بیکر بننا چاہے تو نہیں بن سکتا۔ کیونکہ قدرت نے بیکریوں کے لئے کچھ اور انسان ارسال کر رکھے ہیں۔ اس لئے اگر آپ بیکر کی جائے لیڈر بن گئے ہیں تو صرف اس لئے کہ بیکری کی صنعت کو بربادی سے بچانا مقصود تھا

جناب والا! آپ فطرت کی اوٹ پٹانگ طاقتوں کا شکار ہیں۔ میں ایک لیڈر شری بے ہنگم چند جی کو جانتا ہوں۔ جو ہندوستانی قوم کا لیڈر ہے۔ اگر وہ فلسطین میں پیدا ہوتا تو ہماری قوم فلسطینی قوم کے لیڈر کو اپنا مائیہ ناز سپوت کیسے مانتی جو ہندوستان کی بجائے فلسطین میں پیدا ہوا۔ دراصل حضرات! آپ سب بے ہنگم چند ہیں۔ اور معاف کیجئے آپ کی مٹی ہی پلید ہے کہ آپ کبھی ہندوستان کے لیڈر بنا دئے جاتے ہیں۔ کبھی سپین کے کبھی اٹلی کے اور کبھی فرانس کے، ہر جگہ آپ کا نام بدل جاتا ہے، کام وہی رہتا ہے۔ یعنی اپنی قوم کو اٹھاتا اور دوسری قوم کو گراتا۔ میرا عقیدہ ہے۔ کہ اس دنیا پر صرف دو درجن، دو درجن بے ہنگم چند مسلط ہیں جو ایک دوسرے کو گرانے میں مصروف

رہتے ہیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ جرمنی کا بے ہنگم چند فرانس کے بے ہنگم چند کے ساتھ ایک میز پر ڈنر کھاتے دیکھا گیا۔ ڈنر کے بعد دونوں نے مل کر فوٹو کھنچایا، مل کر ایک ناچ دیکھا۔ ملکر تقریریں کیں۔ دونوں ملکوں کے قومی ترانے بجائے گئے۔ دونوں قوموں نے باچھیں کھولیں ہپ ہپ ہرے کہا اور پھر باچھوں اور ہپ ہپ ہروں کی ایک فلم تیار کی گئی جو کئی مہینے چلتی رہی۔

لیکن چند سال بعد دنیا نے دیکھا کہ دونوں بے ہنگم لیڈروں نے ایک دوسرے کو وارننگ دیدی، حملہ کر دیا۔ دونوں قومیں ایک دوسرے کا خون ٹیسٹ کرنے لگیں حملے کی بنیاد یہ بنائی گئی کہ جرمنی کے بے ہنگم چند کی بیوی کو فرانس کے ایک دکاندار نے جرابیں بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔ جس پر جرمن قوم کی سوئی ہوئی خودداری پیدا ہو گئی اور وہ غیرت قومی کی خاطر اس غیرت قومی کی خاطر جو جرابوں کی وجہ سے نشوونما پا کر جوان ہو رہی تھی، جرمنی کا بے ہنگم چند حملہ نہ کرتا۔ تو اس قوم کی بے ہنگم چند کی جرابیں اتار کر تار تار کر دیتی اور خود اسے ٹھوکریں مار مار کر ہلاک کر دیتی۔

لیڈر دوستو! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ میں سے ہر ایک کا انجام خنجر سے ہلاک ہونا ہے یا خودکشی ہے۔ جو قوم آپ کی لاش کو تزک و احتشام سے اٹھاتی ہے وہی قوم آپ کو اٹھا کر سمندر میں بھی پھینک دیا کرتی ہے — آپ میں سے کتنے افراد ہیں جو سمندر میں پھینکے جانے کے لئے تیار ہیں۔ یہ میں صرف اس لئے پوچھ رہا ہوں تاکہ میں آپ کی انفرادی آزادی کی حدود معلوم کر سکوں۔

انفرادی آزادی؟ — آہ حضرات۔ وہ آزادی جو آپ دوسروں کو دلانا چاہتے ہیں۔ خود اس سے محروم ہیں۔ مثلاً آپ دہلی کے چاندنی چوک میں کھڑے ہو کر گول گپے نہیں کھا سکتے۔ دنیا آپ کو کھاتے دیکھ کر منہ میں انگلیاں دبائے گی وہ آپ کے اردگرد اکٹھی ہو جائے گی اور کہے گی۔

"بے ہنگم چند جی زندہ باد!"

"انقلاب زندہ باد"
بھارت ماتا کی جے،،

اور پھر فوٹو گرافر کلک کلک کرتے آگے بڑھیں گے۔ اور گول گپے کے ساتھ آپ کا فوٹو کھینچ لیں گے۔ اور ممکن ہے، اقوم آپ سے تقریر کا مطالبہ بھی کرے۔ اور آپ گول گپوں کی نیشنل انڈسٹری کے مستقبل پر لکچر دے ڈالیں۔

پیارے لیڈر صاحبان! آپ آزادی سے ایک گول گپا بھی نہیں کھا سکتے۔ حالانکہ گول گپا کھانا ایک عام سا معمولی فعل ہے۔ بالکل ایسا فعل جیسے درزی سے کوٹ سلانا پبلک پارک میں بیٹھ کر مونگ پھلی کھانا۔ پنواڑی سے پان خریدنا۔ مگر آہ آپ ان میں سے ایک معمولی کام بھی آزادی سے نہیں کر سکتے۔

مجھے ہمیشہ یہ تشویش رہی ہے کہ لیڈروں نے اپنی انفرادی آزادی سے محروم ہونا کیوں پسند کر لیا۔ ممکن ہے، یہ بات آپ کے لئے تسکین دہ ہو کہ انفرادی آزادی کی قربانی رائگاں نہیں جاتی (جیسا کہ ہر قربانی کی خصلت ہے) اور اس قربانی کے عوض قوم آپ کو بہت کچھ دیتی ہے۔ مثلاً اگر آپ کو زکام ہو جائے تو روزانہ آپ کی صحت کے بلیٹن شائع کرتی ہے۔ آپ کی موٹر کے راستے میں جھنڈیاں لگاتی ہے۔ تقریر کے وقت آپ کی میز پر پانی کا گلاس رکھ دیتی ہے۔ آپ کے قد آدم فوٹو اپنے گھروں میں لٹکاتی ہے۔ جس سے آرٹسٹوں اور فریم میکروں کا بزنس ترقی کرتا ہے۔

کبھی آپ نے سوچا کہ قوم یہ سب کچھ کیوں کرتی ہے۔ کیوں کہ اس سے ان کا لیڈر اپنے اصول پر ڈٹا رہتا ہے۔ جناب لیڈر صاحبان! کسی دن آپ اپنے اصول کی خاطر پوری قوم کی قوم کو بحر ہند میں غرقاب کر سکتے ہیں۔ قوم ہنسی خوشی غرقاب ہو جائے گی۔ لیکن اگر آپ نے سچ کو رٹ کہہ دیا۔ تو آپ کو گولی مار دے گی۔ جناب عالی! قوم صرف آپ کی مصنوعی اور جھوٹی زندگی کو ہی پسند کرتی ہے۔

مجھے ایک ایسے لیڈر کے متعلق معلوم ہے جس نے مرنے سے چند برس پہلے مصنوعی زندگی ترک کر دی تھی۔ چنانچہ اس کی ارتھی کے ساتھ صرف تین افراد

تھے۔ ایک اس کی بیوہ اور دوار تھی اٹھانے والے اور وہ بھی کرایہ کے مزدور ۔
اور جو تھا ذی روح اس کا گھر یلو کتا تھا۔ جو صرف اپنی حیرت دور کرنے کے لئے ساتھ ہو لیا تھا۔ اس لئے لیڈر حضرات! آپ اس "حادثہ" سے فائدہ اٹھائیے اور آخری سانس تک اپنے اصول سے نہ ہٹئیے۔ تاکہ کم از کم ارتھی تو جاہ و جلال کے ساتھ اٹھے آپ کی موت اور جاہ و جلال کی موت ایک ساتھ نہیں ہونی چاہیئے۔ ورنہ جناب ارتھی اٹھانے کے لئے کرائے کے مزدور تو ہر ایک کو مل جاتے ہیں۔

اور رہنمایان قوم! آخر میں ایک بات کہہ کر اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ کہ آپ اپنی پہچان کے لئے کوئی نہ کوئی سمبل ضرور بنا لیجئے۔ سمبل کوئی سا بھی ہو آپ سے وابستہ ہو کر وہ قومی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ مثلاً کیوں نہ آپ ہمیشہ اپنے ہاتھ میں ایک طوطا رکھیں۔ کہ جب بھی طوطے کا ذکر کیا جائے۔ لوگ سرحد کا دیں طوطے کی بجائے آپ حقہ رکھ سکتے ہیں۔ بانس کا ڈنڈا رکھ سکتے ہیں۔ کئی لیڈر گھٹے ہوئے سر کو ہی سمبل بنا لیتے ہیں۔ ایک اور لیڈر نے ٹخنوں تک کوٹ پہننا شروع کر دیا تھا۔ تو ٹیلر ماسٹروں کو لمبے کوٹوں کے لاکھوں آرڈر ملنا شروع ہو گئے تھے۔ ایک لیڈر نے سیاہ قمیص کو اپنا سمبل بنا لیا تھا۔ جسے وہ مرتے دم تک نہیں اتار سکا کیونکہ قوم اسے کسی اور رنگ کی قمیص پہننے ہی نہیں دیتی تھی۔

بہرکیف صاحبان! سمبل آپ کی بہتری کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اسے کبھی مت بولئے۔ اپنے اصول کی طرح۔ کیونکہ لیڈر کا اصول بھی ایک قسم کا طوطا ہوتا ہے۔ گھٹا ہوا سر، بانس کا ڈنڈا، سیاہ قمیص، لمبا کوٹ — یہ سب چیزیں اگرچہ مضحکہ خیز لگتی ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ قوموں کے نصیب میں صرف لیڈر ہی نہیں لکھے ان کی مضحکہ خیزیاں بھی لکھی ہیں۔

بیالیسواں جنم دن

پچھلے دنوں احباب نے سازش کر کے میرا جنم دن منا ڈالا۔ اس غیر ضروری تقریب پر مجھے بھی تقریر کرنے کے لئے کہا گیا۔ یہ میری زندگی کی پہلی تقریر تھی جو پسند کی گئی اور اس لئے پسند کی گئی کہ یہ تحریری تقریر تھی۔

تقریر یوں تھی۔

جناب صدر اور باقی ماندہ حضرات! آپ لوگ جو میرا جنم دن منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ بہت عظیم لوگ ہیں۔ یہ بات میں یقین سے کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ جو لوگ عظیم نہیں ہوتے وہ کبھی کسی کا جنم دن نہیں مناتے۔ حتیٰ کہ اپنا بھی نہیں مناتے۔ ایسے لوگوں میں ایک صاحب نفقو دھولی تھے جو پچھلے دنوں راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔ انھوں نے مرتے دم تک اپنا جنم دن نہیں منایا۔ کیونکہ انھیں عمر بھر پتہ ہی نہ چلا کہ وہ جنم لے چکے ہیں۔

ابھی ابھی جو صاحب تقریر کر کے گئے ہیں، آپ ان کی باتوں پر قطعی اعتبار نہ کیجئے۔ وہ میرے گہرے دوست ہیں اور گہرے دوستوں کی یہی ٹریجڈی ہے کہ وہ صرف تعریف و تحسین ہی کر سکتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک گہرے دوست سے میں نے کہہ دیا کہ تمھاری جرابوں سے سخت بدبو آ رہی ہے تو انھوں نے میرے خلاف تھانہ میں رپورٹ لکھوا دی۔ حالانکہ بطور گہرے دوست کے میرا فرض تھا کہ ان کی جرابوں

کی تعریف کرتا۔ صاحب! سچائی اور دوستی میں اتنا بڑا فرق ہے کہ اسے مٹانا بنی آدم کے بس کا روگ نہیں۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ میرا بیالیسواں جنم دن ہے۔ بظاہر بیالیس کا ہندسہ ایک معمولی ہندسہ ہے۔ لیکن یہ ہندسہ مجھے نہایت تشویشناک محسوس ہو رہا ہے کیونکہ اس ہندسہ کا مطلب یہ ہے کہ میں اب بچہ نہیں رہا۔ جوان بھی نہیں رہا اور بڑھاپا ابھی بہت دور ہے۔ عمر کی یہ عجیب منزل ہے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ نہ معصوم نہ الھڑ نہ بزرگ۔ یہ عجیب بے بسی کی عمر ہے۔ مذہبی اصطلاح میں اسے عالم برزخ کہا جاتا ہے۔ جب خدا کسی روح کو نظروں سے گرا دیتا ہے تو اسے بیالیس سال میں پہنچا دیتا ہے۔

ذرا اندازہ فرمایئے کہ اب میں سیڑھیوں پر پاؤں جما جما کر رکھا کروں گا ڈاکٹر مجھ سے کہا کریں گے کہ آلو مت کھایا کرو بھڑکیلی قمیص پہنوں گا مگر شرماتا بھی رہوں گا۔ اور نیم سنجیدہ باتوں کے بارے میں سوچا کروں گا۔ مثلاً یہ کہ میں کیا ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟ کہاں جاؤں گا اور کب جاؤں گا؟ اور جا کر جب لوٹ آؤں گا تو چیونٹی بن کر یا ہاتھی بن کر؟ دراصل صاحبان! آپ چیونٹی بن جائیے یا ہاتھی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ انسان کا سب سے بڑا غم موت ہے اور موت ہم میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا۔ ہم سب کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ چاہے یہ شکل چیونٹی کی ہو یا ہاتھی کی۔ اور چونکہ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اس لئے ہم نے روح ایجاد کر ڈالی ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ روح ایک لافانی چیز ہے۔ کبھی نہیں مرتی۔ اور یہ اتنی لچکیلی ہے کہ ایک چیونٹی کے اندر بھی سما جاتی ہے اور ہاتھی کے اندر بھی۔ صاحب صدر! روح کی ایجاد ہم انسانوں کا ایک لافانی کارنامہ ہے۔ جس پر خود خدا بھی سخت حیران ہو گا!

مجھے خطرہ کہ میرا بیالیسواں جنم دن میرے ماضی کو فنا کے گھاٹ اتار رہا ہے اور اس کی بجائے میرے مستقبل کو جنم دے رہا ہے۔ اب میں ماضی کی قبر پر بیٹھ کر

مستقبل کی مجا وید. میں کیا کروں گا ۔ یہ ایک بڑی بے ہنگم بات ہے کہ میں صرف مستقبل کا ہو کر رہ جاؤں ۔ اپنی روح کا مستقبل ، اپنے بچوں کا مستقبل ، اپنی صحت کا مستقبل ، نوعِ انسان کا مستقبل ، مذہب ، اخلاق اور راستی وغیرہ کا مستقبل صاحبان! سچ سچ بتائیے آپ میرے ساتھ یہ کیا سلوک کرنے والے ہیں ۔ ایک پریشان انسان کو کیوں مجبور کر رہے ہیں کہ وہ صبح چار بجے اٹھ کر سیر کو جایا کرے ۔

پرسوں کی بات ہے لالہ گوپی ناتھ جی ریٹائرڈ ایڈوکیٹ میرے پاس آئے انھوں نے بڑی ذمہ داری کے ساتھ ٹھنڈا سانس بھرا اور کہنے لگے ۔

" فکر صاحب ! میں حیران ہوں کہ خدا جب ایک ہے تو یہ مختلف مذہبوں والے ایک کیوں نہیں ہو جاتے ؟ "

تو حضرات مجھے اسی وقت شبہ ہو گیا تھا کہ لوگ مجھے سنجیدہ سمجھنے لگے ہیں چنانچہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ کس درد و کرب کے ساتھ میں نے ریٹائرڈ ایڈوکیٹ کے سامنے تسلیم کیا کہ " میں آپ کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں ۔ "

ایڈوکیٹ صاحب کے جانے کے بعد میں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ کیا میرے جنم کا مقصد یہ تھا کہ میں خدا کو ایک ثابت کروں ؟ بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کیا واقعی میرے جنم کا کوئی مقصد تھا بھی ؟ غالب شبہ یہ ہے کہ مقصد ضرور ہوگا ۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ مجھے پیدا کیا جاتا !

یہاں پر خیال خواہ مخواہ " کرم فلاسفی " کی طرف چلا جاتا ہے ۔ نہ جانے یہ فیصلہ کیوں کیا گیا کہ مجھے ہندوستان میں جنم لینا چاہیئے ۔ ممکن ہے یہ فیصلہ میرے سابقہ کرموں نے کیا ہو ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے سابقہ کرم کیا تھے ۔ کیونکہ میرا حافظہ اتنا نہیں کہ پچھلے کرموں کو یاد رکھ سکوں ۔ لیکن ایک عام اندازے کے مطابق وہ اچھے کرم ہوں گے کیونکہ سنا ہے کہ اچھے کرموں سے ہی انسانی چولا ملتا ہے ۔ مجھے اپنے گھر کے مرغے پر اکثر ترس آتا ہے کہ بے چارے کو برے کرموں نے مرغا بنا دیا ۔ اگرچہ کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ مرغ مجھ سے بہتر زندگی گزار رہا ہے ۔ کیونکہ جب کسی بے گناہ کو پھانسی

کی سزا ملتی ہے تو میں اداس ہو جاتا ہوں۔ لیکن مرغے پر اس پھانسی کا کوئی اثر نہیں پڑتا وہ بدستور مرغی کے ساتھ رومانٹک ڈائلاگ بولتا رہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قانون مرغے نے نہیں بنائے۔ جو قانون بنائے گا وہی اداس ہو گا۔

میں امید کرتا ہوں کہ مرغا موجودہ جنم میں ضرور اچھے کرم کرے گا۔ تاکہ اگلے جنم میں وہ انسان بنے اور کسی بے گناہ کو پھانسی دے اور پھر اداس ہو جائے۔

میرے پچھلے اچھے کرم کون سے ہوں گے؟ ممکن ہے جناب! میں نے پچھلے جنم میں کسی اندھے کو اپنی ایک آنکھ نکال کر دے دی ہو۔ کسی کی قبر پر جا کر دیا جلایا ہو۔ کسی دوسرے کے فائدے کی خاطر جیل کاٹی ہو۔ لیکن اس بار پوزیشن قطعی مختلف ہے اس جنم میں مجھے عینک لگوانی پڑی کیونکہ بار نقاہت کے باعث بے ہوش بھی ہوا لکھنے کے لئے کوئی نفیس پین تک نہ ملا۔ حالانکہ ایک صاحب جو مشکل سے دستخط کر سکتے ہیں ہمیشہ پارکر پین لگائے رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ان پین والے صاحب نے پچھلے جنم میں اپنی ایک بھی آنکھ کسی کو نہ دی ہو گی اور اندھے کو اندھا رہنے دیا ہو گا۔ اس لئے اسے اس جنم میں پارکر پین مل گیا۔ یہ اس نے دور اندیشی کی بات کی۔ اگر کسی کو انسانی جنم دیا جائے تو ساتھ ہی دور اندیشی بھی دی جائے۔ صرف اچھے کرموں ہی سے پارکر پین نہیں ملتا۔ ممکن ہے میں نے پچھلے جنم میں کسی بدقماش امیر کی تعریف میں کوئی قصیدہ رقم کیا ہو۔ بدقماش کی تعریف کوئی اچھا کرم نہیں ہے۔ لہٰذا حیرت ہوتی ہے کہ جب میرے کرم اچھے نہ تھے تو مجھے انسانی چولا کس بنا پر دیا گیا۔ حضرات! میں شاستروں کی کرم تھیوری کو چیلنج نہیں کر رہا۔ بلکہ صرف تقدیر کے جج کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے موجودہ جنم میں کسی زخمی چڑیا کو پانی نہیں پلایا۔ لہٰذا اگلے جنم میں اس کے بدلے مجھے صرف دستخط کرنا ہی سکھایا جائے اور سابقہ غلطی کو دہرایا نہ جائے۔

میں نے بیالیس سال میں خاصے تجربات کئے ہیں۔ لیکن سب سے مکمل اور سب سے ناگوار تجربہ یہ ہوا کہ انسان کو تنہائی نصیب نہیں۔ پیدا ہوتے ہی اس کی تنہائی چھین لی جاتی ہے۔ اس کی وجہ خدا ہے۔ یہ خدا کی مجبوری ہے یا جانے کیا ہے کہ اس

نے بیک وقت بہت سی چیزیں پیدا کر دی ہیں۔ مثلاً اس نے جھنجھنا پیدا کر دیا۔ جو آپ کے پیدا ہوتے ہی بجنے لگتا ہے۔ آپ جھنجھنے سے الگ ہوئے تو اچانک ایک بلی کی آواز آئی: "میاؤں!" آپ میاؤں سن کر رونے لگتے ہیں تو ایک رومال آگے بڑھ آتا ہے جو آپ کے آنسو پونچھنے لگتا ہے۔ ایک بار مجھے یاد ہے کہ نائی آ موجود ہوا اور بولا۔ "ننھے! بال کتروا لو۔" ایک بار ایک کوا ٹھونگ مار کر مجھے زخمی کر گیا پھر ایک بار میں یتیم ہو گیا تو میری خالہ آ دھمکی اور بولی: "اب تو میرا بیٹا ہے۔ میں تجھے بن ماں کے ایک دن نہیں دیکھ سکتی۔" غرض پورے بیالیس برس میں مجھے ایک پل بھی تنہائی نصیب نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ سوتے وقت جب میں قطعی تنہا ہوتا ہوں تو نیند میں کوئی دیو آ جاتا ہے اور میری گردن مروڑنے لگتا ہے۔ کوئی پری آ جاتی ہے جو مجھے اٹھا کر آسمان کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ ساری صورتِ حالات نہایت ناگوار ہے۔ نہ جانے لوگوں کو یہ کیوں معلوم ہو جاتا ہے کہ میں پیدا ہو چکا ہوں۔ ایک سائنسدان نے مجھے بتایا کہ دراصل یہ ایٹم کی فطرت ہے کہ جونہی ایک ایٹم پیدا ہوا، دوسرا ایٹم اس کا تعاقب کرنے لگتا ہے۔ آپ انسان بن جاتے ہیں تو ننگے نہیں رہ سکتے لہٰذا کپڑا آپ کا تعاقب کرتا ہے۔ کپڑے کا تعاقب درزی کرتا ہے اور درزی کا تعاقب اس کی بیوی کرتی ہے۔ بیوی کا تعاقب اس کے بھوکے ننگے بچے کرتے ہیں۔ غرض ہر ایٹم دوسرے ایٹم کے تعاقب میں ہے۔ صاحبان! میں آپ کو سائنس کا سبق نہیں دے رہا بلکہ صرف اپنے ذاتی ایٹم کا دکھ بیان کر رہا ہوں کہ تنہائی کسی ایٹم کو نہیں ملتی۔ مجھے درزی کا بل دینے پر ہرگز اعتراض نہیں ہے۔ لیکن وہ درزی مجھے شعر بھی سناتا ہے جو نا شائستہ حرکت ہے۔ اگر درزی کے بچے کے پاس نیکر نہیں ہے تو یہ ٹیکسٹائل ملوں کا فرض ہے کہ اسے نیکر مہیا کریں۔ آخر یہ نیکر بچے مجھے کیوں مجبور کرتے ہیں کہ ہمارے تن کی عریانی پر مضمون لکھو۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں اگر ایک ایٹم دوسرے ایٹم سے جدا ہو جائے تو کیا ہو ہر ایٹم اپنی الگ زندگی گزارنے لگے۔ جیسے قبر میں ہر مردہ الگ پڑا رہتا ہے

بے تیکر نیچے کی الگ قبر ہو۔ میری مضمون نگاری کی الگ قبر ہو۔ اور ایک قبر دوسری قبر سے واسطہ نہ رکھے تو؟ مگر آہ ایسا کبھی ہوتا نہیں اور تنہائی کبھی ملتی نہیں۔ میں نے کئی بار ہمالیہ پربت پر جا کر تپسوی بننے کا بھی ارادہ کیا لیکن شک ہے کہ وہاں خدا موجود ہو گا۔ اور تنہائی وہاں بھی نصیب نہیں ہو گی۔

اور زندگی میں دوسرا تلخ تجربہ مجھے یہ ہوا کہ موت آسان نہیں۔ حالانکہ بیالیس سال کے فوراً بعد موت کو آجانا چاہیئے۔

یہ ایک بے ڈھنگی بات ہے کہ ہر انسان کی موت کا وقت مقرر ہے منطقی اعتبار سے یہ غلط سسٹم ہے۔ مثلاً ماہرین عمر کی رائے ہے کہ بچاسی برس سے پہلے مجھے موت نہیں آئے گی۔ میری ماں دعا مانگا کرتی تھی کہ تم سو سال تک جیو۔ ایک صاحب پچھلے دس برسوں سے مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ اگر تم سگریٹ اور پان کا استعمال ترک کر دو تو تمھاری عمر لمبی ہو سکتی ہے مجھے یہ سب کچھ ایک بے لطف لالچ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بیالیس برس زندہ رہ کر میں نے جو کچھ دیکھ لیا ہے وہ کافی ہے اب مزید بیالیس سال زندہ رہنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ کیونکہ اگر میں زندہ رہا تو آئندہ بھی وہی دیکھوں گا۔ جو دیکھ چکا ہوں۔ اگر کوئی آدمی مجھ سے وعدہ کرے کہ وہ باقی عمر میں مجھے ایک ایسا مرغا دکھائے گا جو بانگ نہ دیتا ہو تو میں مزید بیالیس سال زندہ رہنے کے لئے تیار ہوں ورنہ لمبی عمر اس دو فٹ لمبے سگریٹ کی طرح ہے جسے پیتے پیتے جبڑے تھک جاتے ہیں۔ دراصل لمبی عمر کی خواہش نے انسان کو بری طرح بھٹکا دیا ہے اور وہ غیر فطری حرکتیں کرتے کرتے زندگی کی خالص لذت سے محروم ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک صاحب لمبی عمر پانے کے لئے ہر روز صبح اڑھائی گھنٹے سیر کرتے ہیں۔ یعنی عمر کا خاصا حصہ سیر میں ضائع کئے جا رہے ہیں اور ایک اور صاحب عمر بھر پیدل چلتے رہے حالانکہ اگر وہ گھوڑے موٹر یا ریل پر سوار ہوا کرتے تو زیادہ لذت اٹھاتے۔ ایک بڑے بوڑھے سے ملاقات ہوئی۔ فخر سے کہنے لگے۔ میں اب بھی دانتوں سے کاٹھا بادام توڑ سکتا ہوں۔ یعنی وہ صرف بادام کھانے کے لئے سو سال تک زندہ رہنا چاہتے ہیں

حالانکہ بادام اگر پتھر سے توڑے جائیں تو بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ ایک اور عجائب ہیں وہ خدمت خلق کے لئے زیادہ دیر تک زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اگر چار پانچ سال خدمتِ خلق کر لی جائے تو اس میں زیادہ لذت ہے تاکہ اس کے بعد کسی اور آدمی کو خدمتِ خلق کا موقع دیا جائے۔

میرا خیال ہے یہ سب زندہ رہنے کی چالبازیاں ہیں اور انھیں چالبازیوں کا نتیجہ ہے کہ موت آسان نہیں رہی۔ لوگ یا تو مرتے ہی نہیں آتے یا جب مرنے پر آتے ہیں تو آٹھ سال کا معصوم بچہ بھی مر جاتا ہے جسے اتنا بھی علم نہیں ہوتا کہ حسینہ کے ہونٹوں میں کشش کیوں ہوتی ہے اور لیلیٰ مجنوں کی ٹریجڈی کیوں وجود میں آئی تھی۔

اسی لئے حضرات! میری غرض یہ ہے کہ حسینہ کے لبوں کا اندازہ لگانے کے بعد انسان کو مر جانا چاہیئے، لیکن اس بچہ کو نہیں مرنا چاہیئے۔ جو ابھی اپنا نام لکھنے کی لذت سے بھی آگاہ نہیں۔ اس کے علاوہ عمر کو لمبا کرنے کے جتنے طریقے ہیں انھیں بند کر دینا چاہیئے تاکہ زندگی بھی آسان ہو جائے اور موت بھی حادثہ نہ رہے۔ لیکن جب مجھے خیال آتا ہے کہ مجھے مزید تینتالیس برس زندہ رہنا ہے تو جی چاہتا ہے قطب مینار پر جا کر جمپلانگ لگا دوں۔ لیکن اب تو وہاں بھی لوہے کا جنگلا لگا دیا ہے لہٰذا میرا مرنا مشکل ہے، کیونکہ سنا ہے جس کو راکھے سائیاں، مار سکے نہ کوئے۔

جناب صدر اور حاضرین! اب میں اپنی تقریر ختم کرنے لگا ہوں۔ کیونکہ جتنی باتیں میری پاس تھیں وہ سب ختم ہو چکیں۔ یہ باتیں بیالیس سال کی زندگی کا نچوڑ ہیں۔ آپ شاید چاہیں گے کہ میں کچھ اور فروعی باتیں بھی کروں جن سے دنیا کو فائدہ ہو ____________ لیکن میرا خیال ہے کہ پچھلی کئی نسلوں سے فروعی باتیں کہی جا رہی ہیں۔ لیکن دنیا کو ان سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ چونکہ رفاہ عام کی عادت ہم ادیبوں میں عام ہے۔ اس لئے آخر میں چند چیزوں کے بارے میں ضرور عرض کروں گا کہ میرا کیا ردعمل ہے۔

مثال کے طور پر میں نے ان بیالیس برسوں میں محسوس کیا ہے کہ کوّے کائیں کائیں کرتے ہیں۔ گدھے اتنے بیوقوف نہیں ہوتے جتنے سمجھے جاتے ہیں۔ اداسی کسی کے باپ کی میراث نہیں۔ پتنگے روشنی پر مرتے ہیں۔ لیکن انسان کی جان کھا جاتے ہیں۔ گیدڑ کو معلوم ہے کہ شہر میں اس کے کھانے اور رہنے کا کوئی بندوبست نہیں۔ اور گائے اگر شہر کا بائیکاٹ کر کے جنگلوں میں سکونت اختیار کرلے تو وہ بھی اتنی ہی خوفناک ہو سکتی ہے جتنا شیر اور بھیڑیا۔

صاحبان! ان بیالیس برسوں میں مجھے صرف ایک بات کی سمجھ نہیں آئی بعض جانور انسان کے اتنے قریب کیوں آگئے ہیں۔ اور بعض جانور انسان سے اتنی دور کیوں چلے گئے ہیں۔ کیا ان میں اب بھی مفاہمت کی کوئی صورت نکل سکتی ہے یا دائمی ہجر ہے؟

کچھ اپنی کچھ پرائی

اپنے پہ کر رہا ہوں گماں اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

گم شدہ کی تلاش

یہ اشتہار میں اپنے گم شدہ بھائی چنتامنی کے متعلق دے رہا ہوں۔ موصوف ایک مرتبہ پہلے بھی گم ہو گئے تھے، لیکن اس وقت میں نے اشتہار نہیں دیا تھا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ موصوف خوددار آدمی ہے۔ اس لئے اس نے ضرور کسی کنویں میں چھلانگ لگا دی ہو گی۔ لیکن چھٹے دن وہ میلی جیکٹ پتلون کے ساتھ گھر لوٹ آیا۔ اور بقول ہمارے چچا کے "آخر تو ہمارا ہی خون تھا کیوں نہ لوٹتا خون نے جوش مارا ہو گا۔"

ہمیشہ اجلی پتلون پہننے والا کب تک گھر سے باہر رہ سکتا تھا۔ خودی چاہے کتنی ہی بلند ہو جائے پتلون کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

مگر اس بار مجھے یقین ہے کہ موصوف لوٹ کر نہیں آئے گا۔ کیونکہ وہ گھر سے دو سو روپے اٹھا کر لے گیا ہے۔ اس لئے اب اس کی رگوں میں ہمارا خون جوش نہیں مارے گا۔ اشتہار دینے کی ایک اور وجہ والدہ محترمہ ہیں، جو موصوف کو "ایک نادان لڑکا" گردان رہی ہیں۔ میں نے لاکھ کہا کہ مادر مہربان! چنتامنی اب بیس برس کا ہو چکا ہے نادان نہیں رہا۔ وہ چہرے مہرے سے ہی گدھا دکھائی دیتا ہے مگر اندر سے کافی کائیاں ہو چکا ہے۔

مگر والدہ محترمہ جس نے اس گدھے کو جنم دیا اپنی تخلیق پر زیادہ مستند رائے رکھتی ہیں۔ اس نے مجھے طعنہ دیا۔

" دراصل تم چھوٹے بھائی کی غیر حاضری میں ساری آبائی جائداد کو تنہا ہڑپ کرنا چاہتے ہو۔"

ہماری آبائی جائداد دو کمروں والا ایک مکان ہے جو ہم نے کرائے پر لے رکھا ہے یا پھر والد محترم کے قبضہ میں ایک بہی کھاتا ہے جس میں درج ہے کہ ہمارے خاندان کے پاس ڈیڑھ سو ایکڑ زمین ہے جس پر آج کل ایک دریا بہہ رہا ہے۔ والد محترم گزشتہ گیارہ برس سے اس دریا کے سوکھنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

اگرچہ والدہ محترمہ کے طعنہ کی بنیادیں دریا برد ہو چکی ہیں لیکن پھر بھی ایک فرمانبردار فرزند کے طور پر میں یہ اشتہار دینے پر مجبور ہوا ہوں۔

برادر عزیز چنتامنی کی تصویر مجھے نہیں مل سکی ورنہ اس اشتہار کے ساتھ ضرور چھپواتا۔ دراصل اس کے جتنے فوٹو تھے وہ اس نے اپنی وقتاً فوقتاً کی محبوباؤں میں بانٹ دیئے تھے پوچھنے پر چنتامنی کی ہر محبوبہ نے جواب دیا کہ اس کے پاس چنتامنی کی فوٹو تھی، وہ اس نے رسوائی کے خوف سے ضائع کر دی ہے۔ ایک محبوبہ تو اتنی صاف گو نکلی کہ اس نے تنک کر جواب دیا۔

" میں نے شادی ہوتے ہی چنتامنی کی وہ فوٹو لوٹا دی تھی اور آج کل ہٹوے میں اپنے خاوند کا فوٹو رکھتی ہوں۔"

چنانچہ فوٹو دستیاب نہ ہونے کے باعث مجبوراً میں اپنا ہی فوٹو اس اشتہار کے ساتھ شائع کر رہا ہوں (اس کے باوجود گم شدہ میرے بھائی کو سمجھا جائے مجھے نہیں)۔

والد اور والدہ محترمہ دونوں کی متفقہ رائے ہے کہ چنتامنی کی ناک تم سے ملتی ہے۔ اس لئے پہچاننے میں آسانی رہے گی۔ ہمارے نانا مرحوم کی ناک بھی تم دونوں سے ملتی تھی اور وہ بھی گھر سے بھاگ گئے تھے (عجیب ناک ہے نانا کے وقت سے گشت رہی ہے)، بہرکیف فوٹو میں میری ناک حاضر ہے۔ ناک کے علاوہ میرے جتنے اعضا ہیں وہ میرے ذاتی ہیں۔ برادر عزیز چنتامنی کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

برادر موصوف چنتامنی کے باقی ناک نقشہ کے متعلق پوزیشن یہ ہے کہ اس کا رنگ بچپن میں دودھ کی طرح گورا تھا (ان دنوں وہ صرف ماں کا دودھ پیا کرتا تھا) لڑکپن میں وہ دودھیا رنگ گندمی ہوتا گیا۔ کیونکہ اس نے گندم کھانا شروع کر دی تھی۔ جوان ہوتے ہی رنگ کا میلان سیاہی کی طرف ہو گیا۔ نہ جانے جوانی میں چوری چھپے اس نے کیا کھانا شروع کر دیا تھا۔ البتہ جب والد محترم اسے ہیبت ناک قسم کی گالیاں اور بھبکیاں دیا کرتے تو لمحہ بھر کے لئے اس کا رنگ پیلا بھی پڑ جاتا تھا۔ گویا چنتامنی بڑا رنگا رنگ آدمی تھا (خدا اسے ہر رنگ میں خوش رکھے)

آنکھیں بڑی بڑی مگر گونگی قسم کی۔ جیسے کوئی حسینہ بغیر بیاہ کے بیوہ ہو گئی ہو۔ کئی بار میں نے اسے مشورہ دیا۔

ارے پگلے! ان پر کالا چشمہ لگا لے، بات بن جائے گی۔"

مگر وہ نہیں مانتا۔ ایک بار میں نے اپنی بیوی کی آنکھ بچا کر اپنا چشمہ اسے دے بھی دیا۔ مگر وہ اس نے ایک دوست کو دے دیا۔ دوست نوازی میں تو وہ بے مثال تھا۔

والد محترم اسے دوست نوازی پر ہمیشہ چھڑی سے پیٹا کرتے تھے۔ اور اس پٹائی کو وہ کمال صبر و شکر سے سہہ لیتا تھا۔ صبر و شکر میں بھی بے مثال تھا۔ والد محترم نہایت فخر سے کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک ہی شریف اور صابر لڑکا پیدا کیا ہے اور وہ چنتامنی ہے۔ بزرگوں کے سامنے چوں تک نہیں کرتا۔ آہ اس کے بھاگنے کے بعد اب ان بزرگوار کی چھڑی کسی کام نہیں آ رہی

چنتامنی کی پیشانی پر ایک داغ ہے۔ ایک بار وہ چھت پر کھڑا ایک لڑکی کو گھور رہا تھا۔ لڑکی مذکورہ نے جواباً ایک اینٹ دے ماری۔ اگرچہ چنتامنی نے اس حقیقت محبت کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ مگر بعد میں اس لڑکی نے البتہ اپنی سہیلیوں سے ذکر کر دیا تو بات پھیل گئی۔ اور اس ڈانٹ کا

علاج کا بل ایک دم یہ کہکر بڑھا دیا کہ اینٹ کا زخم زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

چنتامنی کے جسم کے باقی حصّے صحیح سلامت ہیں۔ وہ ایک مضبوط الجثہ نوجوان ہے۔ غلّہ کی بوری اٹھا کر تین میل تک چل سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ اس وقت بھی کسی غلّہ منڈی میں بوریاں ڈھلانے کا کام کر رہا ہو۔ اور منڈی کے بیوپاری اسے نہایت قلیل اجرت دے رہے ہوں کیونکہ چنتامنی کو بھاؤ تاؤ کرنا نہیں آتا۔ اسے کچھ بھی نہیں آتا۔ سوائے خاموش رہنے کے۔ سوائے ستم سہنے کے۔ مگر میں بیوپاریوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ اس ستم رسیدہ کا زیادہ استحصال نہ کریں ورنہ وہ ان کے ہاں سے بھی بھاگ جائے گا۔ کیونکہ بھاگنے کے لئے اس کے پاس پاؤں موجود ہیں چنتامنی کی زبان کام نہیں کرتی پاؤں کام کرتے ہیں۔

چنتامنی جب گھر سے بھاگا تو اس کے تن پر صرف تین کپڑے تھے۔ ایک پتلون (جو میری تھی) ایک دھاری دار قمیض جس سے وہ بے حد نفرت کرتا تھا۔ مگر پھر بھی پہنے پھرتا تھا۔ اور ایک بنیان جو اس نے بڑے چاؤ سے خریدی تھی۔ یہ بنیان کبھی کبھی والد صاحب بھی پہن لیا کرتے تھے جو انہیں فٹ نہیں آتی تھی مگر وہ کہا کرتے تھے کہ اگر باپ اپنے بیٹے کا بنیان پہن لے تو دونوں کا محبت کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ جس دن چنتامنی بھاگا، اس دن رشتہ استوار کرنے کی باری چنتامنی کی تھی۔ اس لئے بنیان بھی اسی کے بدن پر تھی (اور والد صاحب اس بنیان کے لئے زار و قطار روتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کاش یہ بنیان میرے پاس ہوتی تو میں اسے آنکھوں سے لگا کر تسکین حاصل کر لیتا۔

چنتامنی کیوں بھاگا؟ اس کے متعلق مورخین کی آراء میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ والد محترم یعنی ابوالچنتامنی کا خیال ہے کہ لڑکا شادی کا خواہش مند تھا مگر اسے دور دور تک شادی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ مگر عم الچنتامنی یعنی چچا جان اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ چنتا سرے سے شادی سسٹم کے ہی خلاف تھا اور ریہم چریہ میں یقین رکھتا تھا۔ اس کے

علاوہ وہ ایک ذمہ دارانہ سوجھ بوجھ کا مالک تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی دو بہنیں ابھی تک کنواری بیٹھی ہیں۔ یعنی برہم چریہ کے لئے اس کے پاس ٹھوس وجہ موجود تھی ۔ تیسرے مورخ الجنتامنی یعنی والدہ محترمہ کی رائے چچا جان سے کسی حد تک ملتی ہے صرف اس ترمیم کے ساتھ کہ بہو یعنی میری زوجہ نے ہی اسے یہاں سے فرار ہونے میں مدد دی ہے۔

خود بہو بھی اس قسم کی ایک الگ رائے رکھتی ہے۔ یعنی جو ساس کہے اس کے الٹ۔

اشتہار دینے سے دو دن پہلے مورخین میں ایک خوفناک لفظی جنگ ہوئی میں نے والد محترم پر الزام لگایا کہ آپ نے ہی چنتامنی کو بگاڑ دیا تھا اور اسے ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ

"اے منحوس! کب تک بڑے بھائی کے ٹکڑوں پر پلتا رہے گا اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ"

اور اس طرح آپ نے دو بھائیوں کے درمیان نفرت کی خلیج حائل کر دی تھی

— اس پر والدہ محترمہ میری مدد کو آئیں اور بولیں۔

اس بڈھے کا شروع سے ہی یہی وتیرہ رہا ہے۔ یہ بتا دوں کہ اس بڈھے کے ساتھ تیس سال کاٹ گئی ورنہ پتا ہے آئندہ بھی ایک ساتھ زندگی کاٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ سن کر ہماری بڑی بہن جو ایک اسکول کی استانی ہے، باپ کی حمایت پر اتر آئی اور بولی۔

پتاجی ٹھیک فرماتے ہیں کہ آج ڈیموکریسی کا زمانہ ہے ملک میں صنعتی ارتقاء ہو رہا ہے اس لئے پرانے طرز کے مشترکہ خاندان کا ڈھانچہ قائم رکھنا رجعت پسندی ہے۔ ایک نوجوان لڑکے کو مجبور کرنا کہ وہ مشترکہ کنبے کی جکڑ بندیوں میں رہے عاقبت نااندیشی ہے۔ پتاجی ٹھیک کہتے ہیں۔ دیش کے ہر نوجوان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہئے۔ اور میں تو کہتی ہوں چنتامنی اس ملک کا پہلا باغی ہے جو قدامت کی زنجیر توڑ تاڑ کر چلا گیا۔ ہپ ہپ ہرے۔

بڑی بہن ماڈرن ذہن رکھتی ہے۔ وہ ماڈرن اور قدیم زمانے کے درمیان لٹکی ہوئی ابھی تک کنواری بیٹھی ہے۔ اور شاید وہ اسی طرح سائنٹفک بنیادوں پر بغیر شادی نہ کرے۔ اگرچہ میں نے اس کا تکیہ کئی بار آنسوؤں سے بھیگا ہوا دیکھا ہے۔ مگر آنسوؤں کے باوجود وہ صنعتی ارتقا کا دامن نہیں چھوڑتی۔ اس نے کئی امیدواروں کے ساتھ منگنی کرنے سے اس لئے انکار کر دیا کیونکہ وہ صنعتی ارتقا میں ادھورا یقین رکھتے تھے۔

بڑی بہن کی یہ بات سن کر والدہ محترمہ کٹ کر اٹھیں اور دیوار کی طرف منہ کر کے بولیں۔

"یہ بہن ہے یا ڈائن! چار لفظ پڑھ گئی تو اپنے بھیا سے پیار کرنا چھوڑ بیٹھی۔"

والدہ محترمہ نے یہ الفاظ اس احتیاط سے کہے تا کہ بڑی بہن کے کان میں نہ پڑیں۔ کیونکہ بڑی بہن اپنی بیشتر تنخواہ کنبے پر خرچ کرتی ہیں۔ لیکن چھوٹی بہن شیطان ہے۔ اس نے یہ الفاظ بھی سن لئے۔ اور بولی۔

"ماں! کیا بہن بھائی کی محبت کا شور مچائے جا رہی ہو۔ بہن کس سے محبت کرے؟ ختنا میں سے؟ جس نے تھرڈ کلاس میں میٹرک پاس کی تھی۔ میں کہتی ہوں یاد ہے وہ وقت جب ختنا میں کو کالج میں داخل کرنے کا سوال اٹھا تھا، تو اسی بڑی بہن نے جو آج بڑھ چڑھ کر اسے باغی ہیرو بنا رہی ہے اس کے کالج کا خرچہ اٹھانے کی شدید مخالفت کی تھی ——— اور تم نے بھی کہا تھا کہ اسے کریانہ کی دوکان کھول دو۔"

ہماری یہ بہن خود بھی میٹرک میں فیل ہو گئی تھی اور اب سلائی مشین کا کام سیکھ رہی ہے۔ مورخین کی اس جنگ کے بعد بڑی بہن نے اعلان کر دیا کہ وہ چھوٹی بہن کے سلائی اسکول کی فیس ادا نہیں کرے گی۔ لہٰذا اس کی فوراً شادی کرا دو۔

قارئین! مجھے انتہائی افسوس ہے کہ ختنا میں کی خاطر مجھے اپنے کنبہ کی اندرونی حالت ظاہر کرنا پڑی اور باعزت کنبے کے لئے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ لیکن

پوراپس منظر دیئے بغیر چنتامنی کی تلاش ناممکن ہے، بہرکیف مورخین کے ان شدید اختلافات کی موجودگی میں وثوق سے کہنا ناممکن ہے کہ چنتامنی کیوں بھاگا؟ بیکاری، بیزاری، کنوارپن، کند ذہنی، پٹائی، ڈیموکریسی، صنعتی ارتقا، برہم چریہ قربانی، بے وقوفی — ان میں سے کوئی ایک وجہ بھی ہوسکتی ہے یا ساری وجہیں بھی ہوسکتی ہیں۔ شاید چنتامنی ان تمام وجہوں کو اپنے ذہن میں پالتا رہا۔ پالتا رہا اور اس دن یہ تمام وجہیں منزل مقصود کو پہنچ گئیں جب اچانک دو سو روپے اس کے ہاتھ لگ گئے۔

یہ دو سو روپے میرے ایک دوست کی امانت تھے اور اب اس نے مجھ پر مقدمہ کر رکھا ہے۔

عزیز چنتامنی کی تلاش میں ہم نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ریلوے اسٹیشنوں پر ڈھونڈا، جیل خانے چھانے، جوئے خانوں میں گئے، فلم کمپنیوں سے پوچھا۔ میری ماں درختوں سے پوچھتی پھری۔ والد محترم نے مختلف ریل گاڑیوں پر سفر کیا۔ لیکن چنتامنی جیسے ایک خدا تھا کہ کہیں نہیں ملا۔

تھک ہار کر ہم نے جیوتشیوں اور نجومیوں کا رخ کیا۔ ایک نجومی نے بتایا کہ وہ مشرق کو گیا ہے۔ دوسرے نے کہا، شمال کی طرف گیا ہے۔ ہم دونوں سمتوں میں گئے کیونکہ ہم نے دونوں کو فیس ادا کی تھی۔ ایک اور جیوتشی نے بتایا کہ ایک کتا بھی اس کے ساتھ ہے۔ ہم نے یہ بات بھی مان لی۔ کیونکہ ہمارے محلہ کا ایک کتا بھی اسی دن سے غائب ہے، جس دن سے چنتامنی۔ نہ جانے کتے کو کیا سوجھی کہ بھاگ گیا۔ حالانکہ اس محلے میں وہ بڑے ناز و نعم سے زندگی گزار رہا تھا۔ والد محترم کا خیال ہے کہ کتا ایک وفادار جانور ہے۔ ضرور اس کے ساتھ گیا ہوگا۔ مگر چچا جان کا بیان ہے کہ کتے کو کمیٹی والے زہر دیکر گھسیٹ لے گئے ہیں۔

ایک جیوتشی نے ہمیں ایک منتر پھونک کر دیا اور کہا کہ اسے آدھی رات کے بعد کسی قبرستان میں دفن کر آؤ۔ اس منتر کی طاقت سے چنتامنی کھنچا چلا آئے گا

چنانچہ میں ایک ڈاکو کو ہمراہ لے کر قبرستان میں اس منتر کو دفن کر آیا (بعض ڈاکو بڑے انسان دوست ہوتے ہیں) لیکن چنتامنی پر اس منتر کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بعد میں جیوتشی مذکور سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس منتر کے دو قسم کے اثر ہوتے ہیں۔

نمبر ایک: بھگوڑا مضطرب ہو کر گھر لوٹ آتا ہے۔

نمبر دو: بھگوڑا تنگ آ کر خودکشی کر لیتا ہے۔

شاید چنتامنی پر دوسرا اثر ہوا۔ (مگر ہائے چنتامنی! تمہاری ماں یہ ماننے پر تیار ہی نہیں ہوتی)۔

ایک خدا رسیدہ پاگل عورت نے جس کے اندر کالی دیوی کا نواس ہے اور جو ہر منگلوار کو بال کھول کر "کھیلتی" ہے یہ بتایا کہ لڑکا زندہ ہے۔ مگر اس کے من پر بوجھ ہے۔ اس بوجھ کا اتار کرو اور کالی کتیا کو ہر روز کالے یا جبرہ کی روٹی اور سفید مکھن کی ٹکیہ کھلایا کرو۔ چنانچہ یہ حرام خور کتیا گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ہمارے ہاں گلچھرے اڑا رہی ہے، اور کھا کھا کے سارے محلہ پر بھونکتی رہتی ہے۔ مگر احتراماً کوئی زبان تک نہیں ہلاتا۔

اشتہار ختم کرنے سے پہلے ایک طوطے کا ذکر خالی از دلچسپی نہیں رہے گا کہ ایک ماہر نجوم کی ہدایت پر ہم نے بازار سے ایک طوطا خریدا۔ آج کل گمشدگیوں کی وارداتیں زیادہ ہونے کے باعث طوطوں کا بھاؤ بے حد بڑھ گیا ہے۔ بلکہ اعلیٰ نسل کے طوطے تو ملتے ہی نہیں (بلیک میں مل جاتے ہیں) اور صرف بھٹیر طوطے ہی باقی رہ گئے ہیں۔ چنانچہ ہم نے پندرہ روپے میں ایک مجنوں قسم کا طوطا خریدا۔ اسے پھل اور میوے کھلا کھلا کر اڑنے کے قابل بنایا۔ اور پھر مندرجہ ذیل چٹھی پر اس ماہر نجوم نے پھونک ماری اور طوطے کے گلے میں باندھ دی۔ چٹھی یوں تھی۔

اڑ جا طوطے، کھا کر غوطے، واہ رے تیرے بل بوتے
چنتامنی سے جا کر کہہ دے ارے سب ہیں روتے
تیرے سارے ہونے سوتے۔

طوطے کو دور جنگل میں لے جاکر فضا میں اڑا دیا اور مطمئن ہو کر گھر لوٹ آئے۔ گھر لوٹے تو طوطا پھر گھر میں موجود۔ ہم نے پوچھا۔" میاں مٹھو! کیا ہوا؟"

وہ بولا ــــ " پستہ کھاؤں، پستہ کھاؤں۔"

ہم نے اس نابکار کو مزید پستے کھلانا مناسب نہ سمجھا اور تنگ آکر اس بے وفا جانور کو اسی طوطا فروش کے ہاں آدھے دام پر واپس دے آئے۔

قارئین کرام۔ ہماری یہ تمام کوششیں ظاہر کرتی ہیں کہ چنتامنی ہمیں کتنا عزیز ہے اس لئے ملک بھر کے تمام بہن بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اگر چنتامنی کو کہیں دیکھیں تو سیدھے ہمارے ہاں آئیں۔ خدمت خلق کا تقاضہ تو یہ ہے کہ یہ کام مفت کیا جائے لیکن زمانہ چونکہ صنعتی ارتقا کا ہے۔ اس لئے خدمت خلق کا تقاضا واجب معلوم نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم بطور انعام کچھ گیت دان ضرور پیش کریں گے۔ آنے جانے کا کرایہ بھی دیں گے، بشرطیکہ سفر تھرڈ کلاس میں کیا جائے۔

اور چنتامنی خود اس اشتہار کو پڑھے تو گھر چلا آئے۔ میں یہ کہہ کر چنتامنی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا کہ اس کی ماں بستر مرگ پر پڑی ہے۔ یا والد محترم نے کھانا پینا ترک کر رکھا ہے۔ نہیں یہاں سب خیریت ہے۔ سارے کنبہ کی حالت بدستور اچھی ہے۔ والد صاحب کو کھانا بدستور ہضم ہو جاتا ہے۔ ماں بھی پڑوسنوں سے ہر روز لڑتی ہے۔ اس لئے چنتامنی کو بے خوف ہو کر گھر آجانا چاہیے تاکہ کم از کم ہم اس کالی کتیا کو تو گھر سے باہر نکال سکیں۔" چنتامنی جلدی آؤ بھیا! ورنہ وہ اگر دو سو روپے سارے کے سارے خرچ ہو گئے تو تمہارے واپس آنے کا کوئی فائدہ نہ رہے گا۔"

فکر تونسوی نے الیکشن لڑا

الیکشن ہار جانے کے بعد فکر تونسوی صاحب اچانک غائب ہو گئے ہیں۔ ان کی گم شدگی کے متعلق طرح طرح کی افواہیں اڑ رہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے دریائے جمنا میں ڈوب مرے کسی نے کہا میں نے انھیں ہمالیہ کی طرف بگ ٹٹ بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ ہاپوڑ ریلوے اسٹیشن پر بھیک مانگ رہے تھے اور زار و قطار رو بھی رہے تھے۔

ایک قرض خواہ جب ان کا سامان قرق کرانے پہنچا تو تلاشی کے دوران ان کا ایک مضمون بھی ملا جو انھیں رسوا کرنے کے لئے ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

اچانک میرے بارے میں افواہ پھیل گئی کہ میں الیکشن لڑ رہا ہوں۔ یہ افواہ سن کر میرے سسر نے میری بیوی کو ماتمی تار بھیجا۔ کافی ہاؤس میں میرے دو دوستوں نے ایک دوسرے کو زخمی کر دیا۔ ایک چور نے ٹیلیفون پر مجھ سے شکایت کی ہم تو تمھیں قلاش سمجھ کر تمھارے گھر نقب نہیں لگاتے تھے۔ اب یہ الیکشن کے لئے روپیہ کہاں سے آگیا۔ میرے ایک مخالف امیدوار نے ایک ایمرجینسی میٹنگ بلائی کہ محلّے کے اس واحد بھلے آدمی کو روکا جائے اور اگر نہ مانے تو اسے اغوا کر لیا جائے۔

درحقیقت ہوا یوں کہ جب ملک میں عام چناؤ کی خبر چل چلی تو مجھے شرارت سوجھی کہ مندر کے مہنت رنچھوڑ داس کو چناؤ لڑنے پر اکسایا جائے کیونکہ ایک تو اس کے

پاس چڑھاوے کے ہزاروں روپے دافر پڑے تھے جنھیں ختم کرنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ اس کا ٹوٹل مطالعہ ایک گنگا را مائن اور بھجنوں کے سستے ایڈیشن والی کتاب سے آگے نہ بڑھا تھا۔ اسے کامیاب بنا کر میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ہماری پارلیمنٹری جمہوریت کس حد تک گر سکتی ہے۔ اس لیے میں نے کہا: "مہنت جی ملک کی جمہوریت خطرے میں ہے، اسے بچانے کے لیے آپ چناؤ لڑ دیجیے!"

مہنت بولا: "ہی ہی ہی!"

میں نے کہا: "ہی ہی کا کیا مطلب۔"

"مطلب یہ کہ آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔"

"شرمندہ تو دوسرے ہوں گے۔ آپ کھڑے تو ہو جائیے!"

"نہیں، آپ مجھ سے زیادہ قابل ہیں آپ کھڑے ہو جائیے!"

"مگر قابل آدمی کے پاس موٹر کار نہیں ہے۔"

"میری موٹر کار حاضر ہے۔"

"روپیہ بھی نہیں ہے!"

"بھگوان دے گا!"

"بھگوان کا ایڈریس میرے پاس نہیں ہے۔"

"وہ تو میرے پاس ہے!"

"تو آپ اور بھگوان مشورہ کر کے مجھے آگاہ کر دیجیے گا۔"

میں تو یوں مذاق میں ٹال کر چلا آیا لیکن دوسری شام کو سارے علاقے میں ایک قد آدم پوسٹر چسپاں پایا گیا، کہ مہنت رنچھوڑ داس اور اس کی دو ہزار چار سو بیس عقیدت مند بھگتنیوں کی طرف سے شری فکر تونسوی کو الیکشن میں کھڑا ہونے کی درخواست کی گئی جو انھوں نے منظور فرما لی ہے۔

کچھ لوگوں نے اسے مذاق سمجھا۔ میرے سسر نے میری بیوی کو ماتمی تار بھیجا لیکن اس کے باوجود میری بیوی نے سارے محلے میں لڈو بانٹے۔ کیونکہ وہ بھی مہنت رنچھوڑ

واسوں کی چپلی تھی۔ جب اپنی بیوی بچی جیتنوں کے بس میں ہو تو پولیٹیکل سوجھ بوجھ بے معنی ہو جاتی ہے۔

جس دن کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی آخری تاریخ تھی میں صبح ہی صبح باتھ روم میں جا چھپا۔ لیکن میری بیوی اور احباب نے سپیشل پولیس سکواڈ کو بلایا۔ اور اس کی مدد سے دروازہ توڑ کر مجھے باہر نکالا۔ باتھ روم کے باہر ہی ایک دوست نے الیکشن فنڈ کے لئے اپیل جاری کر دی، اور گیارہ روپے بھی دے دئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو ہزار روپے اکٹھے ہو گئے۔ جن میں بچانوے روپے نقد تھے اور باقی کے وعدے تھے۔ ان بچانوے روپوں میں تین نوٹ پھٹے ہوئے تھے۔

اس پر پراپیگنڈہ مشینری فوراً حرکت میں آگئی اور دو ٹرکوں میں کنوئسنگ کی گئی۔ ایک دوست نے کونے میں لے جا کر سمجھایا کہ کامیاب ہونے کے بعد تمہارے وزیر بننے کے چانس خاصے روشن ہیں۔ ایک جیوتشی کو بلایا گیا جس نے پانچ روپے لے کر زائچہ بنایا کہ قسمت کے ستارے میں نئی کار اور کوٹھی عدالت بیٹھی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ ڈیری اونرز یونین کے پریزیڈنٹ شری نینت رام نے پانی ملا ہوا دودھ کا گلاس میرے منہ سے لگاتے ہوئے کہا "الیکشن میں دودھ کا سارا خرچہ میرے ذمے!" ایک اور صاحب نے وعدہ کیا کہ الیکشن آفس کے لئے میری کوٹھی حاضر ہے۔ (یہ کہنے کے بعد وہ صاحب کبھی نظر نہ آئے)۔

ان حوصلہ افزائیوں نے میرا ایمان متزلزل کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ الیکشن لڑنا شرفاء کا کام نہیں۔ لیکن اب خیال آیا کہ صرف شرفاء ہی کو لڑنا چاہئے ورنہ ڈیموکریسی غنڈہ گردی کا شکار ہو جائے گی۔ اس لئے جوش میں نے حامی بھر دی۔ مجھ پر ایک عجیب سی احمقانہ طمانیت طاری ہو گئی۔ دور کے رشتہ دار کے ایک نوجوان نے جو رام لیلا میں راون کا پارٹ ادا کیا کرتا تھا۔ مجھے پکڑ کر کندھے پر سنبھال لیا تھا اور مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میں رامائن کی سیتا ہوں اور ڈیموکریسی کا راون مجھے اغوا کر کے لے جا رہا ہے۔

دوسری رات کو احباب نے ایک ایمرجینسی میٹنگ بلائی، پچاس دوستوں نے وعدہ کیا تھا لیکن صرف پچیس شامل ہوئے، باقی پچیس میں سے کوئی خود بیمار ہو گیا تھا، کسی کی بیوی بھاگ گئی اور کسی کی بھینس! ایک لیڈی ورکر جو ایک بار جوئے کے جرم میں گرفتار ہو چکی تھی اس میٹنگ میں شامل ہوئی۔ ایک لیڈی ڈاکٹر جو فیملی پلاننگ اور اسقاط حمل دونوں کام ساتھ ساتھ کرتی تھی۔ میری مداح نکلی۔ الیکشن کے ایک گھاگ ماہر سٹری بدلی چیٹرجی نے اس میٹنگ کی رہنمائی کی۔ یہ صاحب چار بار الیکشن لڑ چکے تھے جن میں سے تین بار ہار گئے تھے۔ اور چوتھی بار ایک ٹیکنیکل غلطی کی وجہ سے کامیاب ہو گئے تھے۔ بدلی چیٹرجی نے ہتوپدیش سے لے کر دیوانِ چرکین تک کے حوالے دے دے کر بتایا کہ الیکشن میں کس قسم کی حکمت عملیوں سے کام لینا چاہئے۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ ہر الیکشن پر میری جیب سے صرف پچیس روپے خرچ ہوئے تھے باقی سبھی اخراجات ووٹروں نے برداشت کئے تھے۔ اس انکشاف کا میری الیکشن مہم پر بہت برا اثر پڑا۔ کیونکہ کئی دوستوں نے اپنے وعدے کے روپے دینے سے انکار کر دیا کہ ووٹر خود برداشت کریں گے اور ایک دوست نے تو اپنے دیئے ہوئے پانچ روپوں کی واپسی کا مطالبہ بھی کر دیا۔

اس ہائی پاور میٹنگ میں ایک الیکشن کمیٹی بنائی گئی۔ اس کمیٹی کو تمام اختیارات سونپ دیئے گئے کہ وہ جیسے چاہے الیکشن مہم چلائے۔ پوسٹر نکالے، نہ نکالے، جلسے کرے نہ کرے، مخالف کے جلسوں میں گڑبڑ پھیلائے، جلوس نکالے، کرائے پر مظاہرین حاصل کرے، اپنے امیدوار میں وہ خوبیاں تلاش کرے جو اس میں موجود نہ ہوں اور مخالف امیدوار کے لئے وہ خرابیاں ایجاد کرے جو اس میں موجود نہ ہوں جعلی ووٹروں کی الگ فہرست تیار کرے۔ جوئے میں سزا یافتہ لیڈی ورکر کو زنانہ ووٹروں کے محاذ کی انچارج بنا دیا گیا۔ میری ناکامی کی ایک اہم وجہ یہی جوئے باز محترمہ تھیں۔ کیونکہ یہ جس عورت کے پاس بھی کنویسنگ کے لئے جاتی وہ منہ پھیر لیتی اور مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ عورتیں، عورتوں سے کتنی نفرت کرتی ہیں۔

جب میرے الیکشن کا پہلا پوسٹر نکلا تو کھلبلی مچ گئی کیونکہ وہ اشتہار نہیں تھا ایک ادب پارہ تھا۔ اس ادب پارے کو پانچ فی صدی لوگ سمجھے۔ پچانوے فیصدی نہیں سمجھے۔ میری ضمانت ضبط ہونے کی ایک اور وجہ یہ پوسٹر بھی تھا۔ جس نے میرے ووٹروں کو پانچ اور پچانوے میں بانٹ دیا اور دونوں نے مجھے ووٹ نہیں دیا سمجھداروں نے اپنی سمجھ کے زعم میں اور ناسمجھوں نے "بے ادب" ہونے کے ناطے۔ اور جن چند عورتوں نے مجھے ووٹ دیا ان کی زبانی پتہ چلا کہ انھوں نے مجھ پر رحم کھا کر ووٹ دیا۔ سچ مچ دنیا میں رحم دل انسان اب بھی موجود ہیں۔

میرا خاکہ اڑانے کے لئے نہیں بلکہ عادتاً مخالف امیدوار نے بھی جوابی پوسٹر نکالا۔ جس میں مجھ پر کچھ الزامات لگائے۔ مثلاً۔

۱۔ میں کوٹ پہنتا ہوں۔

۲۔ میری بینائی کمزور ہے

۳۔ میں نے محلّے کے کتّے کو زہر دلوا دیا تھا۔

۴۔ میں نے مندر کی تعمیر کے لئے سوا روپیہ چندہ نہیں دیا تھا۔

۵۔ میں دودھ میں ملاوٹ کا دشمن ہو کر بھی اپنے بچّوں کو دودھ میں پانی ملا کر پلاتا تھا۔

جب یہ پوسٹر شائع ہوا تو پچانوے فیصدی ووٹروں کی سمجھ میں آسانی سے آگیا اس پوسٹر نے ذہنی طور پر قریب قریب مجھے مفلوج کر دیا۔ غصے اور اضطراب سے نیند اڑ گئی۔ الزامات صحیح ضرور تھے۔ لیکن معیاری نہ تھے۔ احباب نے مجھے مجبور کیا کہ میں بھی مخالف امیدوار پر جوابی الزامات لگاؤں۔ مثلاً یہ کہ اس نے مندر کے تہہ خانے میں ناجائز شراب کی بھٹی چلا رکھی ہے۔ اس کے والد صاحب نائی تھے۔ اس کی موجودہ بیوی اغوا شدہ ہے۔ اس کا دادا برٹش سرکار کا پٹھو تھا۔ یعنی سرکار کا چپراسی تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ الزامات میرے الزامات سے بھی گرے ہوئے تھے۔ میں نے دل ہی دل

میں فیصلہ کیا کہ الیکشن نہ لڑوں گا اور شانتکا ٹیکہ چلاؤں گا۔ جب میں نے بیوی سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولی ”میں بھی تمہارے ساتھ شانتکا ٹیکا چلوں گی۔“ میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

”تو محترمہ! الیکشن لڑنا کیا برا ہے؟“

تیسرے دن ہمارا انتخابی جلوس نکالا گیا۔ میرا انتخابی نشان مرغا تھا۔ ایک ساتھی نے تجویز کیا کہ ایک سو ایک مرغے خریدے جائیں۔ ہر مرغے کو بائیسکل کی گدی پر بٹھا کر ان کا جلوس نکالا جائے۔ تجویز بہت اچھوتی تھی۔ لیکن کسی ستمگر نے مرغی فروشوں کے مالکوں تک یہ اطلاع پہنچا دی تو مارکیٹ میں مرغوں کا نرخ سات روپے سے دس روپے ہو گیا۔ بیوی نے پیش کش کی کہ میرے طلائی زیور بیچ کر مرغے خرید کر لیجئے۔ میرا گلا بھر آیا۔ قربانی کی یہ مثال صرف انقلاب فرانس میں ملتی ہے۔ انقلابی سپرٹ کے تحت ایک سو ایک مرغوں کا جلوس بڑے کروفر سے نکلا۔ ایک سو ایک بائیسکلیں اور ان پر گدی نشین ایک سو ایک مرغے اور انھیں بٹھانے کے لئے ایک سو ایک ورکر۔ اس جلوس پر مخالفوں نے پتھر اور حامیوں نے پھول برسائے۔ جلوس میں مرغ اور انسان دونوں شامل ہوئے۔ جلوس کے آگے آگے ککڑوں کوں کا ایک ٹیپ ریکارڈ برابر بج رہا تھا اور عوام نعرے لگا رہے تھے۔

جیتے گا بھائی جیتے گا!

مرغے والا جیتے گا!!

جلوس کے ختم پر معلوم ہوا کہ دس بائیسکلیں اور پندرہ مرغے غائب ہیں کچھ ورکروں نے بتایا کہ چار پانچ مرغے تو مرغیوں کے پیچھے بھاگ گئے۔ کچھ ورکر جو بے ایمان تھے جلوس کے درمیان ہی سے کچھ بائیسکلیں لے کر کھسک گیا۔

تین دن بعد مخالف امیدوار نے بھی جلوس نکالا اس کا انتخابی نشان بھینس تھا۔ انھوں نے بھی ایک سو ایک بھینسوں کا جلوس نکالا۔ عوام اس جلوس میں بھی ہزاروں کی تعداد میں شامل ہوئے ان عوام کا کوئی اعتبار نہیں مرغے اور بھینس دونوں سے۔

یکساں عقیدت رکھتے ہیں۔ عوام کے اس دوغلے پن پر میں کباب ہو گیا۔ صرف ایک بات اطمینان بخش تھی کہ مخالفت کی آٹھ ٹیمیں غائب ہوئیں جن کی قیمت مرغوں سے سات سو گنا زیادہ تھی۔

اس کے بعد جلسوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ امر تعجب خیز تھا کہ مرغوں کی طرح مقررین بھی کرائے پر چل جاتے تھے۔ شاعر اور موسیقار ایک جلسے سے فارغ ہو کر دوسرے جلسے میں پہنچ جاتے۔ صرف امیدواروں کے نام بدل دیتے۔ مواد وہی رہنے دیتے۔ آرٹ اور آرٹسٹوں کی "پیسہ پرستی" دیکھ کر کئی بار مجھے شرم آئی لیکن احباب نے سمجھایا کہ یہ جینٹلمینی دور ہے۔ یہاں آرٹ بھی بازار کی جنس بن گیا ہے۔ بجری، آلو ٹماٹر، گڑ اور شعر۔ ان سب میں کیمید رکھاؤ منٹ گیا ہے۔

ہمارے حلقے میں چھبیس ہزار ووٹر تھے۔ جن میں سے ڈھائی ہزار ووٹر جعلی تھے یعنی خدا کی طرح موجود تھے لیکن نظر نہیں آتے تھے۔ ایک صاحب میرے پاس آئے اور بولے "ان ڈھائی ہزار ووٹروں کا ٹھیکہ مجھے دے دیا جائے۔ ڈھائی ہزار روپے لے کر ووٹ بھگتا دوں گا"۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایسا ہی ٹھیکہ مخالف امیدوار سے بھی کر چکا ہے اور ڈھائی ہزار روپے لے چکا ہے۔ میں نے اسے بلا کر شرمندہ کیا۔ لیکن وہ شرمندہ نہ ہوا اور کہنے لگا "شرمندگی کیسی؟ یہ تو بزنس ہے"۔

ایک ہزار ووٹر رحلت فرما گئے تھے جس سے مجھے بہت تسکین ہوئی کیونکہ ووٹر جتنے بھی کم ہوں اتنی زحمت کم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر ووٹر کے پاس جا کر ہاتھ جوڑنے پڑتے ہیں۔ الیکشن کی اصطلاح میں اسے "ڈور ٹو ڈور کنونسنگ" یعنی در در کی خاک چھاننا کہتے ہیں۔ میں نے کئی ایسے ووٹروں کے سامنے بھی ہاتھ جوڑے جو اندھے تھے۔ ایسے ووٹروں کو اپنا مینی فیسٹو سنایا جو بہرے تھے۔ اس کنونسنگ میں محلے کے جو معززین ہمارے ساتھ چلتے وہ مخالف امیدوار کے ساتھ بھی جایا کرتے۔ ان میں سے ایک معزز نے مجھے کان میں بتایا کہ ہم صرف اخلاق اور تہذیب کی خاطر مخالف امیدوار کے ساتھ جاتے ہیں۔ ورنہ ہم ووٹ آپ ہی کو دیں گے۔

اور ان میں سے اکثر معززین نے ہم دونوں میں سے کسی کو بھی ووٹ نہیں دیا۔ پولنگ کے دن یا تو وہ باہر چلے گئے یا تاش کھیلتے رہے۔

پولنگ سے دو دن پہلے سرگرمیاں کچھ زیادہ تیز ہو گئیں۔ مثلاً مخالف امیدوار کے ایک خاص ایلچی نے رات کے دو بجے آکر میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔

میں نے پوچھا "کیا چاہتے ہو؟"

وہ بولا "آپ کا ضمیر!"

میں نے کہا "ذرا وضاحت فرمائیے۔"

اور اس نے بطور وضاحت پانچ ہزار روپے کے نوٹ میری جیب میں ڈال دئے۔ میں نے کلی کی طرح تبسم کیا اور کہا کہ نرخ بالا کن۔ وہ اداس ہو گیا بولا "مالک نے مجھے چھ ہزار روپے دئے ہیں۔ ایک ہزار میں نے بطور کمیشن رکھ لیا ہے۔"

میں نے یہ سن کر اپنے کتے سے کہا "ان صاحب کو گھر چھوڑ آؤ۔"

دوسرا انکشاف یہ ہوا کہ تمام سبزی خوروں نے مندر میں جا کر قسم کھائی کہ مرغا ایک طرح کا ماس ہے۔ اس لئے کوئی سبزی خور مرغے کو ووٹ نہ دے گا۔ لیکن مندر کے ہیڈ پجاری نے پچاس روپے میں اپنا ضمیر بیچتے ہوئے بتایا کہ جب قسم کھائی گئی اس وقت بھگوان کی مورتی کو نہلایا نہیں گیا تھا۔ اس لئے قسم کا قبول ہونا مشکوک ہے۔

تیسرا انکشاف یہ ہوا کہ ووٹر کی کوئی ذاتی رائے نہیں ہوتی۔ بلکہ مختلف ٹولیوں فرقوں، ذاتوں اور برادریوں کی رائے ہی اس کی رائے ہوتی ہے۔ ترکمان برادری گوالا برادری جوتے باز برادری، چڑی مار برادری، کبوتر برادری۔ غرض ان گنت برادریوں میں ووٹر حضرات کی تقسیم در تقسیم ہو چکی ہے۔ میں نے افراد کی بجائے برادریوں سے التجا کی کہ میں بھی آپ ہی کی برادری کا ممبر ہوں ممبر بنانے کے بعد انھوں نے وعدہ کیا کہ ہم آپ ہی کو ووٹ دیں گے۔ مخالف امیدوار سے بھی ایسا ہی برادرانہ وعدہ کیا گیا۔

اور سب سے آخری اور عظیم انکشاف یہ ہوا کہ جب پولنگ کے بعد ووٹوں کی گنتی کی گئی تو میری بیوی کے سوا کسی کو یقین نہ آیا کہ میری ضمانت ضبط ہو گئی ہے لیکن مجھے برابر یہ شک رہا کہ میری بیوی نے بھی مجھے ووٹ نہیں دیا۔ بدنیتی سے نہیں لاعلمی سے !!

وارنٹ گرفتاری

ایک دن میں رات کو گھر لوٹا تو راستہ میں ایک بیل گاڑی سے ٹکرا گیا۔ اور عینک کا فریم ٹوٹ گیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس شام کو ایک ادبی اجتماع میں وزیر تہذیبی امور نے مجھ سے کہا تھا کہ فکر صاحب! آپ سلطنت ادب کے کوہ نور ہیرے ہیں۔

اور کوہ نور ہیرا فرط مسرت میں جب عینک کا فریم تڑا کر لوٹا تو بیوی نے دیکھتے ہی کہا: "آج آپ کے وارنٹ گرفتاری آئے تھے۔"

منجھلے بچے نے مارے خوف کے چمٹتے ہوئے کہا۔ "ڈیڈی کیا آپ اب جیل چلے جائیں گے؟"

سب سے چھوٹے بچے نے خوشی سے اعلان کیا "ڈیڈی: میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

پڑوسی رگھو رام میری آواز کی بو سونگھ کر آ گیا اور بولا: "فکر صاحب! شاید بلنٹ کل بھی آئے گا۔ اس لئے گرفتاری سے بچنا چاہئے۔

پڑوسی مادھو رام جس کی پڑوسی رگھو رام سے خاندانی دشمنی تھی۔ اس نے رگھو رام کی آواز کی بو سونگھی تو آ کر بولا: "فکر صاحب شریف آدمی ہیں۔ بچنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انھیں خود بخود کچہری میں حاضر ہو جانا چاہیے۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یہ کیا ہے کے وارنٹ گرفتاری تھے؟ کس جرم میں؟ میں

نے اپنے گزشتہ چالیس سالہ جرائم پر نگاہ ڈالی تو صرف ایک جرم دکھائی دیا۔ جبکہ پندرہ برس کی عمر میں لائبریری سے میں نے ایک کتاب چرائی تھی۔ مگر آج کل تو میں اس لائبریری کی مشاورتی کمیٹی کا ممبر تھا۔ میں نے بیوی سے پوچھا۔ ''تم نے وارنٹ کی عبارت پڑھی تھی؟"

''ہاں'' عدم ادائیگی قرضہ کے وارنٹ تھے۔''

بیوی نے زندگی میں پہلی بار سچی بات کہی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ سینکڑوں بار کہہ چکی تھی کہ میں آپ سے سچی محبت کرتی ہوں۔ مگر مجھے اعتبار نہیں آتا تھا کیونکہ سچی محبت وہ صرف اپنی ماں سے کرتی تھی۔ میں نے سرکار سے سچ مچ ایک بار قرض لیا تھا اور واپس اس لئے نہیں کیا تھا، کیونکہ میرا خیال تھا کہ سرکار کے پاس مجھ سے زیادہ پیسہ ہے۔

لیکن سرکار نے سماجی انصاف کی خاطر میرے وارنٹ نکال دئے۔ وارنٹ کا تصور نہایت گھناونا ہوتا ہے۔ گندی گالی وارنٹ سے کم توہین انگیز ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ غصہ مجھے پڑوسی رگھو رام پر آیا جسے یہ معلوم ہو گیا کہ سرکار مجھے ہتھکڑی لگانے آئی ہے۔ میں نے رگھو رام کو اب اپنا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے کے لئے کبھی نہیں دوں گا)۔

دوسرا غصہ سرکار پر آیا۔ اس نے میرے وارنٹ کیوں نکال دیئے؟ کسی اور کے نکال دیتی! کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ سرکار کے وزیر تہذیبی امور نے مجھے کوہ نور ہیرا کہا ہے۔ ایک طرف کوہ نور، دوسری طرف وارنٹ؟ ایک ہی آدمی کے بارے میں سرکار کی یہ ڈبل پالیسی کیوں ہے؟

اور پھر سرکار نے مجھے قرضہ ہی کیوں دیا تھا (ضمیر نے کہا تم نے خود مانگا تھا) کیا سرکار کو معلوم نہیں تھا کہ میں لوٹا نہیں سکوں گا۔ اور پھر میں نے اکیلا تھوڑے لیا تھا۔ ہزاروں مصیبت زدگان نے لیا تھا۔ سرکار کا فرض تھا کہ یہ قرضے معاف کر دیتی۔ تاریخ میں تو یہ اکثر ہوتا آیا ہے کہ سلطنتوں کے اربوں روپے ڈوب جاتے

ہیں۔ بلکہ خود سلطنتیں ڈوب جاتی ہیں۔

رات بھر ڈر اور غصہ میں نیند نہ آئی اور میں سرکار، قانون، بیلف، حتیٰ کہ گھر کے چوہوں تک کو کوستا رہا جو ہماری چلتی کی پلٹنیں توڑ جاتے ہیں۔ صبح کے قریب آنکھ لگی تو خواب میں والد صاحب نے درشن دیئے اور کہا: "قرضہ چکا دو بٹیا! کیوں باپ کا نام ڈبو رہے ہو۔"

جب آنکھ کھلی تو سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ بیوی بچوں کو لے کر ہردوار چلا جاؤں اور گھر کے دروازے پر یہ چٹ چسپاں کر جاؤں ر

"فکر تونسوی اپنے گناہوں کے پشچاتاپ کے لئے تیرتھ یاترا پر گیا ہوا ہے۔"

لیکن۔ (۱) اگر سرکار نے فراری ملزم قرار دیا؟

(۲) اگر آج کمبخت بیلف پھر آگیا؟

(۳) اگر کچہری میں خود بخود حاضر ہونے پر کلکٹر نے جیل میں ڈال دیا؟

والد صاحب کی اس تجویز پر سخت افسوس ہوا کہ قرضہ چکا دو۔ آہ۔ آہ! گہنے گروی رکھ دوں؟ مگر نہیں۔ دنیا کی تو نئی عورتیاں گہنوں کو خاوند سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔ بلکہ عین ممکن ہے، بیوی اسی پوائنٹ پر طلاق کی دھمکی دے ڈالے۔ کیا کسی وکیل سے مشورہ کروں؟ مگر والد صاحب نے ایک بار نصیحت کی تھی کہ بٹیا! آدھے حکیم اور پورے وکیل کے پاس نہ جانا۔ دونوں روگ بڑھا دیں گے۔

صرف ایک طریقہ باقی تھا کہ بغیر ناشتہ کئے گھر سے چلا جاؤں اور بیوی سے کہہ جاؤں کہ بیلف آئے تو اسے اطلاع دے دینا کہ ملزم ہندوستان چھوڑ کر ٹانگا نیکا چلا گیا ہے اور اس جنم میں نہیں لوٹے گا۔

چنانچہ جلدی جلدی کپڑے بدلے، بیوی کو وصیت کی اور گھر سے باہر نکل گیا راستہ میں جو آدمی بھی خاکی وردی پہنے گزرتا۔ میری طرف گھورتا۔ اور میں آنکھیں بند کر کے اسے چل دینا اور آگے بڑھ جاتا۔ اور اس دن سڑک پر نہ جانے کیوں؟ ہزاروں

بیلف وارنٹ لئے گھوم رہے تھے لیکن میں ان کے ہاتھ نہیں آیا۔ دن بھر کئی دوستوں دفتروں اور آشناؤں کے ہاں گیا (یہ سب میرے ٹانگانیکا تھے)۔ اور آخر شام کو ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا اور دوستوں سے گپ شپ لڑانے لگا۔

اچانک ریسٹورنٹ میں بیٹھے بیٹھے کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پراسرار جنٹلمین ہماری میز کی طرف بڑھ رہا ہے۔ قریب آتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا آپ کا نام فکر تونسوی ہے؟"

میں نے بڑے بہادرانہ لہجہ میں کہا (کبھی کبھی ڈر کی شدت میں انسان بہادر بھی بن جاتا ہے) "نہیں صاحب! میرا نام رام گوپال ہے، البتہ فکر تونسوی کو جانتا ضرور ہوں۔"

اب مجھے یقین آگیا کہ یہ وہی کم بخت بیلف ہے جو بھیس بدل کر آگیا ہے۔ سوچا اسے غلط ایڈریس بتا دوں۔ لیکن جلدی میں کوئی غلط ایڈریس بھی نہیں سوجھا اور کہہ دیا "ٹانگانیکا چلے گئے ہیں؟"

شخص مذکور مایوس ہو کر چلا گیا۔ بعد میں ایک دوست نے بتایا کہ یہ ایئر انڈیا کارپوریشن میں ملازم تھا اور تمہارا مداح تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ ایک مداح خوامخواہ میرے ہاتھوں بیلف بن گیا۔

شام کو چار بجے کے قریب گھر لوٹا۔ اپنے پلان کی کامیابی پر نازاں، اپنی بزدلی پر شرمندہ، لیکن وارنٹ کے تصور سے بدستور ہراساں۔

جونہی گھر کی کنڈی کھٹکھٹائی، بیوی نے اندر سے آواز دی "کون ہے؟"

میں نے مذاق میں کہا: "بیلف"

اندر ہی سے کرخت لہجہ میں جواب آیا: "مُوا پھر آگیا — اجی بیلف صاحب! تم سے تین بار کہہ چکی ہوں، فکر صاحب ٹانگانیکا گئے ہوئے ہیں!"

میں نے کہا "ڈارلنگ! میں ٹانگانیکا سے واپس آگیا ہوں۔"

بیوی نے ڈارلنگ کے لفظ کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا: "ہاں ہاں ٹانگانیکا

جو براعظم افریقہ میں ہے ۔"
اس مرتبہ بیوی کی ہنرمندی پر بے حد پیار آگیا۔ میں پہلے سمجھا کرتا تھا فضول سی بیوی ہے۔ صرف بچے پیدا کرنا جانتی ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ تو جغرافیہ بھی جانتی ہے۔
میں نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ کیونکہ ڈپلومیٹک بیوی سے مجھے ایک اور خطرہ لاحق ہوگیا تھا کہ کہیں میں دروازے پر ہی کھڑا نہ رہ جاؤں اور وہ دروازہ ہی نہ کھولے اور حد سے زائد ہنرمندی میں مجھے پہچاننے سے ہی انکار کردے۔ چنانچہ میں پچھلی طرف سے دیوار پھاند کر اندر آنگن میں داخل ہوگیا۔ "یہ کیا حرکت ہے؟"
عرض کیا۔" جب فکر تونسوی اور ببلیٹ میں فرق مٹ جاتا ہے تو دیوار پھاند کر اندر آنا پڑتا ہے ۔۔ تم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا؟"
" آپ نے کیوں کہا تھا کہ میں ببلیٹ ہوں۔ وہ کم بخت آج تین مرتبہ آیا تھا۔ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں پھر نہ آجائے۔
ہم پاگل ہوئے ہیں کیا؟ رولز کے مطابق اب میرے وارنٹ ٹانگا نیکا ہی جائیں گے
بیوی بے اختیار ہنس پڑی، بچے بھی ہنس پڑے۔ میں خود بھی کسی حد تک ہنس پڑا۔ لیکن دل کی نچلی تہوں میں کوئی بیٹھا کہہ رہا ہے۔
" اور اگر ببلیٹ آگیا تو۔۔۔"
اور دوسرے دن ببلیٹ واقعی آگیا۔
میں برآمدے میں کرسی ڈالے اخبار پڑھ رہا تھا کہ اچانک کیا دیکھتا ہوں۔ ببلیٹ میری کرسی کے عین پیچھے کھڑا تھا۔ دماغ نے کہا" اگر یہ ببلیٹ ہے بھی۔ تو بھی سمجھو کہ ببلیٹ نہیں ہے۔ تم اخبار پڑھتے رہو!"
ببلیٹ نے کہا" جناب!۔۔۔"
میں نے اخلاقاً کہا" کون ہو۔ کیا چاہتے ہو؟"

"جناب! کیا فکر تونسوی صاحب آپ کا اسم گرامی ہے؟"

"میرا خیال ہے۔ پہلے آپ بتایئے کہ آپ کا اسم گرامی کیا ہے؟"

"میں سرکاری بیلف ہوں۔"

"تو پھر میں فکر تونسوی نہیں ہوں۔"

بیلف مسکرا دیا (کتنی خوفناک مسکراہٹ تھی ظالم کی) چند سکنڈ تک مجھے گھورتا رہا اور جب تک وہ گھورتا رہا میں دل ہی دل میں گائتری منتر کا جاپ کرتا رہا۔ آخر کار وہ بولا "جناب! آپ مذاق کر رہے ہیں، کیونکہ آپ مزاح نگار ہیں نا؟ مگر عرض یہ ہے کہ میں نے آپ کا فوٹو ایک رسالہ میں دیکھا تھا۔ جس کے نیچے فکر تونسوی لکھا تھا۔"

"وہ پرنٹنگ کی غلطی ہوگی۔"

"ایک بار ایک مشاعرہ میں آپ کو نظم پڑھتے بھی دیکھا تھا۔"

"وہ مشاعرہ والوں کی غلطی ہوگی۔"

"اور آپ کے پڑوسی رگھو رام نے بھی مجھے ابھی ابھی بتایا ہے کہ وہ سامنے کرسی پر فکر تونسوی صاحب ہی بیٹھے ہیں۔"

اب میں نے گائتری منتر پڑھنا بند کر دیا۔ اس زمانے میں گائتری منتر میں بھی جان نہیں رہی۔ چنانچہ گائتری منتر کی بجائے میں نے خاندانی شرافت کا سہارا لیا اور (کانپتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ) کہا۔ "اچھا چلو۔ مذاق ختم۔ بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"

"آپ کو تحصیلدار صاحب نے عدالت میں بلایا ہے۔ آپ کے وارنٹ گرفتاری ہیں۔"

آہ! یہی وہ غلیظ فقرہ تھا۔ جسے میں سننا نہیں چاہتا تھا۔ اخبار ایک طرف رکھ کر میں نے وارنٹ گرفتاری اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسے خواہ مخواہ پڑھنا شروع کیا۔ وارنٹ پر وہی روایتی توہین انگیز عبارت تھی جو

"— ہرگاہ کہ مسمی فکر تونسوی ولد ...... ذات .... پیشہ .....
سکنہ ۔ دیدہ دانستہ عدالت میں حاضر ہونے سے گریز کر رہا ہے، لہذا بسلسلہ عدم
ادائیگی قرضہ مجریہ سرکار عالیہ ۱۹۵۰ء مسمی مذکور کے وارنٹ گرفتاری جاری کئے جاتے
ہیں کہ ملزم کو گرفتار کر کے بہ عدالت تحصیلدار صاحب مورخہ ...... تک پیش
کیا جائے .....

دستخط

مہر عدالت ......"

میں نے محسوس کیا کہ میرے بیوی بچے کھڑکیوں میں کھڑے مجھے جھانک رہے
ہیں۔ ادھر ادھر کی کھڑکیوں سے دو چار پڑوسیوں کے منحوس چہرے بھی جھانکتے
دکھائی دیئے۔

پہلے میں نے سوچا کہ بیلیف سے کہوں، وارنٹ کی عبارت ٹھیک کرا کر
لاؤ۔ کیونکہ ادبی اعتبار سے اس میں کئی سقم ہیں۔ لیکن بیلیف نے مجھ سے پہلے
کہہ دیا۔

"تو چلئے جناب"

میں نے کہا: "ٹھہرو چلتا ہوں، تھوڑا سا سوچ لوں۔"

رگھو رام پڑوسی ہماری باتوں کا لطف اٹھانے کے لئے ہمارے پاس آ گیا
"کمینہ!" — میں نے دل ہی دل میں کہا۔ لیکن وہ الٹے ہمدردی جتانے کے لہجہ میں
بولا: "کیا بات ہے فکر صاحب!"

میں نے کہا: "کچھ نہیں، ان صاحب کی ایک بھینس گم ہو گئی ہے۔ پوچھ رہے
ہیں، ہمارے گھر تو نہیں آئی!"

رگھو رام بولا: "معمولی بات ہے، مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ بھائی صاحب
ذرا ادھر میری بات تو سنئے۔"

وہ بھائی صاحب کو ایک طرف کونے میں لے گیا اور کھسر پھسر کرنے لگا۔ شاید

اسے ہجڑ کا رہا تھا کہ تم فکر تونسوی کو ضرور گرفتار کر کے لے جاؤ ۔ ورنہ تمہاری رپورٹ کر دوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ببلیٹ مسلسل انکار میں سر ہلا رہا تھا ۔ اتنے میں رگھو رام میرے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا "اجی دو روپے دے دو سالے کو ، ٹل جائے گا ۔"

میں اصولی طور پر رشوت کے خلاف ہوں ۔ لیکن سوچا کہ یہ کار آمد اصول کسی اور بہتر وقت کے لئے استعمال کروں گا ۔ لہٰذا جھٹ دو روپے نکال کر رگھو رام کی ہتھیلی میں تھما دیئے ۔ رگھو رام نے ببلیٹ کے صدیوں کے افلاس زدہ چہرے کی طرف دیکھ کر کہا ۔

ببلیٹ نے حقارت سے زمین پر تھوک کر کہا ۔ "اجی ! کیا آپ مجھے رشوت خور سمجھتے ہیں ؟"

میں نے جو تیسرا روپیہ دینے کے لئے جیب سے نکالا تھا ۔ ڈر کے مارے واپس جیب میں ڈال لیا ۔ (اچھے اور ایماندار آدمی سے کبھی کبھی کتنا ڈر آتا ہے ؟) ۔

رگھو رام نے بھی تکنیک بدل لی ، بولا "ببلیٹ ! کیا تم جانتے ہو فکر صاحب بہت بڑے ادیب ہیں ؟"

ببلیٹ نے بغیر سوچے سمجھے کہا : میں رگھو رام سے اتفاق کرتا ہوں ۔"

ببلیٹ نے جواب دیا "ہاں ۔ میں ان کا مداح ہوں ، لیکن سرکار کا نوکر بھی ہوں اور یہ میری نوکری کا سوال ہے ۔"

ببلیٹ کی مدلل ضد نے ہمیں بے بس کر دیا ۔ اب مجھے ببلیٹ پر نہیں سرکار پر غصہ آ رہا تھا ۔ یہ کیسی سرکار ہے جس کا ببلیٹ اور کلچرل منسٹر دونوں میرے مداح ہیں مگر مجھے گرفتاری سے نہیں بچا سکتے ۔ ایسی سرکار کا کیا فائدہ ؟ ایسی سرکار کو بدل دینا چاہیئے ایسی سرکار مردہ باد ! ــــ انقلاب زندہ باد !!

تھوڑی دیر ایک خوفناک خاموشی طاری رہی ۔

اور پھر میں بغیر سوچے ایک طرف چلنے لگا ۔

ببلیٹ بھی میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا ۔

میں نے رومال سے ناک صاف کیا۔
ہیلیٹ نے بھی اپنا ناک صاف کیا۔
ہیلیٹ میرا تعاقب کیوں کر رہا ہے۔ ہیلیٹ مجھے چور سمجھتا ہے۔ یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ مجھے بیماروں کی طرح گرفتار ہو جانا چاہیئے۔ میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے
ہیلیٹ نے کہا۔ "جناب! چلئے، اب کوئی مزید بہانہ مت سوچیئے۔"
"بے: بہانہ کیسا؟" میں اکڑ گیا۔ "میں تمہارے وارنٹ سارنٹ سے نہیں ڈرتا۔ اور ابھی کپڑے بدل کر تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"
"مگر اب آپ کپڑے بھی نہیں بدل سکتے۔ آپ جانتے ہیں کہ مجھے ہتھکڑی لگانے کے اختیارات بھی ہیں۔"
جی چاہا، ہیلیٹ کے منہ پر طمانچہ جڑ دوں لیکن مداح سمجھ کر رک گیا۔ توہین، ہتھکڑی جیل، تخصیلدار۔ سبھی کبھوتوں کی طرح میرے اردگرد ناچنے لگے اور جیسے کوئی گھنا ڈراؤنا خواب دیکھتے وقت آدمی بول نہیں سکتا، میری زبان بند ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ کھڑکی میں جھانکتی ہوئی میری بیوی نے ایک دردناک چیخ ماری ہے۔ شاید زمین پر گر کر بیہوش بھی ہو گئی ہو۔ (کبھی کبھی ان بیویوں کو خاوندوں پر بے ساختہ پیار آ جاتا ہے)
آخری نوٹ: اس کے بعد کی کہانی نہایت معمولی ہے کہ مصنف عدالت میں چلا گیا اور فوراً ہی رہا کر دیا گیا۔ لیکن مصنف اس ڈسپیچ کلرک کا ہمیشہ ممنون رہا جسکی ذرا سی غلطی سے اس کے وارنٹ جاری ہو گئے کیونکہ اگر کلرک غلطی نہ کرتا تو مصنف اتنی خوبصورت کہانی نہیں لکھ سکتا تھا۔

بیویوں کی ٹریڈ یونین

چند دن ہوئے میں رات کو جب گھر لوٹا۔ اور مردانہ روایت کے مطابق دیر سے لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری پہلی اور آخری بیگم نے اپنے گورے گورے کرتے پر ایک سیاہ بلّہ لگا رکھا ہے۔

میں نے عرض کیا "یہ کیا ہے حضور؟"

وہ بولا "جھنڈا اونچا رہے ہمارا"

میرا ماتھا ٹھنکا کہ آج دال میں کالا ہے۔ چاند سا چہرہ جو کل تک رشکِ تباں تھا، آج کسی انجمن خدام وطن کا پوسٹر معلوم دے رہا تھا جس پر تحریر تھا ۔

"اٹھو، مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو"

میں نے کچھ مسکرا کر اور کچھ ڈر کر کہا "اے انقلاب زندہ باد! کھانا لے آؤ۔"
وہ اپنی سڈول باہوں کو کسی جھنڈے کی طرح لہرا کر بولی "آج کھانا نہیں ملے گا آج چولہا ڈاؤن اسٹرائیک ہے۔"

شبہ یقین میں بدلنے لگا کہ معاملہ گمبھیر ہے اور اب بیگم کے ساتھ رومانٹک گفتگو کرنا فضول ہے۔ یہ کس ستم گر نے گھر پر انقلابی چھاپا مارا ہے کہ آج محترمہ کی آنکھوں میں کاجل کی تحریر کی بجائے مطالبات کا چارٹر دکھائی دیتا ہے۔ معاملے کی سنجیدگی کو دیکھ کر میں نے

بھی اپنا لب ولہجہ بدل دیا اور مالکانہ وقار کے ساتھ کہا" بیگم تمھیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ تم میری بیوی ہو۔"

تڑاق سے جواب آیا۔ ہاں مگر میں ایک ورکر بھی ہوں اور آپ میرے مالک ہیں اور میری محنت کا استحصال کرتے ہیں ۔"

" مگر ڈارلنگ !" میں نے پھر اپنا لہجہ بدل لیا" مالک تو تم ہو، میرے دل و جان کی مالک، اس سلطنت کی تم نواب واجد علی شاہ ہو۔ تباؤ ہو کہ نہیں ؟"

ایک دن پہلے تک میرا یہی فقرہ طلسم ہوشربا کا کام کر جاتا تھا۔ اور بیگم تڑپ کر میرے بازوؤں میں آگری تھی۔ لیکن آج آغوش میں آنے کی بجائے اس نے اپنی نرم ونازک مٹھی دکھائی اور میز پر مارتے ہوئے بولی ۔" سیٹھ جی ! لچھے دار لفظوں کے یہ چھلاوے اب نہیں چلیں گے۔ صدیوں سے ظلم کی چکی میں پستی ہوئی بیویاں اب بیدار ہو چکی ہیں۔ اور اب تو اپنے حقوق منوا کر دم لیں گی اور ...

جو ہم سے ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا ۔"

میں نے کہا" کیا آج ہمارے گھر میں کوئی ترقی پسند شاعر آیا تھا؟

وہ بولی" شاعر میرے اندر سویا ہوا تھا۔ آج جاگ اٹھا ہے۔ لہٰذا میرے مطالبات مانئے نہیں تو ...."

"کون سے مطالبات"

" سب سے پہلے" بیگم نے حلق میں تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں گھنگروؤں کی مالوس جھنکار نہیں تھی۔ بلکہ طبل جنگ کی سی گھن گرج تھی ۔" سب سے پہلے میرا مطالبہ یہ ہے کہ میرے کام کے اوقات گھٹائے جائیں، صبح پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتی ہوں، انھیں کم کر کے تو گھنٹے کیے جائیں۔ ہر مہذب سماج میں یہی دستور ہے ۔"

مگر ڈارلنگ یہ تو ہندوستانی سماج ہے ۔"

وہ بھڑک اٹھی ۔" اور بائی دی وے جب تک مطالبات کی گفتگو جاری رہے

آپ مجھے ڈارلنگ کے لقب سے مخاطب نہ کریں۔ ہاں تو ہندوستانی سماج کو مہذب بنانے کے لئے دو گھنٹے کے اوقات آپ کو منظور ہیں؟"

میں نے کہا "دیکھو (ڈارلنگ نہیں) ورکر بیگم! گھر میں اگر صرف دو گھنٹے کام ہوا تو اس سے پروڈکشن پر برا اثر پڑے گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کام کی دو شفٹیں کرنا پڑیں گی۔ دو شفٹیں اور دو بیویاں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اس گھر میں دوسری بیوی لے آؤں؟"

سوکن کا جلاپا عورت کی نازک رگ ہے۔ میں نے اس رگ پر جان بوجھ کر انگلی رکھ دی کہ ٹریڈ یونین کے اندر انتشار پیدا ہوئے مگر بیگم کے اندر جیسے وہ قدیم حاسد عورت مر چکی تھی۔ وہ بولی۔ "یہ مالک کی اپنی پرابلم ہے! آپ چاہیں تو کوئی ملازمہ رکھ سکتے ہیں۔"

بیگم سوکن والے پہلو سے صاف بچ کر نکل گئی۔ اس کی یہ چترائی میرے لئے پریشان کن تھی۔ چنانچہ میں نے ایک اور ہتھیار نکالا۔ "مگر اسے تنخواہ کہاں سے دیں گے؟ جتنی تنخواہ ملتی ہے۔ تمہارے گورے گورے ہاتھوں پر لا کر رکھ دیتا ہوں۔ تم چاہو تو اس تنخواہ میں سے ملازمہ رکھ سکتی ہو۔"

"اس تنخواہ میں ملازمہ نہیں رکھی جا سکتی۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"میں نے کہا نا! یہ مالک کی اپنی پرابلم ہے اسے خود سوچنا چاہیئے۔"

"آل رائٹ۔" میں نے تنگ آکر کہا "مینجمنٹ اس پر ہمدردانہ غور کرے گا اب اگلا مطالبہ پیش کیا جائے۔"

"دوسرا مطالبہ چھٹیوں کا ہے۔"

"مستقل چھٹی کا؟ اس کی تو میں کئی بار پیش کش کر چکا ہوں۔ مگر ہر بار تم نے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔"

"دیکھیئے آپ اسے مذاق میں مت ٹالئے۔ حالانکہ اللہ قسم! یہ مذاق بالکل

نہیں تھا) ہندوستان بھر کے سارے کامگاروں کو اتوار کی ہفتہ وار چھٹی ملتی ہے مگر مجھے اتوار کو سب سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر اتوار کو آپ کے احباب آدھمکتے ہیں۔ کوئی لنچ کھانے اور کوئی ڈنر اور کوئی یوں ہی گھومتے گھماتے چائے پینے آٹپکتا ہے۔ دیوالی، دسہرہ، عید، بقرعید کوئی چھٹی بھی تو نہیں ملتی ہے۔ نہ میڈیکل چھٹی نہ ایمرجنسی چھٹی۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے؟" یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں بھی رونا چاہتا تھا مگر مینجمنٹ میں رونے کا رواج نہیں تھا۔

مطالبہ (بشرطیکہ جھوٹ نہ بلوائے) بالکل جائز تھا۔ لیکن مینجمنٹ کا رویہ بھی اس کے متعلق بڑا واضح تھا کہ کسی بھی مطالبے کو جائز قرار نہ دیا جائے۔ بلکہ اگر مطالبہ تسلیم بھی کرلیا جائے تو اسے اس کی بجائے احسان کا درجہ دیا جائے۔ چنانچہ میں نے کہا۔ "دیکھو بیگم! عورت ذات کی تاریخ گواہ ہے کہ اسے موت سے پہلے چھٹی نہیں ملتی۔"

"لیکن میں تاریخ کا دھارا موڑنا چاہتی ہوں۔"

"میری پیاری ہٹلر! اگر تم عقل کا تھوڑا سا بھی استعمال کرو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ سماج کی تاریخ کا سارا ڈھانچہ عورت کے کندھے پر کھڑا ہے۔ جس دن بھی عورت نے چھٹی کی سماج میں ایک تعطل آجائے گا۔ بھائیں بھائیں کرتی ہوئی ایک ویرانی گھر پر مسلط ہوجائے گی۔ سارا کام اس روز چوپٹ ہوجائے گا۔ یوں لگے گا، فیکٹری پر جبری تالہ بندی کرادی گئی ہے۔ بچے روئیں گے، میں روؤں گا، گھر کی بلی اور طوطا اور چڑیا سبھی روئیں گے۔ میں پوچھتا ہوں، تمھاری چھٹی کے دوران کام کون کرے گا؟"

"آپ کیجیے گا۔" جذبات سے بالکل عاری ہو رہی تھی، ظالم!

اب میں نے پینترا بدلا اور کہا۔ "اچھا چلو میں تمھاری ہفتے وار چھٹی منظور کرتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ اس چھٹی پر تم کروگی کیا؟"

"بس بیٹھی رہوں گی، سوئی رہوں گی، سہیلیوں کے ساتھ گھومنے جاؤں گی، فلم دیکھوں گی۔"

لب ولہجہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بیگم صرف میری نقل کرنا چاہتی ہے اور بخیل بالکل نہیں ہے۔ ایک بار دل میں یہ شیطانی خیال بھی آیا کہ اسے اوور ٹائم کا لالچ دیدوں یعنی چھٹی کے دن کام کرو تو دوگنی اجرت ملے گی۔ اوور ٹائم کی رقم جمع کر کے۔ ایک ساڑھی خرید لینا لیکن بیوی کا اوور ٹائم کی ترازو پر تولنا کچھ اچھا نہیں لگا۔ لہٰذا میں نے مردانہ فراخدلی کی انتہائی بلندی پر کھڑے ہو کر آواز دی "دسکلی چھٹی منظور کی جاتی ہے۔ مگر ایک شرط پر کہ تم اس دن بال بچوں کو ہمراہ لے کر میکے چلی جایا کرو۔

میکے کے ریچ پر بیگم کچھ بوکھلا گئی۔ میکہ ہر عورت کی کمزوری ہے۔ میکے کے سامنے سارا ٹریڈ یونین ازم منتشر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بیگم کی سمجھ میں یہ بات فوراً نہیں آئی کہ اس کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا ہے یا مطالبہ کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا گیا ہے۔ مطالبے کے ساتھ شرط کی ریچ لگا کر میں نے ایک تیر سے دو شکار کر لئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس سے بیگم بھی خوش ہو جائے گی اور میں بھی بیگم کی غیر حاضری میں یا خاوند کو جو آزادی نصیب ہو جاتی ہے اس کا اندازہ صرف وہی شادی شدہ مرد لگا سکتے ہیں جو ایک مستقل یکسانیت سے نالاں رہتے ہیں۔

بیگم نے زیر لب تبسم سے اس فیصلہ پر صاد کیا اور میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا کہ :۔

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

بیگم کا تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ گھر کے اخراجات کے لئے اسے جو رقم دی جاتی ہے اس میں اضافہ کیا جائے۔ کیونکہ اشیاء کے پرانے نرخ قائم نہیں رہے۔ ہر چیز پہلے کے مقابلے پر دوگنی مہنگی ہو گئی ہے۔ مگر اخراجات کی رقم بدستور وہی ہے۔

گویا یہ مہنگائی الاؤنس کا مطالبہ تھا جو بیک وقت جائز اور ناجائز تھا۔ میں نے جھٹ کہا: "بیگم! مجھے تمہارے اس مطالبے سے ہمدردی ہے، بلکہ صرف ہمدردی ہے۔"

وہ تڑپ اٹھی "مگر ہمدردی سے تو بنیاین بھی نہیں آسکتی۔

"تو بنیاین نہ خریدو۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ روکھی سوکھی روٹی کھا کے ٹھنڈا پانی پی۔" تو اس کا کچھ مطلب تھا۔ کچھ فلاسفی تھی۔ افسوس یہ ہے بیگم! کہ تم ٹریڈ یونین ازم کے جوش میں بزرگوں کی فلاسفی بھول گئیں۔"

اس کے جواب میں بیگم نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ بہت اذیت ناک تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ روکھے سوکھے کی فلاسفی پر یقین نہیں رکھتی وہ معیار زندگی کو گرا کر محلے میں اپنی ناک کٹوانا نہیں چاہتی۔ اس نے آنسوؤں کا ہتھیار نکال کر مجھ پر بار بار حملے کئے اور دھمکی دی۔ گھر کے اخراجات کی ذمہ داری تم خود سنبھال لو خالی خولی ہمدردی اور بزرگوں کی فلاسفی کے ساتھ تم ایک ہفتہ میں ہی دیوالیہ نہ بن گئے تو میں بیگم کہلانا چھوڑ دوں گی۔"

"تو پھر میں کیا کروں ڈارلنگ؟ جتنی آمدنی ہے اس سے زیادہ کہاں سے لاؤں؟"

"اپنی آمدنی بڑھاؤ۔" انقلابی بیوی نے نعرہ لگایا۔

"کیسے؟"

رشوت لو، جیب کتری شروع کردو، اسمگل کیا ہوا مال بیچو۔ کوئی پرمٹ لائسنس لے لو۔ ساری دنیا اسی طرح ترقی کر رہی ہے۔"

اور میرا جواب یہ تھا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ گزشتہ ایک سو برس سے جو خاندانی شرافت ہمارے سر پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ میں اسے چند کرسیوں، اناج کے چند دانوں، بنیاینوں اور آلوگوبھی کی خاطر تباہ و برباد نہیں کر سکتا۔

مگر بیگم مصر تھی کہ ہر دور میں اخلاق اور شرافت کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ اخراجات میں کمی کر دینا بزدلی ہے۔ اور بزدل انسان کو کسی معزز بیوی کا خاوند بننے کا کوئی حق نہیں۔ اس لئے میرا یہ مطالبہ مان لو ورنہ جنرل۔ اسٹرائیک کے لئے تیار ہو جاؤ۔

اس نے مجھے بزدل کہا۔ میرے شوہرپن کو مشکوک قرار دیا۔ جنرل اسٹرائیک کی دھمکی دے کر گھر کے مفاد پر ضرب لگانے کا اعلان کیا۔ یہ رویہ سیدھا طلاق کی منزل کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ مگر میں نے بھی تہیہ کر لیا کہ بیوی کو طلاق دے دوں گا خاندانی اخلاق کو نہیں دوں گا۔

چند منٹ کی بحرانی خاموشی کے بعد بولی۔ "تو کیا ارادے ہیں؟"

"مطالبہ رد کیا جاتا ہے۔" میں نے تاریخ انسانیت کا عظیم ترین اعلان کیا۔

"لیکن یہ میرا بنیادی مطالبہ ہے۔ اگر اسے رد کیا گیا تو میں اس پر غور کر دوں گی۔ کہ پہلے دو مطالبے بھی منظور کروں یا نہ کروں؟"

"مجھے یہ چیلنج منظور ہے۔"

اس مرحلے پر آکر سمجھوتے کی بات چیت ٹوٹ گئی۔ مصلحت کے تحت بیگم پلنگ پر جا لیٹی۔ خصلت کے مطابق میں یوں ہی کوئی پرانا رسالہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ گھڑی کی ٹک ٹک ہمارے غم اور مسرت دونوں کو پیچھے چھوڑ کر وقت کی بے نیاز منزلیں طے کرتی رہی۔ میں نے کھانا نہیں کھایا۔ شاید بیگم نے بھی نہیں کھایا۔ اور پھر یوں لگا کہ جیسے ہم دونوں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید ہم اندر ہی اندر روتے روتے سو گئے تھے، کھو گئے تھے۔

اور پھر جب بھوک کے گھڑیال نے دو بجائے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک گرم گرم آنسو میری پیشانی پر آ گرا ہے اور پھر ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز اور نرم و نازک ہاتھوں کا لمس اور چوڑیوں کی مترنم جھنکار

"یہ کون تھا؟"

یہ کوئی ٹریڈ یونین لیڈر تو نہیں تھا۔

یہ کوئی، انقلابی بھی نہیں تھا۔

یہ میری اکلوتی، پہلی اور آخری بیگم تھی! جو کہہ رہی تھی۔

"اٹھو، کھانا کھا لو۔ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔"

سو انار ایک بیمار

میں کئی برس سے بے حد شرمندہ تھا۔ کہ مجھے کوئی سیریس بیماری لاحق نہیں ہوتی تھی۔ ہونے لگتی تو نزلہ زکام میں بدل جاتی یا سر درد یا پیٹ درد میں۔ احباب اور رشتے دار طعنے دیتے کہ ان غیر ضروری بیماریوں پر آپ سے کوئی کیا ہمدردی کرے میری بیوی تو کنائے اشارے سے کئی بار کہہ چکی تھی کہ میں آپ کی خاطر مر مٹنے کے لئے بھی تیار ہوں۔ لیکن مر مٹنے کی کوئی ٹھوس بنیاد بھی تو ہو۔

اور نجانے کس کی دعا قبول ہوئی۔ کہ ایک صبح شیو کر کے اٹھا تو اچانک لغزش پائے پکارا: "لینا کہ چلا میں"۔ میری بیوی جو اس نادر لمحے کے انتظار میں ادھیڑ ہو گئی تھی ڈاکٹر کو بلا لائی۔ جس نے کہا۔ "یہ بیماری سیریس ہے۔"

بیوی نے بے ساختہ کہا: "ہائے یہ بیماری مجھے لگ جائے۔"

ڈاکٹر بولا۔ "یہ متنازعہ مسئلہ ہے۔ ہسپتال میں جا کر فیصلہ ہوگا۔"

چند منٹ بعد احباب اور رشتہ دار جمع ہو گئے اور اللہ تعالے کا شکر ادا کیا کہ اب فکر تونسوی راہ راست پر چل پڑا ہے۔ ان کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو بھر گئے۔ میری بیوی نے جذبات سے کانپتے لفظوں میں اعلان کیا کہ وہ میرے غسل صحت پر یتیموں کو کھانا کھلائے گی۔ ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے بتایا۔ ممکن ہے بحالی صحت پر کئی سال لگ جائیں۔

کئی سال۔ مجھے یتیموں کا مستقبل بے حد تاریک نظر آیا۔
ہسپتال کے بیڈ پر لیٹے ہی میں فخر سے پھولا نہیں سمایا۔ کہ اب سیریس بیماری کی بدولت کئی لوگوں پر احسان کر سکوں گا۔ اور مجھ سے ہمدردی کا فراخدلانہ استعمال کر سکیں گے انھیں ٹھنڈی آہیں بھرنے اور آنسو بہانے کا نادر موقع مل جائے گا۔ اور وہ میری ایک جنبش لب پر گردنیں کٹوانے پر بھی تیار ہو جائیں گے۔ میری بیوی ہر پرسان حال کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہہ سکے گی۔ کہ

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

مجھے خوشی یہ تھی کہ زندگی میں کسی کے کام تو آیا۔ ورنہ آج تک زندگی بالکل ریگستان بنی رہی تھی۔ نہ آنسو نہ تبسم نہ خلوص۔ نہ کسی کا امتحان نہ کوئی ممتحن!

ایک دوست نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ بولا ہسپتال کا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ میرے کالج کا ساتھی ہے۔ مجھ سے میتھیمٹکس کی گائیڈ بک مانگ کر لے جایا کرتا تھا۔ چنانچہ اسے ٹیلی فون کیا۔ کہ ہمارے مریض کو فوراً بیڈ دیا جائے۔ ہسپتال میں بیڈ میسر آنے کا مطلب ہے۔ جیسے کسی بے روزگار کو اپائنٹمنٹ لیٹر مل جائے۔ ایک پروفیسر دوست نے تبصرہ کیا۔ "ابھی بیڈ کیوں نہ ملتا۔ فکر صاحب کی رسائی تو منسٹروں تک ہے۔"

اور مجھے منسٹروں کی بے بسی پر رحم آگیا۔

بیڈ کے بعد احباب اور رشتے دار بڑے سرگرم ہو گئے۔ چاروں طرف بھاگے بھاگے پھرنے لگے۔ ایک رشتے دار نے انکشاف کیا۔ کہ بلڈ بینک کے انچارج سے میں نے کہہ دیا ہے کہ شکر کیجئے۔ ایک عظیم مریض آپ کے ہسپتال میں داخل ہوا ہے۔ اور دوسرے صاحب نے اطلاع دی۔ کہ اس وارڈ کا انچارج ڈاکٹر میری خالہ کا چچیرا بیٹا ہے۔ اس کی لو میرج سے پہلے کے سبھی لو لیٹر میں نے ہی ڈرافٹ کر کے دیئے تھے۔ ایک دوست نے بیک وقت تین اخباروں میں میرا فوٹو شائع کروا دیا۔ تاکہ میری موت کے

بعد بطور یادگار کام آئیں۔ کافی ہاؤس میں چار پانچ دوستوں نے ریزولیوشن پاس کردیا کہ خدانہ نخواستہ اگر فکر تونسوی انتقال کر گیا تو سارا کافی ہاؤس نہ صرف شمشان بھومی تک جائے گا۔ بلکہ پسماندگان کے لئے چندہ بھی اکٹھا کرے گا۔

احتیاطاً چندے کی اپیل کا مضمون بھی ڈرافٹ کرلیا گیا۔

یہ سرگرمیاں دیکھ کر یوں لگا۔ جیسے سارا ہندوستان میری بیماری کی خاطر زندہ ہے۔ ہر روز کئی ڈاکٹر مجھے لیبارٹری میں لے جاتے اور مجھ پر تجربے شروع کر دیتے جیسے وہ ڈاکٹر نہ ہوں۔ طالب علم ہوں اور میں ایک کاپی ہوں۔ جس پر وہ ہوم ورک کر رہے ہوں۔ میں نے ایک ڈاکٹر سے پوچھا "آپ مجھ پر ریسرچ کیوں کر رہے ہیں۔"

وہ بولے۔ "تاکہ آپ کی وجہ سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچائیں۔"

میں نے کہا۔ "اگر میں بیمار نہ پڑتا تو بنی نوع انسان کا کیا بنتا؟"

اس پر ڈاکٹر نے اسسٹنٹ کو حکم دیا۔ کہ اسے ٹیسٹ ڈیپارٹمنٹ میں لے جاؤ۔ دماغ میں کچھ خلل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میرے دماغ میں خلل نہیں ہے بلکہ مسرت ہے۔ کیونکہ میں نے سن رکھا تھا۔ کہ ہسپتال کا ماحول بے حد رومانٹک ہوتا ہے۔ کئی ادیب تو وہاں جاکر ناول تک لکھتے ہیں۔ اور اپنی بیماری سے ادب عالیہ میں اضافہ کرتے ہیں۔ بلکہ کئی تو نرسوں سے بھی پیار کرنے لگتے ہیں۔ اور وہ نوکری پر لات مارکر ان کے ناول کا ایک پیراگراف بن جاتی ہیں۔

چنانچہ ایک دن میں آنکھیں بند کئے بیڈ پر پڑا تھا۔ کہ چھم سے ایک نرس آئی رومانٹک نہیں تھی، حسین بھی نہیں۔ اس نے میرے بیڈ کے سرہانے میلے گتے پر ایک میڈیکل چارٹ لگا دیا۔ اور چلی گئی۔ اور مجھے یوں لگا۔ جیسے وہ میری قبر پر دیا جلا کر جا رہی ہے۔

اسی طرح جب مجھے بیڈ پر رہائش پذیر ہوتے ہوئے کئی مہینے گذر گئے تو مجھے شک ہونے لگا کہ ڈاکٹر حضرات کو خدمت خلق سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ ان کی حالت اس عورت کی سی ہے۔ جو ہر روز شوہر کے لئے کھانا تیار

کرتی ہے۔ صبح کو ملک ڈپو سے دودھ اور شام کو سبزی لاتی ہے۔ اور اسے گرہستی پن کہتی ہے۔ یوں لگا۔ کہ بڑے ڈاکٹر بھی خدمت خلق سے اکتا چکے ہیں۔ اور جب بھی مریض کے چارٹ یا پھیپھڑے کی رپورٹ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو یوں محسوس کرتے ہیں جیسے آلو چھیل رہے ہوں۔ یا سبزی میں نمک اور مرچ چھڑک رہے ہیں۔ ایک دن میں نے ایک ڈاکٹر سے پوچھا۔ "آپ کے اندر انسانیت کا جذبہ کیوں مر گیا!"

وہ دو دو دن چارٹ کا پہاڑا پڑھتے ہوئے بولا۔ "مہنگائی اور کرپشن کی وجہ سے اب انسانیت تو ایک اچھوت بن کر رہ گئی ہے۔ ہم نوکری کے لئے خدمت کرتے ہیں۔ خدمت کے لئے نوکری نہیں کرتے۔"

یہ سن کر مجھے افسوس ہوا۔ کہ مریض بننا بھی بیکار ہو گیا۔ مریض ہو یا صحت مند ہر جگہ اچھوتوں کی دنیا ہے۔ جو مریض سمجھتا ہے۔ کہ وہ ڈاکٹر کو انسانیت پر مجبور کر دے گا بہتر ہے کہ وہ صحت مند ہی رہے۔ کیونکہ ڈاکٹر بے چارے کے پاس تو اتنی فرصت بھی نہیں ہوتی۔ کہ کسی لیڈی ڈاکٹر پر پیار کی نظر ڈالنے سے پہلے پوچھ لے۔ کہ تمہاری تنخواہ کتنی ہے۔

آہستہ آہستہ میرے پرسان حال غائب ہونا شروع ہو گئے۔ البتہ ہسپتال سے باہر ہر راہ چلتے سے پوچھتے پھرتے "بھائی فکر صاحب کا بیڈ نمبر کونسا ہے؟" اور پوچھنے کے بعد بیڈ نمبر یاد رکھتے، مجھے بھول جاتے۔ اور ایک دن ایسا آیا کہ سبھی پرسان حال نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اور میرے بیڈ کے پاس صرف چند شیشیاں۔ ایک میڈیکل چارٹ۔ اور بیوی رہ گئی۔ شاید احباب بیماری کی طوالت سے بور ہو گئے اور سوچنے لگے کہ زندگی صرف بیماری کے گرد تو نہیں گھومتی۔ کئی اہم کام اور بھی ہیں مثلاً پتنگ اڑانا ہے۔ لڑکیوں کو چھیڑنا ہے۔ پڑوسیوں سے لڑنا ہے۔ اور میں ان میں غیر دلچسپ ہوتا گیا۔ اور محسوس کیا کہ بیماری کو عادت نہیں بنا لینا چاہیئے۔ اتنی بڑی کائنات میں ایک مریض تو مدھم سا نقطہ ہے۔ جس سے کوئی لفظ نہیں بنتا، کوئی لکیر نہیں بنتی۔

بمبئی سے ایک افسانہ نگار دوست نے خط لکھا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ دہلی میں بیمار پڑے ہو۔ جہاں پرسانِ حال مل جاتے ہیں، لیکن میری بدبختی کہ بمبئی میں بسترِ علالت پر پڑا ہوں۔ جہاں پرسانِ حال اس لئے نہیں آتے۔ کیونکہ وہ میری بیماری سے زیادہ اہم کاموں میں مصروف ہیں۔ مثلاً مالک مکان سے تو تو میں میں کر رہے ہیں لوکل ٹرین کا تعاقب کر رہے ہیں۔ بھوک مٹانے کے لئے کچھ وقت کینٹین کا ریٹ پوچھتے رہتے ہیں اور کچھ وقت ٹھنڈی آہیں بھرتے رہتے ہیں۔ چھ ماہ تک پرسانِ حال کا انتظار کرتا رہا کل کسی نے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ تو میں بڑا خوش ہوا کہ دنیا میں ابھی دردمند لوگ موجود ہیں۔ دروازہ کھولا گیا۔ تو نو وارد اندر داخل ہوا۔ یہ میرا پڑوسی تھا۔ بولا۔

"نمسکار کرتا ہوں۔ آپ کے یہاں ایک ضروری ٹیلیفون کرنا تھا۔ اجازت ہو تو کر لوں۔"

بمبئی کے اس خط پر مجھے آبدیدہ ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر اتنے میں تھیٹر کے ایک پروڈیوسر صاحب تشریف لائے مجھے شرمندہ کرتے ہوئے بولے۔ "فکر صاحب! آپ تو بیماری سے چمٹ ہی گئے ہیں۔ میں پوچھنے آیا ہوں کہ جو ڈرامہ آپ ہمارے لئے لکھ رہے تھے۔ اس کے تین سین ابھی باقی ہیں۔ ان کا کیا بنے گا؟"

میں نے کہا۔ "غسلِ صحت کے بعد ہی لکھوں گا۔"

بولے۔ "جلدی جلدی غسل کیجئے۔ ہمارا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ یہ آلو بخارا آپ کے لئے لایا ہوں۔ اسے کھائیے اور سوچئے کہ دورانِ مرض آپ وہ ڈرامہ مکمل نہیں کر سکتے۔"

ایک اور نزدیکی رشتے دار آئے، میڈیکل چارٹ آنکھوں سے لگایا اور بولے "آپ جلدی جلدی "صحت یاب" ہو جائیے۔"

میں نے عرض کیا۔ "آپ کو اتنی کیا جلدی ہے۔"

وہ روہانسے ہو کر بولے۔ "دراصل آپ کی بھتیجی کے بیاہ کا مسئلہ ہے۔ تاریخ

مقرر کر دی ہے۔ کل لگن ہے، کہیں لڑکے والے مکر نہ جائیں۔ مگر آپ کی بیماری کی وجہ سے رکے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا۔ "غلطی میری ہے کہ کل تک میں بیمار رہا۔ آپ بیاہ کر دیجئے میری بیماری پر بھروسہ مت کیجئے۔"

چند دن بعد معلوم ہوا کہ انھوں نے بیاہ کر دیا ہے۔ اور میری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکل سکا۔ جسے شادی کے دعوتی کارڈ پر بہا سکوں۔ البتہ اتنا ضرور کیا کہ ہسپتال کے قواعد توڑ کر گھر آگیا۔ پرسانِ حال کے بھروسے پر کوئی کب تک بیمار رہتا چلا جائے۔

گھر آ کر ایک رشتہ دار کا پیام ملا۔ کہ میں ہسپتال میں، اس لئے حاضر نہیں ہو سکا۔ کیونکہ میرا بیٹا جوئے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ایک دوست نے چٹ بھجوائی کہ میں صرف تمھیں صحت مند حالت میں دیکھ سکتا تھا۔ بیماری کے عالم میں نہیں۔ اس لئے پرسش کو نہیں آیا۔ ایک اور دوست سے کافی ہاؤس میں ملاقات ہوئی۔ ہنس کر بولے "اتنا تو ضرور سنا تھا کہ تم بیمار ہو۔ لیکن میں سمجھا۔ مذاق کرنا تمہاری عادت ہے۔ بیماری سے بھی تم نے مذاق ہی کیا ہوگا۔"

اس کے بعد میں ہر رشتے دار اور دوست کے گھر جا کر پیام دے آیا۔ کہ میں ابھی تک بیمار ہوں۔ اس لئے موقع غنیمت ہے۔ آ کر پوچھ جاؤ۔" ایک دوست آئے شکایت کرنے لگے۔ کہ میں ہسپتال میں ہڈیاں جوڑنے والے وارڈ میں تمھیں ڈھونڈتا پھرا۔ تم ملے ہی نہیں۔ کم از کم یہ تو بتا دیتے۔ کہ آپ کی ہڈی نہیں ٹوٹی۔ اعصابی نظام ٹوٹا ہے۔

میں نے معافی مانگی اور وعدہ کیا۔ کہ آئندہ موقعہ ملا تو ہڈی ہی تڑوا دونگا اور پھر یوں ہسپتال سے باہر آ کر میں نے محسوس کہ دنیا ویسی کی ویسی ہے کسی کو کسی کی خبر نہیں۔ ہر آدمی ایک دوسرے کے سامنے قہقہے لگانے میں مصروف ہے۔ کون مر گیا۔ کس کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ کس کی آنکھ پھوٹ گئی۔ اس سے بے نیاز دنیا کا

ہر آدمی اپنی ہی چند سانسیں گننے میں مصروف ہے۔ اور پھر انھوں نے مجھے اپنے آپ میں یوں کھپا لیا۔ جیسے میں بیمار نہیں ہوں، جیسے میں کبھی بیمار نہیں ہوا تھا۔ البتہ ایک دوست زیادہ مہربان نکلے مجھے اپنے گھر لے گئے اور بولے۔ "تم آج تک غلط دوائیاں استعمال کرتے رہے۔ یہ لو شیشی اسے استعمال کرو تیر بہدف ہے۔"

"آپ نے یہ ڈاکٹری کب سے سیکھی" میں نے پوچھا۔

"اپنے نانا جان سے۔ وہ بھی اس بیماری میں انتقال کر گئے تھے"

ور کے لئے کنیا کی ضرورت

یہ اشتہار ہمیں آج سے دس سال پہلے دینا چاہیئے تھا۔ لیکن ان دنوں ور یعنی برخوردار علمی چند "دنیا کے عظیم ہیرو" نامی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا اور کہتا تھا۔ "جب تک لائبریری میں یہ کتاب موجود ہے میں شادی نہیں کراؤں گا"

اور اب جب کہ ہم یہ اشتہار دے رہے ہیں۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ بلکہ لائبریری میں اس کا تازہ ایڈیشن بھی آ گیا ہے۔ مگر اس کے باوجود برخوردار علمی چند شادی پر آمادہ ہو گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اسے رات کو ڈراؤنے خواب آنے لگے ہیں بلکہ کئی بار تو خواب میں آسمان پر اڑتے اڑتے بحر اوقیانوس میں جا گرا ہے۔

برخوردار علمی چند کا قد ٹھگنا ہے اس لئے وہ بلند خیالات کا مالک ہے۔ اونچے پایہ کے استادوں میں بیٹھ کر بتاتا ہے کہ ہمارے اندر کون کون سی خرابیاں ہیں۔ علمی چند میں یہ بلند خیالی ان دنوں پیدا ہوئی، جن دنوں فوٹوگرافروں نے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا تھا کہ فوٹو کھنچواتے وقت مسکراتا ضرور چاہیئے۔ دراصل وہ ہندوستان کی بیداری کا زمانہ تھا۔ ہر ہندوستانی کو شک گزرتا تھا۔ کہ ہندوستان بیدار ہو رہا ہے۔ لیکن شرم اور ڈر کے مارے کوئی کسی کو بتاتا نہیں تھا۔ مگر علمی چند نڈر تھا۔ ——— وہ بالا جھجک ہندوستان کی

بیداری کا اظہار کر دیا کرتا بلکہ اس بیداری کے سلسلے میں یہاں تک کہہ دیتا کہ میرا باپ نہایت رذیل اور لالچی بڈھا ہے۔ جو میری شادی کروا کر ہندوستان کا مستقبل تباہ کرنا چاہتا ہے۔

غرض ان دنوں علی چند کے خیالات بے حد انقلابی تھے۔ اور اس کی باتیں سن سن کر وہی لطف آتا تھا جو شیو کرنے کے بعد رخساروں پہ ہاتھ پھیرنے سے آتا ہے۔

باوجود کوتاہ قامتی کے علی چند ایک با اصول انسان ہے۔ (ہے نہیں ـــــ تھا) مثلاً اس کا فارمولا تھا۔ کہ اگر شادی کے بغیر تخلیق آدم پر حرف آتا ہو تو پھر کنیا ایسی لینی چاہیے جس کا قد، مجھ سے ایک فٹ کم ہو ـــــ لیکن بعد کی تحقیق و تفتیش سے معلوم ہوا۔ کہ علی چند سے ایک فٹ چھوٹے قد کی کنیا دنیا میں نایاب ہے۔ دو چار ایسی کنیائیں دستیاب ضرور ہوئی تھیں۔ لیکن بقول علی چند وہ "پرسنیلیٹی" سے محروم تھیں۔ حسن کے ان اصولوں پہ پوری نہیں اترتی تھیں، جس کا ذکر شاستروں اور وید منتروں میں آیا ہے۔

مگر اب علی چند کا اصول ہے کہ اصول نسبتاً لچکیلے ہونے چاہئیں۔ جن شاستروں اور وید منتروں میں علی چند کے قد کا ذکر نہیں آیا۔ وہ ماڈرن سوشل سائنس کے تقاضوں پر پورے نہیں اترتے۔ اس لئے ماڈرن سوشل سائنس کی روشنی میں ہم ایسی کنیا بھی قبول کرلیں گے۔ جس کا قد علی چند کے قد کے برابر ہو۔ اس سے کم یا زیادہ نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ اصول کو اتنا زیادہ لچکیلا بھی نہیں بنایا جا سکتا۔

شادی کے متعلق برخوردار علی چند کے کچھ اور اصول بھی تھے، جو اسے یوں مرغوب تھے جیسے اسے اپنی تصویر کا پرانا فریم اور جامع مسجد کے کباب مرغوب تھے، لیکن جب مارکیٹ میں جدید ڈیزائن کے خوبصورت فریم آگئے اور جامع مسجد کے کباب مہنگے ہو گئے تو علی چند رو دیا ـــــ اور اس کے آنسوؤں میں تمام اصول دھندلا گئے۔ اور آج صرف ان کی یاد باقی ہے۔ ان کی دھند باقی ہے۔ ان کے نشاں باقی ہے۔ اور نشاں کا کوئی اصول نہیں ہوتا۔

اشتہار دیتے وقت علی چند چالیس کے پیٹے میں ہے۔ اس کے کچھ بال سفید

ہو چکے ہیں اور کچھ بال اُڑ چکے ہیں ۔ جونہی اس کی کوئی محبوبہ شادی کرتی ۔ علمی چند کے کچھ بال یا تو اُڑ جاتے یا سفید ہو جاتے ۔ اور اب اُس کے اندر ایک ایسی فسردگی آ چکی ہے ، جیسے شادی کے دس سال بعد کسی خاوند میں آ جاتی ہے خاوند کی سی فسردگی پاکر اب وہ خاوند بھی بن جانا چاہتا ہے ۔ اور یہ بھی چاہتا ہے کہ جس کنیا سے بیاہ کرے ، وہ کم از کم اس کی حسرتوں کی داد ضرور دے ، وہ کم از کم یہ ضرور محسوس کرے کہ اس قبر کے نیچے کتنا عظیم الشان مردہ دفن ہے ۔

علمی چند تعلیم یافتہ آدمی ہے ۔ اور ایم ۔ اے میں دو مرتبہ فیل ہو چکا ہے ۔ ایک مرتبہ تو وہ اس لئے فیل ہو گیا تھا کیونکہ وہ اپنی ایک کلاس فیلو لڑکی سے رومانس کر رہا تھا ۔ فیل ہونے کی وجہ بعد میں صحیح نہیں نکلی ۔ کیونکہ وہ لڑکی ایم اے میں پاس ہو گئی تھی ۔ یہ نہیں ہوتا کہ ممتحن ایک کو فیل کر دے اور دوسرے کو پاس ۔ محبت سچی ہو تو اُس کے اثرات یکساں ہوتے ہیں ——— لیکن علمی چند کا بیان ہے کہ وہ لڑکی چونکہ بیوہ تھی ، اس لئے دُور اندیش تھی ۔ اور وہ بیک وقت محبت بھی کرتی تھی اور پڑھائی بھی ——— بہرکیف کچھ بھی تھا علمی چند اور اُس لڑکی میں بالآخر صرف دو فقروں کا تبادلہ ہوا اور محبت ٹوٹ گئی ۔

"ڈیر شوبھا ! کچھ دنوں سے تمہارا رویہ محبوبانہ نہیں رہا ۔"

"ڈیئر علمی ! محبوبیت ہم دونوں میں شاید تھی بھی نہیں"

اور برخوردار علمی چند دوسری مرتبہ اس لئے فیل ہو گئے تھے ، کیونکہ اس بار بہت سے اور بھی لڑکے فیل ہو گئے تھے ۔ مگر کنبہ نے اُس کے دوسری بار فیل ہونے کو زیادہ اہمیت نہیں دی ۔ بلکہ صرف اتنا کہا کہ اب علمی چند کو شادی اور ایم ۔ اے کے امتحان ، دونوں میں سے ایک چیز کا فوری انتخاب کر لینا چاہیئے ۔

برخوردار علمی چند بظاہر کھلتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہے ۔ (گھر میں دو چراغ اور بھی ہیں) اُس کے والد صاحب جناب فاضل چند جی ، جن سے برخوردار

علمی چند کو شدید نفرت ہے، سوسائٹی کے معزز فرد ہیں۔ اُن کی بیوی اُن کے سامنے بچوں کی طرح کانپتی ہے۔ کانپنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ فاضل چند جی کے پاس پچاس ہزار روپے کی جائداد ہے اور جائداد کے تلذذ سے نہ بیٹا محروم رہنا چاہتا ہے نہ ماں۔ اس لئے دونوں فاضل چند جی کے ستم سہتے ہیں اور دبک کر رہتے ہیں ـــــ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ علمی چند نے ایک صاحب کو اپنے والد کے ہاں بھیجا۔ تاکہ اُن سے ایک لڑکی (محبوبہ) کے رشتے کی بات چیت چلائے مگر فاضل چند جی نے ان صاحب کو جھڑک کر کہا تھا۔ "علمی چند نام کا کوئی لڑکا میرے گھر میں نہیں رہتا۔ بھاگ جائیے ......"

چنانچہ علمی چند کے کیریکٹر کی تعمیر و تخریب میں باپ کی سخت گیری اور ماں کی مظلوم نرمی دونوں کا ہاتھ ہے۔ فاضل چند جی باپ کو گالیاں دیتے ہیں اور ماں روپے دیتی ہے ـــ اگر سوسائٹی میں فاضل چند جی کی عزت نہ ہوتی تو وہ ماں بیٹا دونوں کو خانہ بدر کردیتے۔ مگر سوسائٹی کسی عزت دار آدمی کو ایسا نہیں کرنے دیتی۔ لہٰذا فاضل چند جی مجبور ہیں۔ کہ وہ علمی چند کی نفرت کے باوجود اُسے ہی جائداد کا وارث بنائیں ـــ فاضل چند جی اتنے بیوقوف نہیں ہیں کہ صرف بیٹے سے نفرت کی خاطر اپنی جائداد کسی دھارمک سنستھا کو دان میں دے دیں۔

لہٰذا جس کنیا سے علمی چند کا بیاہ ہوگا وہ ایک صاحب جائداد خاوند کی بیوی کہلائے گی۔ کیونکہ علمی چند اب اپنے انقلابی خیالات کی اُس منزل پر پہنچ چکا ہے، کہ وہ اپنے باپ کی پچاس ہزار روپے کی جائداد کو ٹھکرائے گا نہیں بلکہ یوں قبول کرے گا جیسے رام بن باس کے وقت بھرت نے ایودھیا کی گدّی قبول کرلی تھی۔

اس جائداد کے علاوہ۔ اگر کنیا چاہے تو گھر سے جہیز لاکر اس میں اضافہ بھی کرسکتی ہے۔ اگرچہ علمی چند جہیز کا قائل نہیں ہے۔ لیکن اگر کنیا کی شکل و صورت اچھی نہ ہو تو وہ جہیز لانے میں بھی برائی نہیں سمجھتا ـــ البتہ

اس کے والد فاضل چند جی کا خیال ہے کہ جہیز کا تعلق حسن سے نہیں، عزت سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حسین بہو کو بھی جہیز لانا چاہیئے۔ کیونکہ بہو کے ہونٹ چاہے کتنے ہی گلابی کیوں نہ ہوں۔ اگر جہیز نہیں لائے گی تو ان ہونٹوں پر کوئی بوسہ محبت ثبت نہیں ہو سکے گا۔

بہرکیف ہمیں ایک ایسی کنیا کی ضرورت ہے جو فاضل چند جی اور علمی چند دونوں کے خیالات کا نچوڑ ہو ــــ اور اگر کوئی ایسی کنیا مادرِ گیتی نے پیدا نہیں کی تو کوئی ایسی کنیا بھی قبول کر لی جائے گی جو علمی چند کی طرح یادِ محبوب میں ابھی تک کنواری بیٹھی ہو۔

برخوردار علمی چند کا معیارِ حسن کیا ہے۔؟ اس کے متعلق خود علمی چند اپنے آپ سے اختلاف رائے رکھتا ہے۔ مثلاً وہ بڑی بڑی غلافی آنکھوں کو پسند کرتا ہے۔ لیکن غلافی آنکھوں والی لڑکی کی کمر موٹی نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ پتلی کمر پر علمی چند کو کئی شعر بہت زیادہ پسند ہیں، لیکن فطرت کسی کی شادی کے حساب سے تو کمر نہیں بناتی۔ فطرت تو ڈکٹیٹر ہے۔ سوشل ریفارمر نہیں ہے۔ کہ غلافی آنکھوں اور کمر میں ترمیم و تنسیخ کر کے سماجی برائیاں دور کرتی رہے ــــــ لہٰذا علمی چند فطرت اور موٹی کمر دونوں سے نالاں ہے۔

دوسری طرف ــــــــــ علمی چند چاہتا ہے کہ لڑکی شرمیلی ہو۔ اور جب بات کرے۔ تو اس کے خوبصورت ہونٹ فرطِ حیا سے تھرتھرانے لگیں۔ لیکن فرطِ حیا والے کئی ہونٹ علمی چند نے دیکھے ہیں۔ کہ فلسفہ اور دینیات پر بحث نہیں کر سکتے۔ لڑکی ایک فقرہ بولتی ہے تو ہزار بار ساڑھی کا پلو چباتی ہے۔ ایک بار علمی چند نے اپنی ایک محبوبہ سے کہا تھا "نیلی! فلسفی سپائی نوزا کی اخلاقیات سے مجھے بہت بیر ہے۔ اس شخص کی لغاوت میں سے ایک بچے کی بُو آتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

اور نیلم نے فرطِ حیا سے ہونٹ تھرتھرا کر کہا تھا "مجھے خود بچے پسند نہیں ہیں۔ شادی کا مطلب بچے بالکل نہیں ہیں ڈیئر!"

مگر علمی چند ابھی تک ہندوستان کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا۔ اس کا خیال ہے کہ فطرت ایک نہ ایک دن سپائی نوز اور تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کو ضرور یکجا کر دے گی۔ لیکن فی الحال وہ کسی بھی ایسی لڑکی سے بیاہ کرے گا۔ جس کے صرف ہونٹ ہی تھرتھراتے ہوں۔ سپائی نوز کا بارٹ وہ خود ادا کرے گا۔

لڑکی تعلیم یافتہ ہونی چاہیئے یا نہیں۔ اگر ہونی چاہیئے تو کس حد تک؟ اس کے متعلق ہماری کوئی آزادانہ رائے نہیں ہے، سماج کی رائے ہی ہماری رائے ہے۔ بزرگوں کی کیا رائے ہے، اس پر سماج میں بھی اختلاف رائے ہے۔ علمی چند کہتا ہے کہ جو لڑکی غالبؔ کا شعر صحیح صحیح پڑھ سکے مگر سمجھ نہ سکے وہ مجھے پسند ہے۔ مگر علمی چند کی ماں کہتی ہے کہ جو بہو خاوند کی قمیص کے بٹن ٹانک سکے بڑی سوشیل کنیا ہے۔ اور اگر غالبؔ کے اشعار میں بٹن ٹانکنے کی تعلیم دی گئی ہے تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔ مگر محترم فاضل چند جی کا خیال ہے کہ کنیا کو اتنی تعلیم ہرگز نہ دلائی جائے کہ کسی بھی وقت دفتر میں نوکری کر لینے کی دھمکی دینے لگے۔

بہرکیف اس بات پر سارا سماج متفق ہے کہ کنیا اچھے درجے کم تعلیم یافتہ ہو تاکہ گھر میں امن قائم رہے۔ حد سے زیادہ تعلیم مہلک ہے۔ اور ایسے مہلک امراض پیدا کرتی ہے جن کا بعد میں علاج ممکن نہیں۔ اس لئے کم تعلیم ہی بہتر ہے۔ علاج سے پرہیز بہتر ہے۔

البتہ اگر کنیا خوبصورت ہو، سڈول ہو اور پڈنگ بھی اچھا بنا سکتی ہو، تو یہ ضروری نہیں کہ وہ غالبؔ کے اشعار بھی پڑھ سکے۔ ایسی صورت میں غالبؔ والی شرط اڑائی جا سکتی ہے، کیونکہ غالبؔ تو دراصل پڈنگ کا نعم البدل ہے۔

اس کے علاوہ ہم کنیا کے لئے چند عام فہم شرطیں بھی عرض کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی شرطیں جن کے بغیر کوئی بیوی، بیوی نہیں کہلاتی۔ خاوند لگتی ہے۔ مثلاً سگھڑ ہو یعنی جو چیز جہاں سے اٹھائے اپنی مقررہ جگہ پر رکھا ہوا مل جائے، نہ کہ چوہوں کے بل سے برآمد کرنا پڑے۔ وفا شعار ہو یعنی

اگر خاوند کے سر میں درد ہو تو بیوی کا معدہ خراب ہو جائے، پڑوسنوں سے ڈپلومیٹک تعلقات رکھے کیونکہ ان سے کئی بار آٹا اور کوئلہ عارضاً لینا پڑتا ہے، کفایت شعار ہو، مگر خاوند کے اخراجات پر اعتراض نہ کرے، کیونکہ خاوند لوگ بڑے ذکی الحس ہوتے ہیں، اور شدتِ جذبات میں گھر آنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اور برخوردار علمی چند تو اتنا حساس ہے، کہ شاید ترکِ وطن ہی کر جائے۔

کھانا نہایت نفیس پکا سکتی ہو اگرچہ گھر میں عام طور پر دال بھاجی ہی پکے گی مغل شہنشاہوں کے باورچی دال میں بھی کمال کر دکھاتے تھے، کپڑے دھو سکتی ہو، کبھی کبھی گنگنا بھی سکتی ہو، سہیلیوں میں بیٹھ کر علمی چند کی مقبولیت کی ہوا باندھ سکتی ہو، فلم دیکھ علمی چند سے رومانس کر سکے، جیسے سنگترے کی پھانکیں چھیل کر منہ میں دینا اور اس کے سر کے سفید بال نہایت پیار سے نکالنا اور عشوہ سے کہنا "جاؤ بھی ہمیں یہ بال اچھے نہیں لگتے"

اشتہار ختم کرنے سے پہلے ہم ایک آخری استدعا کرنا چاہتے ہیں، کہ متذکرہ بالا تمام تشریحات اور شرائط صرف علمی چند کے پس منظر کے طور پر دی گئی ہیں۔ اس لئے کنیا کے والدین انھیں نظر انداز بھی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ اشتہار خلوصِ نیت سے دیا گیا ہے یعنی ہم واقعی علمی چند کی کہیں نہ کہیں شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ علمی چند کی اب یہ حالت ہو گئی ہے، جیسے کوئی آدمی دن بھر گھر سے میں بیٹھے بیٹھے اوب گیا ہو، علمی چند کے پاس جو کچھ اپنا تھا وہ اسی کا صرف پس منظر تھا۔ اور اب اس کے پاس اپنا کچھ نہیں رہا۔ جو کچھ باقی ہے، سماج کا ہے۔ علمی چند کے تمام خیالات اپنے ٹرمینس پر پہنچ چکے ہیں۔ اور اب وہ بالکل شانت ہے۔ یہ خیالات اس کے دشمن تھے۔ اور اب یوں لگتا ہے، جیسے کوئی اپنے دشمن کو قتل کر کے اس کی لاش پر بیٹھا سسکیاں بھرتے بھرتے سو گیا ہو۔

اس لئے موجودہ صورتِ حالات میں ہمیں ایک ایسی کنیا چاہیئے جو صرف کنیا ہو، کنیا ہونا ہی کافی ہے۔ باقی تمام باتیں خلفشار ہیں ——— لڑکی جب گھر آئے گی تو بالکل اسی طرح گھر میں ڈھل جائے گی، جیسے آج تک ہندوستان کی ہر لڑکی ڈھلتی چلی آئی ہے۔ اور اگر اشتہار میں کسی کو ہماری مردانہ نخوت کی بو آئے تو اُسے صرف اشتہار کی ڈرافٹنگ کا نقص سمجھنا چاہیئے اور کچھ نہیں۔ ——— ٥

میں مالک مکان بنا

اور آخر بیوی کے اصرار پر میں نے وہ ڈیڑھ کمرہ کرائے پر اٹھا دیا۔ اس سے اگرچہ خاندان کی روایت ٹوٹ گئی۔ لیکن بیوی نے نئی روایت قائم کردی۔ شادی کے بعد خاندان کی حیثیت بیوی کے مقابلے پر سیکنڈری ہو جاتی ہے۔

یہ ڈیڑھ کمرہ میری مناسب ضروریات سے زیادہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کا مصرف یہ تھا کہ میرا بڑا لڑکا کبھی کبھی اس میں گھس جاتا اور اپنی محبوبہ کے لو لیٹر پڑھا کرتا تھا یا اس کے ایک تاریک گوشے میں کچھ خستہ قسم کی خاندانی دستاویزات پڑی رہتی تھیں جن کا میں خواہ مخواہ احترام کیے جا رہا تھا۔

میری ٹریجڈی یہ تھی کہ میں انسانیت کو کرایے داروں اور مالک مکانوں میں تقسیم کرنا نہیں چاہتا۔ یہ میرا اصول ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے متعلق میری معلومات کافی ناقص تھیں۔ لیکن میرا خیال ہے اصول کا معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

میرے کرایہ دار کا نام گجانند تھا۔ جو اگرچہ نامعقول نام تھا۔ لیکن چونکہ وہ منسٹر کا سفارشی خط لایا تھا۔ اس لیے مجبوراً میں نے کہا۔ "گجانند جی! منسٹر تو سفارشی خط لکھ کر اپنا سوشلزم کا گزارا کر لیتے ہیں۔ مگر آپ کرایہ دار بن کر کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ جو بے حد مانوس تھی، اور بولا "جناب! مجھے جیوتشی نے بتایا ہے کہ اس جنم میں تم مالک مکان نہیں بن سکتے۔ صرف اگلے جنم میں چانس ہے۔"

جواب میں معصومیت تھی ——— جو مجھے پسند آئی۔ مصیبت یہ ہے کہ معصوم انسانیت کے راستے میں جیوتشی حائل ہیں۔ گجانند کے لہجے میں جو سادگی اور پاکیزگی

تھی اس کی بنا پر میں نے پوچھا۔
"بھائی جان! آپ اتنے شریف اور مہذب کیوں ہیں؟"
وہ جھٹ بول اٹھا "یہ خاندانی وراثت ہے، اس میں میرا کوئی دوش نہیں جناب!"

عجیب بات ہے۔ کئی ماں باپ ورثے میں مکان چھوڑ جاتے ہیں۔ اور کئی صرف شرافت اور تہذیب ——— میں نے اُسے سمجھایا۔
"گجانند جی! دراصل کمرہ تو ایک ہی ہے، مگر میری بیوی نے ایک چق لگا کر اسے ڈیڑھ کمرہ بنا رکھا ہے تاکہ ڈیوڑھا کرایہ وصول کر سکے اور شرفاء کے لئے صرف ایک کمرے میں رہنا غیر موزوں ہے۔"
اور جواب میں اُس نے جیسے میری ساری فلاسفی کی توہین کر دی اور کہا۔
"اوّل تو مجھے شرفاء میں شمار نہ کیجئے اور اگر آپ شمار کرتے بھی ہیں تو اُس کا انکشاف دوسروں پر نہ کریں۔" اس کے علاوہ گجانند نے میری بیوی کا ذکر اپنے ورثے سے بھی زیادہ احترام کے ساتھ کر دیا کہ وہ بے حد معقول خاتون ہیں۔
اور میں بیوی کی معقولیت سے گھبرا گیا اور وہ ڈیڑھ کمرہ گجانند کے حوالے کر دیا۔

تین مہینے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے گجانند اُس ڈیڑھ کمرہ کو جنّت سمجھ کر رہ رہا ہے۔ وہ اتنا مرنجاں مرنج نکلا کہ محلّے کے پانچ سات چوہے تک نقل مکانی کر کے جنّت میں گھس گئے۔ شرفاء کی یہی ٹریجڈی ہوتی ہے کہ وہ چوہے اور انسان میں کوئی امتیاز نہیں برت سکتے۔
ایک دن محلّے کے تین چار معزز لوگ میرے پاس تشریف لائے، میرا مطلب ہے لباس سے وہ معزز معلوم ہوتے تھے۔ ایک نے کہا۔
"مبارک ہو فکر صاحب! آپ اب مالک مکان بن گئے ہیں!"
دوسرے نے وضاحت کی "جب تک کرایہ دار نہیں آیا تھا آپ مالک مکان

کہلانے کے مستحق نہیں ہوئے تھے۔"

تیسرے نے کہا۔ "یعنی اب آپ میں ایک مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔"

چوتھے نے ایک فارم میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

" اور اب آپ ہماری محلہ رنگ پورہ مالک مکان ایسوسی ایشن کے معزز ممبر بن جائیے!"

میں نے اپنے علم میں اضافہ کرنے کی غرض سے پوچھا۔

" اس ایسوسی ایشن کے جنم کا کوئی معقول یا نامعقول مقصد؟"

وہ بولے۔" بات یہ ہے جی! کہ یہ کرایہ دار لوگ بڑے بدمعاش ہوتے ہیں"

" یعنی میرا کرایہ دار بھی بدمعاش ہے۔"؟

" نہیں ہے تو ہو جائے گا۔ اسی لئے ہم مالک مکان آپس میں بھائی چارہ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور آج سے آپ ہمارے بھائی ہیں۔"

میرا جی چاہا، انھیں کہہ دوں۔ کسی منسٹر کی سفارش لائیے، جب آپ کا بھائی بنوں گا۔ لیکن یہ شرط بھونڈی معلوم ہوئی کیونکہ اسے معززین آسانی سے پوری کر سکتے تھے آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیئے۔ اگرچہ دستخط کے بعد اپنی حرکت پر بہت تعجب ہوا۔ چند دن پہلے میں نے گجانند کو بھی اپنا بھائی کہا تھا۔ اب مکان مالکوں کا بھی بھائی بن گیا ہوں۔ یہ دو متضاد قسم کے بھائی ...... ؟ لیکن پھر سوچا۔ اس دنیا میں بھی انسان بھائی بھائی ہوتے ہیں۔

اسی شام گجانند سے اطلاعاً عرض کر دیا کہ آج سے آپ بھائی صاحب نہیں ہیں۔ بلکہ کرایہ دار ہیں۔"

اور گجانند نے کہا " چھوڑیئے جی! آپ تو مذاق کرتے ہیں۔"

لیکن میں مذاق نہیں کر رہا تھا۔ بہت سیریس تھا۔ ایسوسی ایشن کا (معزز) ممبر بن جانے سے میری ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں، اس لئے میں دن رات اس ٹوہ میں رہنے لگا کہ گجانند کے کمرے سے کوئی آواز اٹھے، در میں جھٹ بھاڑ دوں

فرش پر پلنگ گھسیٹنے کی آواز ، رات کو دیر سے آنے کی آواز ، چوہوں کے گلاس توڑنے کی آواز ، مہنگائی کے خلاف، گالیوں کی آواز ، یہاں تک کہ اُس کے بچوں کے رونے کی آواز بھی آئے تو میں للکار کر کہوں ۔

" گجانند ! اپنے بچوں سے کہدو رونا بند کردیں ! کیونکہ اس سے میرے بچوں کو معلوم ہو جائے گا کہ انسان روتے بھی ہیں ۔ اور یوں میرے بچوں کا مستقبل تباہ ہو جائے گا ۔

لیکن ایسی کوئی آواز شاید گجانند کے نصیب میں نہیں لکھی تھی ۔ ایسوسی ایشن کے معزز عہدیدار وقتاً فوقتاً میرے یہاں وزٹ کرتے رہے اور مجھے بتاتے رہے کہ گجانند سے کون کون سی بدمعاشیوں کے امکانات روشن ہیں اور اُن امکانات کا سدِ باب کرنے کے لئے تھانے کب جانا چاہیئے ۔ گالیاں کب دینی چاہیئں ۔ پالتو کتا کب چھوڑنا چاہیئے ۔ اور غنڈے بلاکر انھیں شراب کب اور کیوں پلانی چاہیئے ۔ بلکہ ایک معزز عہدیدار کو تو اس بات پر بہت حیرت ہوئی کہ کرایہ دار کی وجہ سے ابھی تک آپ کی آتما کی شانتی میں خلل نہیں پڑا ؟

میں نے اعتراف کیا کہ میری آتما میں کوئی نقص ہے ۔

ایک دن ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ جن کی شکل بھونڈی اور لباس حسین تھا تشریف لائے اور جیسے مجھ سے رازدارانہ لہجے میں ہمدردی کرنے لگے " نگر صاحب ! ایسوسی ایشن کے معززین میں آپ کی قدر و منزلت کچھ کم ہو رہی ہے ۔ بلکہ کئی ایک تو (معاف کیجیے) آپ کی نیت پر بھی شک کرنے لگے ہیں کہ آپ کی وجہ سے آپ کے کرایہ دار کے حوصلے بلند ہو گئے ہیں ۔ جن کا اثر اُن کے اپنے کرایہ داروں پر پڑ رہا ہے ۔

میں نے عرض کیا " مگر پریذیڈنٹ صاحب ! اسے میری ٹریجڈی ہی سمجھیے کہ گجانند شریف اور مہذب انسان ہے "

وہ بولے ـــ " یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا ۔ کرایہ دار مہذب ہوتے ہی نہیں ! "

" مگر وہ کوئی غیر مہذبانہ حرکت نہیں کرتا ۔ "

"کیسے نہیں کرتا ــــ ؟ اچھا بتایئے ، غسل خانے میں جا کر گنگناتا ہے کہ نہیں ؟"

"اوں ہوں ــ"

"بڑا ڈل کرایہ دار ہے ۔ آپ کرایہ دار بدل دیکھئے !"

"ورنہ ؟"

"ورنہ معززین آپ کا سوشل بائیکاٹ کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں "

"یہ صریحاً دھمکی تھی مگر خاندانی ورثے کے باعث میں اس دھمکی کو چیلنج دینے کے اہل نہیں رہا تھا ۔ اس لئے سوچ سوچ کر میں نے گھیانند کے خلاف ڈائرکٹ ایکشن کا فیصلہ کر لیا اور بازار سے گالیوں کی ایک کتاب لے آیا اور ساری رات اس کی سٹڈی کرتا رہا ۔

اور دوسری صبح کو اپنے نتھنے پھیلا کر گھیانند کے پاس پہنچ گیا اور کہا ۔

" تم انسان نہیں ہو ــ اُلو ہو !"

وہ حیران ہوا ۔ جس سے مجھے خوشی ہوئی ۔

" اور میں اس اُلو سے پوچھتا ہوں ــــ یہ کھڑکی کا شیشہ کس اُلو کے پٹھے نے توڑا ؟"

" آپ کے چھوٹے صاحب زادے نے سہواً ایک ڈھیلہ عرض کر دیا ۔"

" تو نالائق ! تم نے اس کے باپ کو فحش گالیاں کیوں نہیں دیں ؟"

" اجی ، میں نے سوچا ۔ بچے سب کے برابر ہوتے ہیں ۔ اگر میرا بچہ ڈھیلہ مار دیتا تو ..... "

مجھے بہت طیش آیا ۔ گویا اب یہ بچوں کی ولدیت کو کنفیوز کر رہا ہے ۔ بچے سب کے بچے ہوتے ہیں ۔ سبھی انسان بھائی بھائی ہوتے ہیں ، ہُنہ ! نانسنس یہ کیسی دُنیا ہے ؟ کیسی اس کی فلاسفی ہے ۔ میں ٹوٹے ہوئے شیشے اور فلاسفی کی درگت پر بڑبڑاتا ہوا لوٹ آیا ۔ گالیوں کی کتاب آدھے دام پر فروخت کر دی ۔ مجھے

گجانند معزز نہیں بننے دیتا۔ میرے الزامات کو احمقوں کی بڑ سمجھتا ہے۔ ہنہہ! پھوں!

میں دو تین دنوں تک مشاہدہ کرتا رہا کہ شاید وہ راہِ راست پر آجائے۔

تیسرے دن وہ اُلٹا مجھے راہِ راست پر لے آیا اور مکینک کو بلا کر اپنے پیسوں سے نیا شیشہ فٹ کروا دیا اور میرے تلوؤں میں آگ لگ گئی۔ جی چاہا اپنے چھوٹے صاحب زادے کو سوا روپیہ رشوت دے کر کہوں کہ اس نئے شیشے کو بھی ڈھیلہ مار کر چکنا چور کر دو۔ لیکن وہ ناخلف نکلا۔ کہنے لگا "گجانند مجھے انگریزی کے سبق اتنی خوب صورتی اور پیار سے پڑھاتا ہے کہ میں ناخلف بننا زیادہ پسند کروں گا۔"

گویا یہ ایک سازش تھی —— وہ میرے بچے اور بچے کے باپ میں پھوٹ کا بیج ڈال رہا تھا —— ایسے آدمی کو کرایہ دار رکھنا، اپنے پاؤں بلکہ اپنے خاندان کے پاؤں پر کلہاڑی مارنا تھا! سوچ سوچ کر میں نے اس سازش کا توڑ تلاش کر لیا دل ہی دل میں اس کی گردن پکڑ لی۔ اور زبان ہی زبان سے کہا "اگلے ہفتے میرے بڑے لڑکے کی شادی ہے، اس لئے میرا کمرہ خالی کر دو۔"

حالانکہ میرے بڑے لڑکے کو اس کے سائز کی ہر لڑکی مسترد کر چکی تھی اور وہ تنگ آکر سماج کی نشکام سیوا کا پروگرام بنا رہا تھا۔ لیکن شادی کی خبر سنتے ہی گجانند نے کہا۔

"میں عزیزی رویندر کی شادی کی خوشی میں ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔"!

عجیب ہونق انسان ہے۔ اُسے مکان خالی کرنے کا غم نہ تھا۔ بلکہ میرے بیٹے کے بیاہ کی خوشی تھی۔ یعنی اب میں اس کا سامان بھی زبردستی نکال کر نہیں پھینک سکتا تھا۔ غصے میں آکر میں شام کو بالکونی پر کھڑا ہو گیا اور ساری دنیا اور اس دنیا کو بنانے والے خدا تک کو سنانے کے لئے بلند آواز میں کہنے لگا۔

"سنیے حضرات! یہ کیا بدمعاش ہے، میرا کرایہ دار مجھے زخمی کرنے کے لئے کل رات غنڈے لے آیا۔ اُنھیں شراب پلائیں۔ لیکن میں اس غنڈہ گردی سے نہیں ڈرتا۔ میں اُس کی ہڈیاں چبا جاؤں گا! کیونکہ سپرنٹنڈنٹ پولیس میری سالی کا بہنوئی ہے اور ڈپٹی کمشنر مجھ سے طالب علمی کے زمانے میں ریاضی کے سوال حل کرواتا رہا ہے۔ ہنھ! میں اپنے لڑکے کی شادی پر اِس سے کمرہ خالی کروا کے رہوں گا"

یہ سن کر آسمان سے پھولوں کی بارش نہیں ہوئی۔ البتہ ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ نے میرے اعزاز میں کاک ٹیل پارٹی کا اعلان کر دیا اور یہ اعلان اُس وقت دو آتشہ ہو گیا جب میری جرأتِ رندانہ دیکھ کر محلّے کے چند مشٹنڈے کرایہ دار میری بالکونی پر چڑھ آئے اور گرجنے لگے۔

"کون مائی کا لال ہے جو گجانند سے کمرہ خالی کروا لے! آپ کسی بھی کرایہ قانون کے تحت یہ غنڈہ گردی نہیں کر سکتے! ہم ڈپٹی کمشنر کے بھی ریاضی کے سوالوں کو غلط قرار دیں گے۔ جو ہم سے ٹکرائے گا، پاش پاش ہو جائے گا!"

مجھے اُن مشٹنڈوں کی جرأت پر خوشی ہوئی گویا اب تنازعہ بڑھے گا اور دو آتشہ لطف آئے گا۔ لیکن گجانند نے میرے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا اور اپنا سامان پیک کرنے لگا۔ یہ میری واضح شکست تھی۔ میں بھاگا بھاگا اُس کے پاس آیا اور اُس کا کندھا زور زور سے جھنجھوڑ کر بولا۔

"ابے سُوَر کے تخم! مت جاؤ۔ اس کمرے کا کرایہ دُگنا کر دو اور جھک مار کر رہتے رہو!"

وہ چُپ رہا —— منحوس کے دل میں میرا احترام زیادہ تھا۔ میں نے اُس کے بال وحشیانہ انداز میں کھینچے"

"ابے شیطان کی اولاد! مجھے انگوٹھا دکھا دو اور کہو کہ میں ایک چھدام نہ بڑھاؤں گا!"

وہ اُسی طرح سامان باندھنے میں معروف رہا۔

اب میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور پیمانے سے اچانک ایک قطرہ نکلا !

"میں نے دگنا کرایہ مانگ کر تم سے جھوٹ بولا۔"

"آپ جھوٹ بول ہی نہیں سکتے !"

اور دوسرے لمحے وہ میرے ہر جھوٹ کو پاؤں سے ٹھکرا کر چلا گیا اور میں بے قرار ہو کر سیدھا اُس کمرے میں داخل ہوا اور اپنی خاندانی دستاویزات پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیں !!

ماسٹر چڑت لال نے فلم بنائی

ماسٹر چڑت لال سے میرے تعلقات نہ رقیبانہ ہیں اور نہ عاشقانہ، بلکہ ان دونوں کے بیچ بیچ کے کچھ تعلقات ہیں، جو ابھی ہم دونوں کی سمجھ میں نہیں آئے اور نہ ہم نے انہیں سمجھنے کی کبھی کوشش کی ـــــــــ سنا ہے شرفا میں اسی قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔

جب بھی وہ میرے گھر میں آتے ہیں، میں انہیں چائے پلا دیتا ہوں، اور میں ان کے گھر جاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ وہ بھی جواباً مجھے چائے پلا دیں گے۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھے چائے کے ساتھ بسکٹ بھی کھلا دیئے ـــــــــ غرض ہم اس طرح ایک دوسرے کے گھر چائے، بسکٹ، سگرٹ، پان، کوکاکولا کا استعمال کرتے رہتے ہیں، اور پھر کھانے پینے اور باتیں کرنے کے بعد ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے ہم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ ایک عجیب سا خالی پن، ایک بے معنی سی محرومی ہم دونوں کے درمیان قائم رہتی ہے۔ اگرچہ یہ ایک ایسی محرومی ہے۔ جس پر نہ ہم ٹھنڈی آہ بھرتے ہیں، نہ اداس ہوتے ہیں۔

غرض ماسٹر چڑت لال سے میرے تعلقات دو دونی چار کے پہاڑے کی طرح ہیں جو ہم ایک دوسرے کو سنا دیتے ہیں۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ فکر صاحب! کیلا کھانے سے قبض ہو جاتی ہے، تو میں بھی کہہ دیتا ہوں کہ پرسوں مجھے بھی کیلا کھانے سے قبض ہو گئی تھی، میں

ماسٹرجی کو بتاتا ہوں کہ سورج کو میں نے ہمیشہ مشرق سے اُگتے دیکھا ہے، تو ماسٹرجی خوش ہو کر کہتے ہیں۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ میں نے خود سورج کو ہمیشہ مشرق سے اُگتے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تعلقات خوشگوار چلے آرہے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر اس دنیا میں کیلا اور سورج نہ ہوتا تو انسانی تعلقات کافی دگرگوں ہوگئے ہوتے۔

لیکن ایک دن اچانک ہمارے تعلقات میں پہلی دراڑ پڑ گئی، کیونکہ قانونِ قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے کو آن جانے میں بے وقوف بناتے رہیں۔

ہوا یہ کہ ایک دن ماسٹر چرت لال نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے کہا "فکر صاحب! میں مشہور ہونا چاہتا ہوں"

میں نے عرض کیا ــــ "آپ کو ضرور مشہور ہونا چاہیئے۔ ورنہ آپ ہمیشہ کیلا بنے رہیں گے۔ اور اپنے آپ کو قبض نہیں ہونے دیں گے۔"

وہ بے تحاشہ ہنس دیئے ــــ لیکن فوراً بعد جیسے انہیں خیال آیا کہ وہ اپنی ہی سنجیدہ بات پر ہنس رہے ہیں، چنانچہ ایک دم اُداس یعنی سنجیدہ ہو کر بولے۔

"آپ مجھ پر طنز کر رہے ہیں"

"میں نے کہا۔ "نہیں، یہ میری عادت ہے، نیت نہیں۔ آپ فرمائیے کہ مشہور ہونے کے لئے آپ نے کون سا طریقہ سوچا ہے؟ مثلاً گزشتہ دنوں ہمارے محلے کے ایک صاحب نے مشہور ہونے کی خاطر اپنی گلی کے سرے پر اپنے نام کی تختی پر لکھ کر لگا دیا "پرکاش چند اسٹریٹ" لیکن ان کی شہرت اس وقت خطرے میں پڑ گئی جب اسی گلی میں ایک کرایہ دار آکر رہنے لگا۔ اس کا نام بھی پرکاش چند تھا۔ چنانچہ انہوں نے وہ تختی اُتار لی پینٹر سے نئی تختی پر لکھوا دیا "پرکاش چند ملہوترہ اسٹریٹ" ــــــ اس لئے میرا مطلب یہ ہے کہ آپ مشہور ہونے سے پہلے یہ تحقیق ضرور کروا لیجئے کہ اس شہر میں کسی اور آدمی کا نام تو ماسٹر چرت لال نہیں ہے اور وہ آپ کی طرح ملہوترہ تو نہیں ہے"

انھوں نے اپنے ماتھے پر اپنی استخوانی انگلیاں دو چار مرتبہ ماریں اور جیسے سارے شہر کا چکر لگا کر ڈیڑھ منٹ میں لوٹ آئے پھر بولے۔

صرف ایک ماسٹر جرأت لال ضرور ہے مگر وہ اسٹیشن ماسٹر ہے اور [illegible] اسکول ماسٹر ہوں، اور پھر وہ صرف اس لئے مشہور ہے کہ اس کی سات لڑکیاں ہیں اور لڑکا ایک بھی نہیں ہے۔"

میں نے ان کی پیٹھ پر اطمینان دلانے والی تھپکی دی" خیر، ان کی مشہوری کی لائن الگ ہے، مگر آپ کی لائن کیا ہے؟"

"میں ایک فلم بنانا چاہتا ہوں۔" وہ واقعی مطمئن ہو کر بولے۔

"ضرور بنائیے۔ اور اس فلم کا نام اسکول ماسٹر رکھئے۔"

انھیں پھر شک ہوا کہ میں طنز کر رہا ہوں۔ بولے۔ فکر صاحب! آپ پھر مذاق اڑا رہے ہیں۔ لیکن بچپن سے یہ میری تمنا ہے کہ میں زندگی میں ایک فلم ضرور بناؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ میرے اس خواب کی تعبیر ضرور نکلے گی۔"

"ہائے بچپن کے سہانے خواب!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا، مگر انھوں نے میری بات شاید نہیں سنی اور بتاتے چلے گئے کہ میں نے فلم کے لئے ایک کہانی [illegible] لکھ ڈالی ہے اور اس کا نام بھی رکھ لیا ہے۔" وہ بولے" ایک گلاب۔"

اب میں سنجیدہ ہو گیا اور کہا۔ ماسٹر جی! اس نام سے ملتی جلتی ایک دو فلمیں پہلے بھی بن چکی ہیں۔ بلکہ ایک پروڈیوسر تو اسی قسم کے نام سے ایک مزاحیہ فلم بھی بنا رہا ہے: "ایک سیخ دو کباب"۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ آپ کوئی چونکا دینے والا نام رکھئے۔"

"تو آپ ہی کوئی نام تجویز فرمائیے۔" انھیں مجھ پر جاہلانہ حد تک اعتقاد تھا۔ جیسے مجنوں کے ٹیلے کے مجاور کو اس امر پر اعتقاد تھا کہ اس ٹیلے کے نیچے واقعی مجنوں کو دفنایا گیا۔

میں نے کہا: "پہلے آپ اپنی کہانی سنائیے، تب ہی اس کا کوئی [illegible] نامعقول نام تجویز کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ آجکل کی دنیائے فلم [illegible] کہ کہانی کی تقسیم اور فلم کے نام میں کوئی تعلق ہو۔ [illegible]

ہیں اور غضب یہ کہ اس کی بدولت مشہور بھی ہونا چاہتے ہیں ۔ اس لیئے آپ کی کہانی کی روح فلم کے نام میں پوری طرح اجاگر ہونی چاہیئے ۔"

انھوں نے شاید مجھے پروڈیوسر یا فنانسر یا دونوں سمجھ کر کہانی سنانا شروع کی اور بولے میری کہانی ایک باغیچے سے شروع ہوتی ہے ۔ جہاں پر ایک مالی کا لڑکا اور ایک سیٹھ کا لڑکا آپس میں گیند بلا کھیل رہے ہیں ۔ اور ....."

مجھ سے رہا نہ گیا ۔ بے ساختہ میرے منھ سے نکلا! "میں سمجھ گیا حیرت لال جی، آپ کی فلم میں بھی یہ دونوں لڑکے بڑے ہو کر جوان ہو جائیں گے ۔ اور دونوں ایک ہی لڑکی سے عشق کرنے لگیں گے .. .. .. اور پھر دونوں اس لڑکی کی خاطر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے ۔ ان میں سے ایک لڑکا کسی حادثے میں مرجائے گا اور دوسرے لڑکے سے وہ لڑکی شادی کرلے گی کہانی ختم، فلم ختم، اور پھر آپ کو نیشنل ایوارڈ ....."

ماسٹر حیرت لال ایک دم اداس ہو گیا، اور جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آنے والا مسافر تھکان سے چور چور آواز میں بولتا ہے : "میں نے یہ کہانی لکھنے پر پورے گیارہ مہینے عرق ریزی کی مگر آپ نے ڈیڑھ منٹ میں ہی ساری کہانی سنا دی .. .. مگر معاف کیجئے، میری کہانی میں ایک نہیں دو لڑکیاں ہیں ۔

میں اچھل پڑا : "پھر تو کام اور بھی آسان ہو جائے گا ۔ ماسٹر حیرت لال جی ہندوستان بھر کی لڑکیاں آپ کے ہاتھ میں ہیں ۔ آپ چاہیں تو دو کی بجائے چار پانچ لڑکیاں بھی لا سکتے ہیں ۔ لیکن ہیروئن تو بہر کیف ایک ہی لڑکی ہو گی ۔"

نہیں میری فلم میں دو ہیروئنیں ہونگی ۔ ایک امیر گھرانے کی لڑکی ... "

" جو مالی کے لڑکے سے عشق کرے گی تاکہ ملک میں سوشلزم آسکے ... ... "

" اور دوسری ایک غریب طوائف کی لڑکی، جس کے لیئے سیٹھ کا لڑکا اپنے والدین کی جائداد پر لات مار دے گا .. .. .. "

" بس ، بس !" میں نے ماسٹر حیرت لال کا منھ چوم لیا : "آپ سچ مچ ایک

عظیم آدرش پر فلم بنا رہے ہیں ، کہ امیروں کو غریبوں سے عشق کرنا چاہیئے اور غریبوں کو
امیروں سے ، تاکہ ملک میں حقیقی سوشلزم آسکے ۔ میرا مطلب ہے کم از کم فلموں میں
تو سوشلزم آ ہی جانا چاہیئے ۔۔ ۔۔ ۔۔ آپ اس کہانی کو فوراً سے پیشتر فلما دیجئے
میری طرف سے اجازت ہے ۔"

یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا ۔ کیونکہ یہ ایک غیر شریفانہ فعل ہوتا ۔ اگر ماسٹر جڑپت
لال کی کہانی میں ترمیم و تنسیخ کے مشورے دیتا اور خود بھی دکھی ہوتا اور ماسٹر جی کے
نازک بھیجے پر بھی چھری چلاتا ۔ البتہ جاتے جاتے میں نے ماسٹر جی سے یہ ضرور کہہ دیا
کہ ان میں ایک لڑکے یا ایک لڑکی کو کسی حادثے یا جھگڑے میں مروا مت ڈالئے
بلکہ ان دونوں جوڑوں کی خوشگوار شادی کروا دیجئے ، کیونکہ ملک کو اس وقت خوشحال
شادی شدہ جوڑوں کی اشد ضرورت ہے ۔

ماسٹر جی نے سچ مچ مجھ سے وعدہ کر لیا کہ میں ایسا ہی کروں گا ۔ حالانکہ اگر وہ
اپنی فلم میں سیٹھ کے لڑکے کو عمر قید دلوا دیتے اور اس کی محبوبہ کو جوگن بنا کر بدھیا چل
پہاڑ کی طرف بھیج دیتے تو بھی مجھے کوئی خاص اعتراض نہ ہوتا ۔ کیونکہ فلموں میں ایک
فارمولا استعمال کیا جائے یا دوسرا فارمولا ۔ انجام ہر فلم کا یہی ہوتا ہے کہ فنانسر
کو نافع مل جاتا ہے اور فلم سٹار گورنمنٹ کا انکم ٹیکس دبا لیتے ہیں اور نیشنل ایوارڈ پانے کے
اہل ہو جاتے ہیں ۔

آٹھ دس دن بعد ماسٹر جڑپت لال اچانک پھر نمودار ہو گئے میں نے پوچھا
" سنائیے ماسٹر جی ! آپ کی فلم کس منزل میں ہے ؟"

اس دن ان کے افسوسناک قسم کے چہرے پر ایک عجیب سی رونق چھائی ہوئی
ہوئی تھی ۔ ان کے ہاتھ میں ۵۵۵ کے سگریٹ کا ٹین تھا ، اور سوٹ بھی نیا ڈرائی
کلین کیا ہوا تھا مسلمہ احمقوں کی طرح جیسے ڈانس کرتے ہوئے بولے ۔ کرشن صاحب !
مبارک ہو ایک فنانسر مل گیا ہے ۔ جو اس فلم پر چار لاکھ روپے صرف کر لے پر

آمادہ ہو گیا ہے ... ... کہانی اسے پسند آ گئی ہے۔"

میں نے پوچھا: "مبارک باد کے بعد عرض ہے کہ فنانسر کون ہے؟ وہ بھی کوئی احمق ہی ہو گا۔ آپ کا کام کرتا ہے؟"

وہ سرگوشی میں بولے: "کسی کو بتایئے گا نہیں۔ وہ بلیک مارکیٹیا ہے۔ اس کے پاس دس بارہ لاکھ روپے کا کالا دھن ہے۔ اور وہ بھی بطور فلم پروڈیوسر مشہور ہونا چاہتا ہے۔"

میں نے چوری چھپے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بظاہر خوش ہو کر کہا ماسٹر جی: "آپ نے پروڈکشن کے لئے نہایت مناسب آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ ہمارے ملک کی یہی ریت چلی آئی ہے کہ آرٹ اور لٹریچر کی خدمت اور سرپرستی صرف بلیک مارکیٹر ہی کرتے رہے ہیں۔ فلموں کے ذریعے سوشلزم لانے کا سہرا صرف کالے دھن والوں ہی کے سر بندھے گا۔ تو آپ کب تک جا رہے ہیں، کیونکہ فلم سازی کا مرکز تو بمبئی میں ہے۔"

وہ بولے "اوہ! مگر بمبئی روانہ ہونے سے پہلے میں آپ سے یہ مشورہ کرنے آیا ہوں کہ فلم کے لئے ہیرو کس کو لیا جائے؟"

"کسی کو بھی لے لیجئے۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا: "روپیہ ہاتھ میں ہو تو آپ کسی بھی فلم اسٹار کی روح یا جسم خرید سکتے ہیں۔ راجندر کمار، راج کمار، پریم کمار" "انوپ کمار کوئی بھی کمار آپ کی فلم میں ہیرو بن سکتا ہے لیکن آپ کی فلم میں تو دو ہیرو تھے نا؟ ایک مالی کا لڑکا، ایک سیٹھ کا لڑکا اس طرح تو خرچ دگنا ہو جائے گا۔ آپ یوں کیجئے کہانی میں ترمیم کر لیجئے اور ایک ہیرو کو فلم کے پہلے ہی سین میں کسی نہ کسی طرح مروا ڈالئے۔

"نہیں، فنانسر کا کہنا ہے کہ وہ اس فلم پر چار لاکھ کی بجائے آٹھ لاکھ روپے خرچ کرے گا"

"ہپ ہپ ہرے!" میں نے داد کی مرلی بجائی۔ "اور اگر وہ آٹھ لاکھ کی بجائے بارہ لاکھ روپے خرچ کر ڈالے تو فلم میں تین ہیرو رکھ لیجئے۔"

ہرج بھی کیا ہے، کالا دھن جتنی زیادہ سے زیادہ تعداد میں باہر نکل کر عوام میں تقسیم ہو گا اتنی ہی جلدی ملک میں سوشلزم آئے گا۔ اور جناب! ذرا اندازہ لگایئے کہ جب آپ کی فلم میں تین تین مشہور ہیرو ہوں گے اور تین تین ہیروئنیں تو جنتا ٹکٹ

آمدنی پر ٹوٹ پڑے گی بارہ لاکھ کے چوبیس لاکھ بن جائیں گے اور آپ کی شہرت تین گنی بڑھ جائے گی۔"

ایک ہفتے بعد ماسٹر حیرت لال پھر میرے پاس یہ خوش خبری لے کر آئے کہ میرا فنانسر بارہ لاکھ روپے کی بجائے چودہ لاکھ روپے خرچ کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ کیونکہ بغیر سوچے سمجھے جو فلمیں بنائی جاتی ہیں وہی کامیاب ہوتی ہیں، کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ اس فلم میں ایک ولین کو شامل کر دیجئے۔ کیونکہ ولین بھی مرتبے میں ہیرو سے کم نہیں ہوتا۔"

مگر ماسٹر جی سوچ میں پڑ گئے۔ چند سکنڈ تک اپنی پیشانی پر انگلیاں بجاتے رہے۔ جیسے سوشلزم اور ملک کا مستقبل ان کی پیشانی کے اندر پھنس گیا ہو۔ اور پھر غمگین لہجے میں بولے۔ مگر فکر صاحب! میں نے تو یہ سوچا تھا کہ سیٹھ کے لڑکے کو ولین کے روپ میں پیش کیا جائے۔ یعنی ولین تو فلم میں پہلے سے موجود ہے۔"

میں نے دست بستہ عرض کیا۔ "ایک کی بجائے دو ولین بنا دیجئے آپ کا کیا بگڑتا ہے۔"

"لیکن دو ولینوں کو فلم میں مروانا پڑے گا۔"

"مت مروائیے، آپ تو خدا ہیں۔ جلانا اور مارنا آپ کے اختیار میں ہے عام فلموں کے راستے سے ذرا ہٹ کر فلم بنائیے اور آخر میں دونوں ولینوں کی شادی کر دیجئے۔"

"مگر فکر صاحب!" وہ پریشان ہو گئے۔ "ولین کیسے شادی کر سکتے ہیں شادی تو آخر میں ہیروئن کی ہونی چاہیے۔"

"اوہ! آپ سمجھے نہیں۔ فلم کے پہلے حصے میں ولین کو بطور ولین پیش کیجئے دوسرے حصے میں وہی ولین اپنے گناہوں کا اعتراف کر لے اور ہیرو بن جائے آپ شاید نہیں جانتے کہ سرودے لیڈر ونوبا بھاوے جی نے تالیف قلوب کے سلسلے

میں ایک تحریک چلائی تھی اور مدھیہ پردیش کے ڈاکٹروں کے دل تبدیل کروا دیئے تھے، تو کیا آپ کے ویلن پشچاتاپ نہیں کر سکتے؟"

"کر سکتے ہیں۔" وہ ایک مجبور اور محبوس پنچھی کی طرح بولے۔

"تو بس اب جائیے اور کہانی میں یہ نئی ترمیم کیجئے۔ میری دعائیں اور فنانسر کا دھن آپ کے ساتھ ہے۔"

اس کے بعد ماسٹر چڑپت لال جی کئی بار مجھ سے ملتے رہے۔ کیونکہ انھیں اپنی فلم کہانی میں کئی بار ترمیمیں کرنا پڑیں۔ کئی بار میرے کہنے پر ترمیم کی، ایک بار فنانسر کے کہنے پر، ایک بار فنانسر کے سالے کے کہنے پر، کیونکہ وہ سالا اس فلم میں بطور سائڈ ہیرو کام کرنا چاہتا تھا۔ ایک مرتبہ سالے کی پانچ سالہ ننھی بیٹی کے کہنے پر کیونکہ اس نے ضد کی تھی کہ انکل مجھے اپنی فلم میں رول دیجئے۔ چنانچہ ننھی بچی کو "اکاموڈیٹ" کرنے کے لئے نصف کہانی دوبارہ لکھنا پڑی۔ ایک ڈسٹری بیوٹر کے کہنے پر، جو فنانسر کے سالے کا بہنوئی تھا اور اس نے فلم میں دو لاکھ روپے لگانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ ——— مالی کے غریب لڑکے کا عشق ایک ڈانسر سے کروانا پڑا۔ کیونکہ اس کے بہنوئی کی بیوی ڈانسر تھی۔ غرض ترمیم ——کے بعد جب آخری شکل میں کہانی مجھے سنائی گئی تو ماسٹر چڑپت لال کی حقیقی کہانی کی قبر کے اوپر کئی قبریں بن چکی تھیں اور اصلی قبر کو پہچاننا مشکل ہو گیا تھا ۔۔۔

بہرکیف ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ وہ عظیم فلمی کہانی کا ماسٹر چڑپت لال اپنے بیوی بچوں سے یہ کہہ کر بمبئی کی طرف روانہ ہو گیا ہے کہ میں جلد ہی بطور مشہور ڈائرکٹر تمھیں بمبئی بلا لوں گا۔

اس کے بعد دو مہینے تک ماسٹر چڑپت لال کی کوئی اطلاع نہیں ملی اور میں کئی بار یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ ماسٹر چڑپت لال نے بحر ساگر میں خودکشی کر لی ہوگی۔ اس خودکشی پر مجھے صرف اتنا افسوس ضرور ہوا تھا کہ فلموں کے ذریعے سوشلزم لانے

قدرے تاخیر ہوجائے گی۔

مگر دو مہینے بعد اچانک ایک دن کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا تو ایک مرجھایا ہوا چہرہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے کہا" فرمایئے"

وہ بولا "آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں ماسٹر چڑپت لال ہوں۔"

میں نے بڑھ کر اس کو سینے سے لگا لیا اور کہا "میں پہچانتا کیسے ماسٹر جی! آپ کے چہرے پر تو سوشلزم چھا گیا ہے۔ یہ سیاہی یہ جھریاں، یہ جھانکتی ہوئی ہڈیاں آپ کو کیا ہوگیا ہے؟"

وہ بولا "مجھ سے سخت دھوکا کیا گیا فکر صاحب! میری وہ کہانی کسی دوسرے پروڈیوسر نے چرالی۔"

"کیسے؟ وہ کہانی تو پہلے ہی کئی قلموں سے چرائی ہوئی تھی۔ چرائی ہوئی کہانی کو کس نے چرالیا؟ یہ بمبئی کے فلم ساز تو بڑے احمق ہیں!"

ماسٹر چڑپت لال کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ جیسے فریادیوں کی طرح اپنی دردناک داستان سناتے رہے۔ بات دراصل یوں ہوئی کہ جب سارے معاملات طے پا گئے تو ہم نے فلم کی شوٹنگ شروع کر دی۔ سٹوڈیو، فلم سٹار دلالی اور کئی دوسرے پیشہ ور لوگ مل جل کر ہمارا دو لاکھ روپیہ کھا گئے۔ اور جب دو ریلیں بن گئیں تو اچانک ایک دن اسٹوڈیو کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا۔ معلوم ہوا کہ ہمارے فنانسر صاحب کے خلاف سرکار نے اسمگلنگ کا کیس بنایا ہے۔ اور اس سلسلے میں اسے گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ کیونکہ یہ سارا کالا دھن، جس نے اسمگلنگ کے ذریعے کمایا تھا۔ چنانچہ فکر صاحب! جب ہمارا فنانسر گرفتار ہو گیا تو فلم کی شوٹنگ رک گئی، اور میں ......"

"...... آپ کی کہانی تو گرفتار نہیں ہوگئی۔ آپ اسے کسی اور پروڈیوسر کو دے دیتے!"

ماسٹر جرأت لال نے پانچ کلو میٹر لمبی آہ بھری اور کہا: "یہی تو دکھ ہے ذکر صاحب کہ اس فنانسر کے سالے نے میری وہ کہانی اٹھا کر ایک اور پروڈیوسر کو سنائی تو معلوم ہوا کہ بالکل ایسی ہی کہانی وہی پروڈیوسر پہلے ہی خرید چکا ہے۔ اور اس کی بنیاد پر ایک فلم تیار کر رہا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ میری یہ کہانی کس بے ایمان نے چرا کر اس پروڈیوسر کے ہاتھ بیچ دی!"

بیوی کے ہجر میں

اچانک میری بیوی نے اعلان کیا کہ وہ ایک ہفتے کے لئے میکے جا رہی ہے حالانکہ وہ اس سے پہلے کبھی یا [illegible] کہتی رہی تھی کہ اب میں سسرال کو میکہ ہی سمجھتی ہوں اور ادھر میں کئی برس سے اصرار کر رہا تھا کہ میں تمہارے ہجر کی لذت اٹھانا چاہتا ہوں۔ اس لئے تم کہیں دفع ہو جاؤ۔ لیکن وہ کہتی تھی کہ ہجر صرف ایک شاعرانہ تکلف ہے۔ اس سے میرا گھر اجڑ جائے گا میری غیر حاضری میں کچن کا ایک چمچہ بھی گم ہو گیا جو یقیناً گم ہو جائے گا تو تاریخ میں میرا نام سیاہ حرفوں میں لکھا جائے گا۔

گویا وہ ہجر کو ایک چمچے سے زیادہ وقعت نہیں دیتی تھی۔

سالہا سال کے تلخ تجربے کے بعد میں مایوس ہو گیا کہ میری بیوی سے کوئی عقلمندی سرزد نہیں ہو سکتی۔ خداوند کریم سے میری جتنی رقت انگیز دعائیں مانگیں سبھی رائیگاں گئیں دراصل میری پرابلم قدرے آرٹسٹک تھی۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ماحول میں کبھی کبھی کوئی تبدیلی ضرور آنی چاہئے۔ بیوی کا ہجر بھی ایک طرح کی تبدیلی تھی۔ سنا ہے اس کا ذائقہ بہت لذیذ ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ میری پہلی اور آخری بیوی تھی۔ بلکہ اس کا حوصلہ بلند کرنے کے لئے میں اسے اکلوتی بیوی بھی کہہ دیتا تھا۔ لیکن یہ بات بھی ماننا مناسب تھی کہ جب بھی شام کو گھر لوٹتا تو گھر میں وہی پرانی [illegible] بیوی ملتی تھی۔ صرف بیوی ہی نہیں۔ کچن میں کیتلی بھی وہی ملتی تھی۔ [illegible] وہ جہیز میں لائی تھی۔ ایک دن بور ہو کر

میں نے بیوی کا بدلہ کتیلی سے لینا چاہا اور کہا: "اب اسے ریٹائر کر دو۔ بوڑھی ہو گئی ہے!"

وہ بولی "نہیں، میں اسے جیتے جی الگ نہ کروں گی۔ کیونکہ اسے دیکھ کر مجھے ماں کی شیریں یاد آجاتی ہے۔"

میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو سمجھا لیا کہ وہ یا تو کیتلی سے محبت کرتی ہے یا ماں سے۔ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ مجھے تو صرف گھر کی ٹیم پلیٹ سمجھتی ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار اس نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ یہ گھر نیم پلیٹ کے بغیر بھی مکمل ہے۔ اس دن میں بازار سے ایک سیکنڈ ہینڈ سوئیٹر خرید لایا۔ اسے دیکھتے ہی محترمہ کا پارہ گرم ہو گیا کہ میرے مشورے کے بغیر بلکہ میری منظوری کے بغیر یہ سوئیٹر کیوں لے آئے؟ بولیں "میں پوچھتی ہوں، کیا یہ سوئیٹر ہے؟ کتنا گھٹیا اور کتنا چھوٹا ہے؟"

میں نے چڑ کر کہا۔ "ہاں ہاں، میں جو لایا ہوں۔"

بولیں "تو کیا آپ اس گھر میں کبھی کوئی بھی کام کی چیز لائے ہیں؟"

میں نے کہا: "ایک تو تمھیں لایا ہوں۔ اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

اگر وہ وسیع القلب ہوتی تو اس پر مسکرا دیتی۔ لیکن الٹا اٹی کھٹواٹی لے کر پلنگ پر جا لیٹی اور کہنے لگی۔ "یہ میرے والد صاحب کی غلطی تھی میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

نہ جانے کیوں اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ گھر ایک بیابان ہے جس میں وہ ایک پھول کی طرح کھلی ہوئی ہے۔ اگر یہ پھول ایک دن کے لئے بھی آوٹ آف اسٹیشن ہو گیا تو یہ گھر پھر بیابان ہو جائے گا۔ اجڑ جائے گا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ ہر روز پھول کی خوشبو اور رنگ سے بھی انسان بور ہو جاتا ہے۔ اسی لئے کسی دن گھر کی بیابانی سے بھی لطف اٹھایا جائے۔ بلکہ جگر کا ف دہ اٹھا کر ایک غزل بھی کہہ لی جائے۔ لیکن آج میں یہ دیکھ کر قریب قریب مایوس ہو گیا کہ غزلوں کا مستقبل بے حد تاریک ہے۔

لیکن اس دن یہ اعلان سنکر مجھے حیرت ہوئی اور مسرت بھی۔ وہ ایک ہفتے کے لئے میکے جا رہی ہے۔ یعنی میرے سارے اندازے غلط نکلے۔ بنیادی میری بیوی تھی

نالائق نہیں ۔   ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اور کہ اس مٹی سے تو غزلوں کے کئی دیوان اُگ سکتے ہیں!

حج کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اس نے ایک گتے پر ہدایت نامہ خاوند لکھ کر لٹکا دیا اور کہا کہ ہر روز صبح اٹھ کر اس کا پاٹھ کیا کرو۔ مثلاً ان میں سے ایک دو ہدایتیں یہ تھیں ۔ ہر روز چوہے دان میں پیاز کا ایک ٹکڑا لٹکا دیا کرو۔ ایک پیاز سے کم از کم تین چوہوں کا شکار لازمی ہے ۔ پیاز کے اس اسٹینڈرڈ کو قائم رکھا جائے اور میری واپسی پر اعداد و شمار کے ساتھ رپورٹ پیش کی جائے ۔ پڑوسن کو مٹی کا تیل سپلائی نہ کیا جائے ہمارے گھر میں اس کی چینی کی ایک پلیٹ موجود ہے ۔ لیکن میری عدم موجودگی میں اس کے ساتھ کوئی لین دین نہ کیا جائے ــــ اور تیسری اور بڑی سیریس ہدایت یہ تھی کہ اول تو اپنے کسی دوست کو گھر میں مدعو نہ کیا جائے اور اگر کوئی اپنی بیوی سے نالاں ہو کر ہمارے گھر میں پناہ لینے کے لئے آ بھی جائے تو اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سگریٹ پینے سے منع کر دیا جائے ۔ کیونکہ وہ سگریٹ کی راکھ سے قالین کا بیڑہ غرق کر دے گا اور اپنے ملازم کے کان میں چپکے سے کہہ گئیں کہ ایسے ہر دوست کا نام، حلیہ اور ایڈریس نوٹ کر لیا کرو میں ان سے قالین کا کلیم وصول کروں گی ۔ ریل چھوٹنے سے تین سیکنڈ پہلے دھمکی دے گئیں کہ اگر کوئی ہدایت مجھے میکے میں یاد آ گئی تو ٹیلیگرام کے ذریعے بھیج دوں گی

بیوی کے جانے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا ویرانی بے حد رومانٹک ہوتی ہے امن کے فرشتوں نے میری چھت پر پنکھ پھیلا دیئے اور کہا "مبارک ہو!" غسل خانے میں گھسا تو بے اختیار جی چاہا، زور زور سے گانا شروع کر دوں۔ محلے سے گزرا تو ہر عورت حسین اور دلکش نظر آئی گھر کی بلی نے آ کر مودبانہ سلام کیا اور اس لہجے میں میاؤں کی جیسے کہہ رہی ہو: "مالک دودھ کہاں رکھا ہے؟ ناچیز کو بھوک لگی ہے۔ اجازت دیجئے تاکہ پی لوں ۔ میں جانتی ہوں کہ دسیتا چلا آتا آپ کے شایانِ شان نہیں۔ دھوبی نے آ کر گھنٹی بجائی اور جب میں نے اسے بتایا کہ بی بی جی میکے گئی ہیں تو وہ گستاخ بولا "پھر آپ سے ذکر کی بات کرنا فضول ہے۔" میں نے کہا "کوئی حساب کتاب کی بات ہو تو [illegible]

لیکن وہ بولا "آپ کی سمجھ میں نہ آئے گی۔"

دھوبی کے اس نقطۂ نگاہ سے مجھے مشتعل ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے اس کی گستاخی کو فراخدلی سے نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ میں سامراج سے تازہ تازہ آزاد ہوا تھا اور آزاد انسان بہت فراخ دل ہوتا ہے۔ میں آزادی کی فضا میں کھل کر سانس لینا چاہتا تھا۔ کسی سے تنازعہ کر کے اپنے موڈ کو مکدر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے نوکر سے کہہ دیا کہ اب میرا لنچ اور ڈنر باہر ہی رہے گا۔ لیکن اس کے باوجود تمہاری تنخواہ میں کٹوتی نہ ہوگی کیونکہ میں بی بی جی طرح مہاجنی ذہنیت نہیں رکھتا۔ کئی برس بعد پہلی بار ہوٹل کے کھانے میں وہی لطف آیا جو کنوارپنے میں آیا کرتا تھا۔ آہ میں کنوارپنے سے کتنا محروم ہو گیا تھا! احباب کو بے تکلف دعوتیں دیں کہ آؤ تاش کھیلو، سگریٹیں پھونکو۔ بستروں پر شکنیں ڈالو، بلکہ ایک آدھ پلنگ کا پایہ بھی توڑ سکتے ہو! چائے کے کپ پر کپ لنڈھاؤ، کسی رولز اینڈ ریگولیشنز کے بغیر بے مہار۔ نت کام سردیس کی چائے کی رات کو بہت لیٹ آنے میں ایک سرور آنے لگا۔ چیونٹیوں نے گھر کے دانے دنکے پر مسلسل حملے شروع کر دیے۔ لیکن انھیں ڈسٹرب نہیں کیا۔ چڑیاں میرے گھر کو اپنا آبائی ڈومیسائل سمجھ کر گھونسلے پر گھونسلے تیار کرنے لگیں اور سارے کمروں میں خس و خاشاک بکھیر دیے۔ لیکن میں نے ان کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرنا ضروری نہ سمجھا۔ یہاں تک کہ ایک چڑیا بار بار چڑے بدل بدل کر لاتی رہی لیکن یہ بھی ذاتی معاملہ۔ چوہے تک میری فراخدلی سے مستفیض ہو گئے۔ وہ چوہے دان کو اپنے دانت دکھا کر یوں گزر جاتے جیسے کہہ رہے ہوں: سیاں بھئے کوتوال، اب ڈر کاہے کا! البتہ ایک فرق ضرور ہوا کہ بیوی کے چلے جانے کی خبر سن کر کوؤں نے آنا بند کر دیا۔ کیونکہ ان کا راشن ڈپو بھی میکے میں اٹھ گیا تھا۔

تین چار دن اس آزادی بلکہ آزادہ روی میں ہنسی خوشی، پلک جھپکتے گزر گئے تو پانچویں دن اچانک خیال آیا کہ ہجر کی لذت تو اٹھائی نہیں۔ ہجر تو اللوں تللوں میں گزر گیا اور محترمہ یہ سوال سوچتی آئیں گی، اور آتے ہی پوچھیں گی "کہاں لکھی ہے وہ غزل؟" اور کہیں گی کہ یوں ہی ایک قیمتی ہفتہ ضائع کر دیا! لیکن شادی کے بعد میں نے شاعری کو

جلاوطن کر دیا تھا۔ اس لئے بیوی کے نام ایک ہجریہ خط لکھنا ہی مناسب سمجھا اور خط لکھنے لگا۔

"اے جانِ بہار و خزاں!

جب سے تم گئی ہو، کوّوں نے تمھارے فراق میں کائیں کائیں کرنا چھوڑ دیا ہے۔ بادل صرف گرج گرج کر رہ جاتے ہیں، برستے نہیں۔ نہ جانے انھیں کیا غم ہے۔ چاندنی چھٹکتی ہے تو دھاڑیں مارنے کو جی چاہتا ہے۔ کل تان پورے کے تاروں کو چھیڑا تو وہ جیسے کرلا کرلا کر کہنے لگے "لوٹ کے آ، لوٹ کے آجا میرے میت!" اور پیاری! سب سے بڑا ظلم تو یہ ہوا ہے کہ بینگن مہنگے ہو گئے۔ راشن ڈپو پر گھٹیا آٹا ملنے لگا۔ غرض تمہارے بغیر کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں رہی۔ یہاں تک کہ کل الماری میں تمہارا گہنوں کا ڈبہ دیکھا تو وہ بھی غائب تھا! چور لے گئے یا تم اپنے ساتھ لے گئیں۔ جب تک تم لوٹ کر نہیں آتیں، میں تھانے میں گہنوں کی رپٹ نہیں لکھا سکتا۔ اس لئے آجاؤ آجاؤ۔ میری خاطر نہ سہی گہنوں کے ڈبے کی خاطر ہی آجاؤ۔"

یہ ہجریہ خط لکھ کر لفافے میں بند کیا اور بیوی کا ایڈریس لکھا کہ دھڑاک سے دروازہ کھلا اور بیوی اندر داخل ہوئی۔ بولی۔ کیا لکھ رہے ہو؟ میں نے کہا کچھ نہیں ایک بے معنی سا خط ہے۔ لیکن تم اتنی جلدی کیوں واپس آ گئیں؟ بولی۔ کل رات میں نے سپنا دیکھا کہ آپ کو مچھر کاٹ رہے ہیں۔ دوہتڑ مار کر کہا۔ "ہائے! میں بھی کتنی نالائق بیوی ہوں۔ مچھر دانی تو سٹور میں بند کر کے رکھ آئی ہوں۔ سوچا چلوں انھیں مچھر دانی تو نکال کر دے آؤں۔"

ہجر کا اینٹی کلائمکس۔

مجبوراً بیوی کے اس غیر ضروری وصال پر سارا پانسہ ہی پلٹ گیا اور ہجر نے ایک ہی دن میں اپنا اقتدار بحال کر دیا۔ ہجر کی ساری سرگرمیاں پس منظر میں چلی گئیں میں "سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے!" بن کر رہ گیا کہ اچانک دوسری

صبح کو پوسٹ مین عرف نامہ بر نے مجھے ایک ڈلیٹر لا کر دیا۔ یہ خط بیوی نے میکے سے شام کو پوسٹ کیا تھا اور اسی رات کو میں جدائی کا خواب دیکھ کر صبح گاڑی پر سوار ہو کر گھر لوٹ آئی تھیں۔ یعنی جنونِ محبت میں کیفیت کچھ ایسی ہو گئی کہ خط بعد میں پہنچا، محبوبہ پہلے پہنچ گئی!
میرے منہ سے بے اختیار (بیوی کی حمایت میں) غالب کا یہ شعر نکل گیا۔

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ خط نہیں تھا، ہجر کا اینٹی کلائمکس تھا۔

اور اس میں لکھا تھا۔

"بڑے پپو، چھوٹے پپو، ممی نمبر ایک اور ممی نمبر ۲ کے ابا جی!

میں یہاں بچوں سمیت خوش ہوں۔ امید ہے آپ بغیر بچوں کے خوش ہوں گے۔ بچے ہر روز آپ کو یاد کرتے ہیں۔ بچے ہیں نا؟ سمجھ بوجھ نہیں ہے۔ انھیں لاکھ سمجھاتی ہوں کہ اگر تمھارے ابا کو تمہاری یاد ستائے گی تو بھاگے آئیں گے۔ لیکن وہ پہلے ہی میری کوئی بات نہیں مانتے تھے۔ اب کیا مانیں گے۔ دراصل آپ ہی نے بچوں کو بگاڑ دیا ہے۔ جب میں انھیں لے کر گھر لوٹوں گی تو ان شریر بچوں کی پٹائی ضرور کیجیے گا تاکہ انھیں سبق مل جائے۔

باقی یہاں پر خیریت ہے۔ آپ کی خیریت کی چنتا رہتی ہے کہ نہ جانے آپ نے میرے بغیر گھر کا کیا حال بنا رکھا ہے۔ پانی کا نل کبھی کھلا مت چھوڑیے گا۔ بستر پر سگریٹ کی راکھ جھاڑنے سے پرہیز کیجیے گا۔ میں پلنگ کے ساتھ والی تپائی پر ایش ٹرے رکھ آئی تھی۔ کپڑے میلے ہوئیں تو انھیں فرش پر اور کونوں کھدروں میں مت پھینک دیجیے گا۔ کیونکہ اس طرح چوہوں کو کترنے کا گولڈن چانس مل جاتا ہے۔ مجھے رہ رہ کر شک ہوتا ہے کہ وہ لمبی ناک والی پڑوسن میری عدم موجودگی سے شہ پا کر اپنے چوہے ہمارے گھر کی طرف ہانک دے گی۔ آپ کو اپنے گھر کے اور پڑوسن کے چوہوں کی پہچان رکھنی چاہیے۔

اور انہی باتوں کے خدشے سے میکے میں میرا جی نہیں لگتا۔ ہر لمحہ جی چاہتا ہے پر لگا کر اڑ جاؤں اور آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ یہاں نیپال سے سمگلنگ کی ساڑھیاں آئی ہوئی ہیں۔ سستی بھی ہیں اور خوبصورت بھی۔ میں نے ایک ساڑھی تحریر لی ہے۔ اجازت نامہ

بھیج دیجئے اور ہاں آپ کے لئے سمگلنگ کا ایک اونی سوٹ خرید لیا ہے۔ شادی کی سالگرہ پر آپ کو پیش کروں گی۔ لیکن سلواؤں گی جنیجہ اینڈ کمپنی سے۔ آپ کے پرانے ٹیلر ماسٹر بھقر یحیہ اینڈ کمپنی سے نہیں۔ وہ تو لٹیرے ہیں۔

اور کیا لکھوں؟ آپ گھر کے حالات لکھیں تو میں بھی ان کی روشنی میں آپ کو کچھ مزید لکھ سکوں۔ چھوٹی منی کے ننھے منھے انگوٹھے کا عکس اس خط پر بھیج رہی ہوں اسے چوم لیں۔ میں نے چوم لیا ہے۔ فکر نہ کریں۔

آپ کی

بڑے پپو، چھوٹے پپو، منی نمبر ایک اور

منی نمبر دو کی ماں ......"

(دستخط اصلی ہیں)

شوخیٔ گفتار

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

اور سائیں بابا نے کہا

منہ مانگی موت

ایک نحیف و نزار بوڑھا جھلنگی چارپائی پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔
"آہ! نہ جانے موت کب آئے گی؟"
اتنے میں موت آگئی اور بولی۔
"بابا میں آگئی ہوں!"
بوڑھا ناراض ہوکر بولا
"بڑی بے وقوف ہو۔ میں نے تو اپنے لڑکے کو بلایا تھا۔ کہ وہ آکر میری خبر گیری کرے۔"
موت نے کہا۔
"بابا! میں تمہارا لڑکا ہوں"

دو دوست، دو دشمن

جنگل میں جاتے جاتے سائیں بابا نے دیکھا کہ ایک کوڑیالا سانپ مرا پڑا ہے۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک نیولا بھی مرا پڑا تھا۔
سائیں بابا نے نیولے کو اٹھایا اور سانپ کے پاس لاکر رکھ دیا۔ ان دونوں

کی باہیں ایک دوسرے کی گردن میں ڈال دیں۔ بالکل دو دوستوں کی طرح وہ ایک دوسرے کی گردن میں باہیں ڈالے پڑے رہے۔

چند منٹ تک سائیں بابا انھیں دیکھتا رہا۔ اچانک ان دونوں میں ایک حرکت سی پیدا ہوئی۔ دونوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ دونوں نے آنکھیں کھول کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

اور پھر دونوں آگ بگولا ہو کر ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔

کامیاب یتیم خانہ

یتیم خانے کے انچارج نے مجھے بتایا۔

"ان سب بچوں کے ماں باپ مر چکے ہیں۔"

"افسوس!"

"افسوس کی کوئی بات نہیں ہم انھیں پالیں پوسیں گے۔ انھیں کام سکھائیں گے انھیں باروزگار سکھائیں گے ان کی شادیاں کریں گے۔ ان کے بچے پیدا ہوں گے"

"اور پھر ان میں سے کئیوں کے بچے یتیم ہو جائیں گے۔" "افسوس!"

"افسوس کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ ہم انھیں پھر یتیم خانے میں داخل کر دیں گے آپ شاید نہیں جانتے کہ ہمارا یتیم خانہ گزشتہ ایک سو سال سے قائم ہے اور بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔

حسن کی قیمت

ایک مشہور و معروف مصور نے ایک حسینہ کی تصویر بنائی۔ اس حسینہ کے خد و خال میں اتنی ترا کتیں اور جسم میں اتنی قوسیں تھیں کہ تصویر دیکھتے ہی ہر شخص اسے خرید لینا اور اپنے سینے سے لگا لینا۔ اور جب یہ تصویر ایک بین الاقوامی نمائش میں پیش کی گئی تو اسے اعلیٰ درجہ کا حسن قرار دیا گیا — اور وہ تصویر ایک بھکارن

کی تھی۔ جو آج بھی سڑکوں پر ایک ایک پیسے کی بھیک مانگتی پھرتی ہے!

حسین کون؟

میں نے چکور سے پوچھا۔ دنیا میں سب سے زیادہ حسین کون ہے؟
اس نے کہا چاند۔" میں نے ایک سیٹھ سے پوچھا" سب سے زیادہ حسین کون ہے؟" وہ بولا
"روپیہ" میں نے ایک طوائف سے پوچھا" سب سے زیادہ حسین کون ہے؟" وہ بولی
"گاہک" میں نے ایک ننھے سے بچے سے پوچھا" سب سے زیادہ حسین کون ہے"
کہا" دودھ!"

اور پھر میں نے ایک پاگل سے پوچھا" بتاؤ تمہارے خیال میں سب سے زیادہ
حسین کون ہے؟" اس نے ہنس کر کہا۔ خود میں۔

حسینہ کی نگاہیں

حسینہ نے درخت کی طرف دیکھا تو درخت پر پھول کھل اٹھے۔ حسینہ نے ایک
کار کی طرف دیکھا تو مارکیٹ میں کاروں کا نرخ دوگنا ہو گیا۔ حسینہ نے ایک پتھر کی طرف دیکھا
تو وہ سنگ مرمر بن کر محل میں جا لگا۔ اور حسینہ نے شراب کی بوتل کی طرف دیکھا تو اس
کی پرستش شروع کر دی گئی۔

لیکن حسینہ نے جب ایک انسان کی طرف دیکھا۔ تو اس انسان کو قانون
نے پھانسی پر لٹکا دیا۔

بہادر عاشق

ایک میاں بیوی ایک عاشقانہ فلم دیکھ کر آئے اور گھر آکر دونوں فلم کے
ہیرو ہیروئن کی طرح عاشقانہ مکالمے بولنے لگے۔

میاں نے کہا" پیاری! یہ چاند اور ستارے گواہ ہیں کہ میں تمہاری خاطر

اپنی جان تک دیدوں گا۔"

بیوی نے کہا: "پیارے! میں تمھاری خاطر سارے سماج کو ٹھکرا دوں گی اور تمھارے پاس آجاؤں گی۔"

اور پھر دونوں نے بیک آواز کہا: "یہ مکالمے تو شادی سے پہلے کے ہیں۔"

قحط کا مقابلہ

شہر میں غذائی قحط پڑ گیا۔ معززینِ شہر نے بڑی تیزی سے غلّے کے اسٹاک بھر لئے لوگوں میں ہاہاکار مچ گئی۔ اناج کا دانہ دانہ بلیک مارکیٹ میں ملنے لگا۔ فٹ پاتھوں پر چلتے چلتے فاقہ کش اچانک گر پڑتے۔ اور دم توڑ دیتے۔ ہاتھ دعاؤں کو اٹھتے مگر نقاہت سے لٹک کر رہ جاتے۔

اور پھر شہر کے بڑے حاکم نے صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک رلیف کمیٹی بنائی۔ اور اس کمیٹی میں جتنے ممبر لئے گئے وہ سب غلّے کے بلیک مارکیٹیے تھے۔

بے روح فقرے

ایک معزز آدمی نے اپنے گھر کے اندر ایک نہایت خوبصورت فریم میں مندرجہ ذیل ماٹو لکھ کر لٹکا رکھا تھا۔

"بے ایمان آدمی جہنم میں جاتا ہے۔"
"امانت میں خیانت کرنا گناہ ہے۔"
"کسی کا حق چھیننا بزدلی ہے۔"

اور جس آرٹسٹ نے یہ ماٹو لکھا تھا، وہ اپنی اجرت حاصل کرنے کے لئے عمر بھر روتا رہا۔

شہر کے کتے

شہر کے دو معززین کلب میں بیٹھے مے نوشی میں مصروف تھے۔ ایک معزز

شہر نے ہرلاتے ہوئے کہا۔
"اے اگر میں چاہوں تو شہر کے تمام کتے تم پر چھوڑ سکتا ہوں۔"
دوسرا معزز بولا۔
"مگر کتے لاؤ گے کہاں سے؟"
"میں شہر کے تمام کتے خرید لوں گا۔"
"وہ تو پہلے ہی خرید چکا ہوں۔"
"کس لیے؟"
"تم پر چھوڑنے کے لیے۔"

الو کا مریض

شہر کے مشہور و معروف ڈاکٹر چودھری کے مطب میں ایک بیٹا کٹا مریض آیا ہوا اور ڈاکٹر کے قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔
"ڈاکٹر صاحب! سنا ہے، آپ انسان کی ہر بیماری کا علاج کرتے ہیں۔"
"آپ نے ٹھیک سنا ہے۔"
مریض بولا "ڈاکٹر صاحب! مجھے ایک نہایت خوفناک اور کمینہ مرض ہے۔ آپ میرا علاج کر دیجئے۔"
ڈاکٹر نے "فرمائیے، کیا مرض ہے آپ کو؟"
یہ سن کر ہٹے کٹے مریض نے ڈاکٹر کے منہ پر ایک گھونسہ جمایا، میز پر پڑا ہوا ڈاکٹر کا ہیٹ اٹھایا اور ہنستے ہوئے باہر چلا گیا

سائنس دان

سائنس دان اچھلتا کودتا ہوا اپنی لیبارٹری سے اچانک باہر نکل آیا اور جوش مسرت میں اپنے ننھے سے بچے کے دونوں گالوں کو پکڑ کر بولا "ننھے ننھے! تم یہ جان کر

خوش ہو کے میں نے آخر وہ حیرت انگیز چیز ایجاد کر لی ہے۔"
بچہ بولا "یہ کیا چیز ہے"
سائنس داں نے کہا "ایک ایسی چیز جس سے میں دنیا کے ہر آدمی کو ایک سیکنڈ میں مار سکتا ہوں۔"
بچہ خوش ہو کر بولا "تو ڈیڈی! پہلے مجھے مار کر دکھاؤ اس چیز سے"

ٹیچر۔

ایک ٹیچر ہر روز گدھے پر سوار ہو کر مدرسے جایا کرتا تھا۔ ایک دن حسب معمول جب وہ گدھے پر سوار ہو کر جا رہا تھا۔ تو گدھے نے کہا ——
"کیوں جی، آپ ہر روز مدرسے میں کیا کرنے جاتے ہیں۔"
ٹیچر بولا "میں لڑکوں کو علم سکھانے جاتا ہوں۔"
گدھا بولا "علم سیکھنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟"
ٹیچر نے کہا "علم سیکھنے سے عقل آجاتی ہے۔"
گدھا کہنے لگا "تو پھر ماسٹر جی! مجھے بھی عقل سکھا دو"
ٹیچر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں، اگر میں نے تمھیں عقل سکھا دی تو پھر سواری کس پر کروں گا؟"

لیڈر

اسٹیج کی کرسی پر بیٹھے ہوئے لیڈر نے نہایت جذبات انگیز لہجہ میں کہا۔ "پیارے حاضرین! میری زندگی کا واحد مقصد عوام کی خدمت کرنا ہے۔ میرا ہر قدم عوام کے مفاد ہی کے لئے اٹھتا ہے! میں نے جتنی قربانیاں کیں وہ صرف آپ لوگوں کے لئے کیں اور مجھے فخر ہے کہ میں عوام کی تمناؤں کا عکس بن گیا ہوں۔ کیا آپ میں سے کسی کو بھی میرے اس خلوص پر شک ہے؟"

حاضرین میں سے ایک شخص اٹھا اور بولا "ہاں مجھے شک ہے۔"
یہ سن کر لیڈر نے اس شخص کو اسٹیج پر بلا لیا اور اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھا دیا۔

کلرک

کلرک کی بیوی نے ساتویں بچے کو جنم دیتے وقت درد سے کراہتے ہوئے کہا۔
"آہ بچے بڑھتے جا رہے ہیں مگر ہماری تنخواہ نہیں بڑھ رہی۔"
کلرک نے اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا "ہاں مگر بچے بھگوان دیتا ہے اور تنخواہ دفتر دیتا ہے۔"

وکیل

عدالت میں ایک وکیل بطور ملزم پیش کیا گیا۔ جج نے اس سے کہا۔ "نہایت افسوس کی بات ہے کہ آپ نے قانون داں ہو کر بھی قانون توڑا ہے۔"
ایک وکیل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "مائی لارڈ۔ قانون توڑنے سے پہلے میں نے قانون کی کتاب اچھی طرح پڑھ لی تھی اور یہ تسلی کر لی تھی کہ اس قانون شکنی کے توڑنے کے لئے کونسا قانون موجود ہے۔"

گداگر

ایک پڑھا لکھا گداگر گداگروں کا لیڈر بن گیا۔ چونکہ اس کا زیادہ تر وقت گداگروں کی تنظیم اور ان کے حقوق کی حفاظت پر صرف ہونے لگا۔ اس لئے گداگروں کی طرف سے اس کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ ہر گداگر اس وظیفہ کے سلسلے میں ہر مہینے ایک روپیہ ادا کیا کرتا
ایک مرتبہ گداگروں کے لیڈر سے کسی نے پوچھا "استاد! یہ اچھا ہوا کہ تم سے گداگری چھوٹ گئی۔ اور اب تم ایک معزز شہری بن گئے ہو۔"

وہ زہریلے تبسم کے ساتھ بولا۔ "گداگری کہاں چھوڑی ہے؟ میں ابھی تک بھیک مانگتا ہوں۔ پہلے راہگیروں سے مانگا کرتا تھا، اب گداگروں سے مانگتا ہوں۔"

[illegible]

اخبار کے ایڈیٹر سے اس کے ایک دوست نے پوچھا۔
"کیا یہ صحیح ہے کہ تمھاری معلومات بے حد وسیع ہیں؟"
ایڈیٹر فخر سے بولا۔ "ہاں"
دوست نے پھر پوچھا "اور کیا یہ بھی صحیح ہے۔ کہ تمھیں دنیا کی خبروں کا علم رہتا ہے۔"
"ہاں"
"معاف کرنا تمھیں دنیا بھر کی خبروں کا علم ہے، مگر اپنے بارے میں ایک چھوٹی سی خبر کا بھی علم نہیں؟"
وہ کیا؟"
"وہ یہ کہ تمھارے سر کے بال اڑ گئے ہیں"

بڑھئی

بڑھئی نے ایک کرسی بنائی اور بازار میں جاکر بیچ دی۔ وہ روپے لے کر بازار میں آٹا لینے گیا۔ آٹا تولتے وقت دوکاندار نے ڈنڈی ماری جس پر بڑھئی کو تاؤ آگیا۔ اس نے دوکاندار کو برا بھلا کہا۔ دوکاندار نے اسے گالی دی۔ بڑھئی نے مکہ مار کر دوکاندار کا دانت توڑ دیا۔ بڑھئی کو گرفتار کر لیا گیا۔ کئی مہینے اس پر مقدمہ چلتا رہا اور آخر عدالت نے اسے چھ ماہ کی سزا دے دی۔

جس جج نے بڑھئی کو سزا کا حکم سنایا وہ اسی بڑھئی کی بنائی ہوئی کرسی پر بیٹھا تھا۔

چور

ایک چور رات کو کسی کے گھر میں داخل ہوا۔ جس کمرہ میں داخل ہوا وہاں اندھیرا تھا۔ مگر ملحق کمرہ میں روشنی ہو رہی تھی۔ اور اندر سے میاں بیوی کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میاں کہہ رہا تھا "پیاری آج تو ہر گھر میں روشنی ہو رہی ہے سارا شہر جاگ رہا ہے۔ اس لئے آج کہیں نقب نہیں لگا سکا۔"

بیوی بولی :" اس کا مطلب ہے، آج تم خالی ہاتھ لوٹ آئے، کوئی بھی چیز چرا کر نہیں لائے ؟"

میاں بولا :" نہیں نہیں۔ ایک گھر میں تھوڑا سا موقع ملا۔ تو ایک گھڑی میرے ہاتھ لگ گئی :" جو ساتھ والے کمرہ میں میز کی دراز میں رکھ آیا ہوں "

میاں بیوی کی یہ گفتگو سن کر پہلے چور نے میز کی دراز کھولی۔ اور گھڑی اٹھا کر مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

شاعر

شاعر کو خدا کے حضور میں پیش کیا گیا۔ خدا نے پوچھا " شاعر! تم چونکہ ہمارے خاص آزاد منش بندے ہو اس لئے تم خود ہی بتاؤ کہ تم جنت میں رہنا پسند کرو گے یا دوزخ میں ؟"

شاعر بولا :" جہاں سامعین کی تعداد زیادہ ہو
چنانچہ خدا نے اسے دوزخ میں بھیج دیا

تربیت گاہ

ننھے کی ماں ننھے کے ابا سے جھگڑا کر رہی تھی۔

" ننھا گالیاں بکنے کا عادی ہو گیا ہے، اور تم نے اس بدمعاش کو کھلی چھٹی دے

دیکھی ہے۔"

منّے کے ابا نے کہا "بکواس کرتی ہو تم۔ تم ہی اسے الّو کا پٹھا بنا رہی ہو۔" منّے کی ماں نے کہا "اولاد تمھاری ہے۔ لفنگے کی اولاد بھی لفنگی بنے گی۔ اور کیا بنے گی؟"

منّے کے ابا نے کہا "اور تم کونسے شریف خاندان سے آئی ہو۔ تمھارا باپ بھی تو چور اچکا ہی تھا!"

اور دونوں کا منّا ایک کونے میں بیٹھا ہوا یہ نئی گالیاں سن رہا تھا اور ذہن میں توٹ کر رہا تھا۔

آئینوں کا فرق

اپنی بیوی کو قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے دیکھ کر شوہر نے بڑے مشفقانہ لہجے میں کہا۔ "پیاری! آج تو تم راجہ اندر کے اکھاڑے کی پری معلوم ہو رہی ہو۔"

بیوی نے طعنہ دیتے ہوئے کہا "کل تو تم کہہ رہے تھے کہ تم چڑیل ہو۔ ڈائن ہو۔" کل تم میرے سامنے کھڑی تھیں۔ مگر آج آئینے کے سامنے کھڑی ہو۔"

بے نیاز جوڑا

سرکار کی طرف سے منادی کرائی گئی کہ "ملک کی آبادی خطرناک حد تک بڑھ رہی ہے۔ اس لئے سرکار ملک کے ہر میاں بیوی سے اپیل کرتی ہے کہ وہ کم سے کم بچے پیدا کیا کریں۔"

ایک جوڑے نے بازار میں چلتے چلتے یہ منادی ایک کان سے سنی اور دوسرے سے اڑا دی۔ کیونکہ ان کے ہاں گزشتہ بیس سال سے ایک بھی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

بیوی کا سہاگ

بیوی آنسوؤں، ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی "میں کہتی ہوں

اس گھر میں آکر تو میرے بھاگ ہی پھوٹ گئے۔ آخر یہاں آکر مجھے کیا ملا؟"
نیچے سڑک پر سے ایک خوانچے والے کی آواز آئی۔ "پاپڑ کرارے!"

بھگوان کا فیصلہ

مندر میں بھگوان کرشن کی مورتی کے سامنے ایک عورت آنکھیں بند کئے پرارتھنا کر رہی تھی۔ اے مرلی منوہر! میرے خاوند کو بدھی عطا کر تاکہ وہ دوسرے دن کے بعد کا وقت میں نہ آیا کرے۔"

بھگوان کی مورتی جیسے بول اٹھی۔ "ابھی دس منٹ پہلے ہی تیرا خاوند بھی مجھ سے یہی کہہ گیا ہے۔

تعلیم کا مقصد

ایک خدا ترس اور نیک وکیل صاحب ہر روز ایک طوائف کے ہاں جاتے اور رات گئے لوٹ آتے۔ میں نے ایک دن ان سے پوچھا "آپ ہر روز طوائف کے ہاں کیوں جاتے ہیں؟ ایک مہذب آدمی کے لئے یہ بات نہایت نامناسب ہے!"

وہ گردن اکڑا کر بولے!" میں اس سے تہذیب سیکھنے جاتا ہوں۔

بیٹے کے باپ

طوائف کے ننھے سے معصوم بچے نے ایک دن ماں سے پوچھا۔" ماں یہ ہر روز ہمارے گھر میں اتنے آدمی کیوں آجاتے ہیں؟"

طوائف نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

"بیٹا! میں خود ان آدمیوں کو یہاں بلاتی ہوں تاکہ تم پہچان سکو کہ ان میں سے تمہارا باپ کون ہے؟"

رنگین مقولے

جو لوگ طوائف سے نفرت کرتے ہیں طوائف ان سے کبھی نفرت نہیں کرتی۔

جس سماج میں محبت کرنا جرم ہو وہاں قحبہ خانے کھولنا کوئی جرم نہیں۔

طوائفوں کے لائسنسوں سے جو رقم وصول کی جاتی ہے وہ اخلاق سدھارنے والی سبھاؤں پر خرچ کی جاتی ہے۔

زکام

ایک مرتبہ ایک بڑے آدمی کو زکام ہوا۔ سات دن تک سات اعلیٰ ڈاکٹر اس کا علاج کرتے رہے۔ احتیاط، پرہیز، اور علاج پر سات سو روپے خرچ ہو گئے جب اسے زکام سے افاقہ ہوا تو اس نے اپنی صحت یابی کی خوشی میں ایک بہت بڑی دعوت دی۔ شہر کے بہت سے معززین دعوت میں شریک ہوئے۔ دعوت، آرکسٹرا اور فقیروں کو خیرات پر ایک ہزار روپیہ اٹھ گیا۔

قسمت کا دھنی

ایک دن بڑے آدمی نے ایک جیوتشی کو بلا کر پوچھا
"کیا تم بتا سکتے ہو کہ کل ہمارے ساتھ کیا ہو گا؟"
جیوتشی نے تاروں کا حساب لگا کر بتایا۔
"ہاں جناب! کل آپ کو دس ہزار روپے اچانک مل جائیں گے"
اور دوسرے دن بڑے آدمی کا کتا مر گیا جو دس ہزار روپے میں بیمہ شدہ تھا۔

تیلی کا تماشہ

چھوٹے آدمی سے کسی نے کہا۔
"ٹھیرو — !"
وہ ٹھیر گیا، اس کے بعد چھوٹے آدمی سے کہا گیا
"چلو — !"

وہ چلنے لگا۔ پھر کیا گیا
"لوٹ آؤ — !"
وہ واپس آگیا
اس سے پوچھا گیا۔ "تم نے میرے ہر حکم کی تعمیل کیوں کی؟"
چھوٹے آدمی نے کہا۔
"اگر میں یہ جانتا ہوتا کہ میں نے آپ کے ہر حکم کی تعمیل کیوں کی؟ تو آپ کے حکم کی تعمیل ہی کیوں کرتا؟"

گالیوں کا نرخ

چھوٹا آدمی ہانپتا کانپتا ایک سیٹھ صاحب کے پاس آیا اور گھبراتے ہوئے بولا۔
"آپ نے مجھے پانچ روپے دیئے تھے۔ تاکہ میں جاکر گپتے کو ایک گالی دے آؤں؟"
"ہاں دیئے تھے!"
"تو میں اسے گالی دے آیا ہوں۔ اور اس نے جواب میں مجھے دو گالیاں دی ہیں۔"
"ہاں! میں نے اسے دس روپے دیئے تھے، تمھیں گالی دینے کے لئے۔"

اپدیش کا اثر

جلسے میں ایک بہت بڑا ودوان برہمن اپدیش دے رہا تھا۔
وہ آدمی بہت بڑا ہے جو صدق دل سے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیتا ہے!"
چھوٹے آدمی نے یہ اپدیش سنا اور قریبی تھانے میں جاکر اپنے تمام سابقہ گناہوں کی رپورٹ دے دی۔ اور تھانہ دار نے اسے پکڑ کر جیل میں ٹھونس دیا۔

کیوں؟

چھوٹے آدمی کو سرکار کی طرف سے "عظیم فنکار" کا خطاب دے دیا گیا۔
چھوٹے آدمی کو امیروں کے کلب کا اعزازی ممبر بنا دیا گیا۔
چھوٹے آدمی کی تعریف میں بڑے بڑے اخباروں نے مضامین شائع کئے۔
چھوٹے آدمی کا شہرہ سارے ملک میں ہو گیا۔
کیوں —؟ کیونکہ وہ اب چھوٹے آدمیوں سے نفرت کرنے لگا تھا۔

چور

ایک چھوٹے آدمی نے دوسرے چھوٹے آدمی کی قمیص چرا لی۔ دوسرے نے پہلے کی پگڑی چرا لی۔ پہلے نے دوسرے کا جوتا چرا لیا۔ دوسرے نے پہلے کی دھوتی چرا لی۔ پہلے نے دوسرے کا تہبند چرا لیا۔ دوسرے نے پہلے کی . . . . .
ہفتہ بھر بعد دونوں ایک دوسرے کا لباس پہنے پھر رہے تھے۔

دعا قبول

ملک میں زبردست قحط پڑ گیا تو چھوٹے آدمی نے صدق دل سے دعا مانگی
"بھگوان! بارش بھیج دے تاکہ ہم موت سے بچ جائیں!"
بھگوان نے دُعا قبول کی اور موسلا دھار بارش بھیج دی۔
اور بارش میں چھوٹے آدمی کا مکان گر گیا اور چھوٹا آدمی اس کے نیچے دب کر مر گیا۔

سمجھدار

رات کو چھوٹے آدمی کے گھر ایک چور گھس آیا۔ چھوٹے آدمی کی آنکھ کھل گئی

گئی اور اس نے چور سے کہا ۔ "کیوں بھیا کچھ ملا ؟"

چور نے کہا ۔ "کچھ بھی نہیں ملا ۔ مگر ہاں ایک سبق ضرور ملا ۔"

"کیا ۔۔۔ ؟"

"یہی کہ تم مال و دولت سے محروم ہو اور میں عقل سے !"

ایک ماتمی خط

ایک تجارتی فرم کے مالک کو صبح ڈاک سے ایک خط ملا ۔

میسرز ڈھنگا مل گونگا مل جی ! میں نہایت افسوس کے ساتھ آپ کو یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ آپ کے پرانے اور گہرے دوست مسٹر سر جیت کل رات انتقال کر گئے ۔ ان پر اچانک نمونیہ کا حملہ ہوا اور وہ باوجود فوری طبی امداد کے جانبر نہ ہو سکے ۔

آپ کا :

شام ناتھ برادر حقیقی سر جیت

فرم کے مالک نے خط پڑھ کر میز کے نیچے پھینک دیا ۔ اور اپنے خزانچی کو آواز دے کر کہا ۔

"منیم جی ! ذرا دیکھنا مسٹر سر جیت کے نام ہمارے کتنے روپے نکلتے ہیں ۔"

رزق دینے والا

ایک طوائف خدا کی بہت زیادہ قائل تھی ۔ برابر اس کی عبادت کیا کرتی تھی ایک دن میں نے پوچھا ۔

"اری تو طوائف ہو کر خدا کی عبادت کرتی ہے تجھے کیا پڑی ہے خدا کی ؟"

وہ بولی ۔

"سائیں بابا ! میں نے جس وقت بھی خدا سے دعا مانگی ہے ۔ اسی وقت اس نے کوئی نہ کوئی گاہک بھیج دیا ۔۔۔ اس لئے رزق دینے والے کی عبادت کرنی ہی چاہیے"

ماڈرن ہتوپدیش

ہریجنوں کا ٹھانیدار

ہریجن خاکروبوں کی ہنگامی میٹنگ میں ہریجن لیڈر غصے کے مارے جھاگ اڑاتے ہوئے بول رہا تھا "میں... میں.. اس بدماغ ٹھانیدار کا خون پی جاؤں گا جس نے ہمارے ہریجن خاکروبوں کی توہین کی ہے۔ تم مجھے آگیا دیدو تو میں اس کا سر کاٹ کر اس ہریجن بستی کے چوراہے پر لٹکا دونگا۔ بھائیو! ہم اور تم غریب ضرور ہیں۔ لیکن ہم اپنی غیرت اور خودی کو فروخت نہیں کر سکتے۔ میں اس ٹھانیدار کو عدالت کے کٹہرے میں جا کر کھڑا کر دوں گا۔ تم سب "مقدمہ فنڈ" کے لئے ایک ایک روپیہ نکال دو۔ میں کل ہی اس کے خلاف دعویٰ دائر کر دوں گا۔"

مقدمہ فنڈ میں پچاس روپے اکٹھے ہو گئے جو ہریجن لیڈر کو سونپ دیئے گئے ہریجن لیڈر میٹنگ سے اٹھ کر سیدھا "وائن شاپ" پہنچا اور ان روپوں سے وہسکی اور اس کے لوازمات خرید لئے۔

رات کو ہریجن لیڈر اور ٹھانیدار دونوں مل کر ایک دوسرے کی صحت کے جام پی رہے تھے۔

مصرع پر گرہ۔

کافی ہاؤس میں دو شاعر آپس میں الجھ پڑے۔ کافی دیر تک بحث مباحثہ کرنے کے

پر ایک شاعر کو اشتعال آگیا اور اس نے دوسرے شاعر کے منہ پر تھپڑ لگا کر کہا۔" یہ میرا مصرع طرح ہے۔"

دوسرے شاعر نے فوراً جوابی تھپڑ لگاتے ہوئے کہا" اور یہ میں نے گرہ لگائی ہے۔

شیر اور بکری

ایک بار کا ذکر ہے کہ ایک کلرک اور اس کا افسر دونوں دوست بن گئے۔ دونوں اکثر اکٹھے دیکھے جاتے کبھی کلرک اپنے افسر کی کوٹھی پر ڈنر کھانے چلا جاتا اور کبھی افسر اپنے کلرک کے کوارٹر پر پہنچ کر ڈنر کھاتا۔ دونوں ایک ساتھ وہسکی پیا کرتے تھے۔ کافی ہاؤسوں میں سینماؤں میں، کلبوں میں، تھیٹروں میں حتیٰ کہ کبھی کبھی شکار کے لئے بھی اکٹھے ہی جنگل میں جایا کرتے کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اس کل یگ میں بھی شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی کیسے پی رہے ہیں۔

بڑی دیر کے بعد کھلا کہ کلرک کی بیوی انتہائی حسین تھی۔

کبھر شٹاچاری رپورٹ

صوبائی اسمبلی میں ایک وزیر نے اعداد وشمار کی ایک رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا" گزشتہ سال صوبے میں اینٹی کرپشن مہم بڑے زور شور سے چلائی گئی۔ اس مہم کے نتیجے میں آٹھ چپڑاسی برخاست کئے گئے، پندرہ کلرک معطل کئے گئے۔ تین جونیئر افسروں پر جرمانے کئے گئے اور دو بڑے افسروں کو وارننگ دی گئی۔"

اسمبلی کے ممبر نے بآواز بلند کہا" اور آپ کو کیوں گرفتار نہیں کیا گیا۔ جبکہ آپ بہت بڑے کبھر شٹاچاری ہیں۔"

وزیر نے فوراً کہا" کیونکہ مجھے اسمبلی میں یہ رپورٹ پیش کرنی تھی۔

ایک عاشقانہ تحفہ

ایک صاحب ایک محترمہ پر عاشق ہو گئے۔ عشق اپنے پورے شباب پر پہنچ گیا

جب تک وہ روزانہ ایک دوسرے سے مل نہ لیتے، چین نہ پڑتا۔ محبوبہ اپنے عاشق کو ہر روز کسی نہ کسی جگہ پر پہنچنے کا وقت دے دیتی۔ کبھی انڈیا گیٹ، کبھی چاندنی چوک، کبھی بدھا گارڈن، کبھی لیوسنت سرائے اور کبھی کسی سنیما ہال میں اور عاشق اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ جاتا۔ ہر روز مختلف بسیں بدل بدل کر بسوں کے انتظار میں تھک ہار کر، بسوں کے اندر دھکم پیل کرتا ہوا بالآخر مقام محبوبہ تک پہنچ جاتا۔

ایک مرتبہ جب وہ اسی طرح تھکا ہارا محبوبہ کے پاس پہنچا تو محبوبہ بڑے رومانٹک موڈ میں تھی۔ جذبہ عشق سے چور چور ہو کر بولی "پیارے میرا جی چاہتا ہے آج تمھیں کوئی تحفہ لے دوں۔ بتاؤ کیا لے دوں؟"

عاشق بولا "ایک بائیسکل لے دو۔"

جیوتشی

ایک آدمی نے جیوتشی کو اپنا ہاتھ دکھایا۔ جیوتشی نے بڑے غور و خوض سے اس کے ہاتھ کی لکیروں کا معائنہ کیا اور پھر بولا "تمھارے ہاتھ میں عجیب تضاد دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری موت عنقریب واقع ہونے والی ہے لیکن دوسری لکیر کہتی ہے کہ تم موت سے بچ بھی سکتے ہو۔"

شخص مذکور بڑا پریشان ہوا اور بولا "ذرا غور سے دیکھو۔ قسمت میرے ساتھ ڈبل رول کیوں کر رہی ہے۔ کیا کوئی ایسا اپائے نہیں ہے کہ میری موت ٹل جائے؟"

جیوتشی نے کہا "ایک ہی اپائے ہے کہ آپ کسی شخص کو قتل کر دیں تو مزید کئی سال تک زندہ رہ سکتے ہیں۔"

شخص مذکور نے جیب سے چاقو نکالا اور جیوتشی کو قتل کر دیا۔

مورتی کا بھرشٹاچار۔

ایک بہت بڑا سرکاری افسر رشوت لینے کا بری طرح عادی تھا لیکن اس کے

ساتھ ہی وہ خوف خدا کا بڑا قائل تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی کوٹھی کے ایک حصے میں اپنے لئے ایک چھوٹا سا مندر بھی بنوا رکھا تھا۔ جہاں وہ اور اس کا پریوار روزانہ پوجا کیا کرتے تھے۔ ایک چھوٹی سی پیتل کی مورتی ان کی پوجا کا مرکز تھا۔

ایک مرتبہ کسی شخص کا کیس اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ شخص بھی بھگوان کا بڑا بھگت تھا۔ اس نے اپنے کیس کے سلسلے میں افسر مذکور سے کہا "آپ جو کچھ فرمائیں گے میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ میرا کیس ٹھیک کر دیجئے۔"

"افسر نے پوچھا" کیا دو گے؟"

"جو مانگو گے۔"

"اچھا، تو میرے گھر کے مندر کے لئے چھ فٹ لمبی اور ایک من بھاری بھگوان کی مورتی بنوا کر دیدیجئے۔"

پندرہ دن بعد ہی مورتی اس کے مندر میں ستھاپت ہو چکی تھی۔

لاکھ طوطے کو پڑھایا۔

ایک بہت بڑے فیکٹری اونر نے اپنی تفریح طبع کے لئے ایک طوطا خریدا اور اپنی کوٹھی کے مین گیٹ کے پاس اس کا پنجرا لٹکا دیا۔ اس نے طوطے کی خوب پرورش کی کھانے کو پستہ اور پینے کو شراب دیا کرتا تھا۔ طوطا بے حد پیارا تھا۔ فیکٹری اونر نے اس طوطے کو ایک فقرہ بھی سکھا دیا۔ کہ جب بھی میں کوٹھی سے باہر نکل کر دفتر کی طرف جانے لگوں تو تم یہ فقرہ کہا کرنا۔ "اب کب لوٹو گے؟"

چنانچہ طوطا یہ فقرہ سیکھ گیا اور ہر روز جب سیٹھ جی باہر جانے لگتے طوطا بے ساختہ کہہ اٹھتا "اب کب لوٹو گے"۔ قضا را سیٹھ جی انتقال کر گئے۔ جب ان کی ارتھی کوٹھی سے باہر نکلنے لگی تو طوطے نے بے ساختہ کہا۔ "اب کب لوٹو گے؟"

حاتم طائی دہلی میں

چند دن ہوئے، حاتم طائی دہلی میں آیا۔ کیونکہ اس کے پاس دہلی کے پوسٹ آفس سے سیکڑوں خط پوسٹ کئے گئے تھے کہ کبھی دہلی میں بھی قدم رنجہ فرمائیے یہاں کے باشندے آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔

چنانچہ حاتم طائی کو ایک دن رحم آگیا اور وہ دہلی میں آگیا۔ اسے راستے میں جو بھی حاجت مند ملا۔ اس نے اس کی حاجت پوری کر دی۔ بھکاری کلرک مزدور ٹیچر دکاندار وکیل، حتیٰ کہ ایک رشوت خور افسر کو بھی اس نے دس ہزار روپے دے دیئے۔ کیونکہ اسے اپنی بیٹی کی شادی پر شاندار جہیز دینا تھا۔ ہوتے ہوتے یہ خبر سارے دہلی شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ حاتم طائی شہر میں آیا ہوا ہے اور وہ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹا رہا ہے۔ چنانچہ سارے باشندے اپنا کام کاج چھوڑ کر حاتم طائی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ وہ حاتم طائی کو شام تک ڈھونڈتے رہے۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ آخر اخبار کے ایک ایڈیٹر نے۔ اس کا پتہ چلا لیا اور اسے معلوم ہوا کہ جتنا روپیہ وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ سبھی بانٹ چکا اور اس کے پاس روٹی کھانے کے لئے بھی پیسے نہیں بچے۔ چنانچہ اس نے اللہ کے نام پر ایک ایک راہگیر سے بھیک مانگی تو پولیس اسے انسداد گداگری کے قانون کے تحت گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔ اور وہ اس وقت تھانے میں قید ہے۔

کالی داس کہاں رہتا ہے

ایک دن کا ذکر ہے ایک ریڈیو سٹیشن نے فیصلہ کیا کہ مہاکوی کالی داس کا ڈرامہ "شکنتلا" ریڈیو اسٹیشن سے براڈ کاسٹ کیا جائے۔ جب ڈرامہ براڈ کاسٹ کے لئے بالکل تیار ہو گیا تو وہ افسر جو ڈرامہ پروگراموں کا انچارج تھا دوڑا دوڑا اسٹیشن ڈائریکٹر کے پاس آیا اور گھبرا کر بولا "سر۔ اس ڈرامے کے کنٹریکٹ پر مصنف کے دستخط

کرد ا سے ہیں۔ لیکن کالی داس جی کا ایڈریس ہی نہیں مل رہا ہے کیا کیا جائے؟" اسٹیشن ڈائرکٹر بھی فارر ے گھبرا گیا اور بولا "ہاں رولز کے مطابق مصنف کی اجازت کے بغیر ڈرامہ براڈکاسٹ نہیں کیا جا سکتا لیکن بھائی میرے! کالی داس تو انتقال فرما چکے ہیں؟"

افسر مذکور بولا۔ پھر تو اور بھی مشکل ہے۔" رولز کے مطابق یا تو وہ انتقال نہ کرتے اور یا اب ان کا ڈرامہ براڈکاسٹ نہیں ہو سکتا۔"

اسٹیشن ڈائرکٹر نے ایک منٹ کے لئے توقف کیا اور پھر ایک دم اسے آئیڈیا سوجھ گیا۔ کنٹریکٹ فارم لے کر اس کے نیچے دستخط کر دیئے " کالیداس"

" اب تو ڈرامہ براڈکاسٹ ہو سکتا ہے!" اسٹیشن ڈائرکٹر نے کہا۔

" ہاں لیکن اس کی رائلٹی فیس کا چیک کون وصول کرے گا؟"

" اس کا حل بھی سوچ لیں گے۔ پہلے ڈرامہ براڈکاسٹ ہونے کرلو"

مجھے بھی بیچ دیجئے۔

تاریخی نوادر کی ایک مشہور دکان میں ایک صاحب داخل ہوئے جو تھوڑے سے لنگڑا کر چلتے تھے۔ وہ دکان میں گھوم پھر کر مختلف نوادر دیکھتے رہے اور ان کی قیمت پوچھتے رہے۔ آخر ان کی نظر ایک آئینے پر جا پڑی۔ انھوں نے دکاندار سے پوچھا۔ اس آئینے کی کیا قیمت ہے؟"

ڈھائی لاکھ روپے۔"

" ڈھائی لاکھ؟" گاہک نے حیرت سے پوچھا۔" ایک آئینے کی قیمت ڈھائی لاکھ۔"

" جی جناب ___ یہ وہ آئینہ ہے جس میں ملکہ نور جہاں اپنا چہرہ دیکھا کرتی تھی

دوسری میز پر ایک گلاس رکھا تھا۔ گاہک نے اس کی قیمت پوچھی تو دکاندار

نے کہا ـــ " یہ گلاس پانچ روپے کا ہے۔ کیونکہ اس میں شہنشاہ جہانگیر شراب نوش فرمایا کرتے تھے۔"

اس پر گاہک نے بہت سنجیدگی سے کہا۔ "آپ مجھے بھی اس دکان پر رکھ لیجئے اور مجھے بطور تیمور لنگ کے بیچ دیجئے گا!"

ہنومان کی واپسی

ایک روز کا ذکر ہے کہ پون پُتر ہنومان مختلف ممالک کی سیر کرتے کرتے ہندوستان آ پہنچا۔ اس نے سب سے پہلے بالی اور سگریو کا اتہ پتہ دریافت کیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ دونوں یونائیٹڈ فرنٹ پارٹی میں ایک ساتھ کام کر رہے ہیں اور اپنی منسٹری بنانے کی فکر میں ہیں۔ اس کے بعد وہ آبو پربت پر گیا تاکہ سنجیونی بوٹی کے کچھ پتے حاصل کرے۔ لیکن اسے وہاں جانے سے روک دیا گیا کہ وہاں تو جڑی بوٹیوں کی ریسرچ کے لئے ادارہ کھولا گیا ہے۔ اور وہاں سے بوٹیاں توڑنا قانوناً منع ہے۔ مایوس ہو کر وہ اجودھیا پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ وہاں باڑھ آ چکی ہے ڈوب جانے کا خطرہ ہے۔ وہاں کی فیکٹریاں تک پانی میں ڈوب گئی ہیں۔ تھک ہار کر وہ دہلی آ گیا۔ جہاں اس نے رام اور سیتا کی کھوج شروع کی کسی نے کہا رام اور سیتا فلاں مندر میں رہتے ہیں۔ کسی نے کہا نہیں فلاں مندر میں رہتے ہیں۔ اس نے ہر مندر کے ہر رام اور سیتا کے سامنے اپنا سینہ چیر کر دکھایا۔ جس کے اندر "رام" لکھا ہوا تھا۔ مگر کسی رام اور سیتا نے بھی اسے نہیں پہچانا کہ یہ واقعی ہنومان ہے!

آخر ہنومان مایوس ہو کر دہلی سے اڑا اور لنکا کے ہوائی اڈے پر جا اترا اور وہاں بغیر پاسپورٹ کے لنکا میں داخل ہونے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔

محاورے جو غلط ہو گئے۔

• بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

• لیکن آج کل کوئی چیز چھینکوں میں رکھی ہی نہیں جاتی، ریفریجریٹر میں رکھی جاتی ہے جس سے بلّی کے بھاگ مستقل طور پر پھوٹ چکے ہیں۔

• لنکا میں جو پیدا ہوا باون گز کا!

حالانکہ خود لنکا کے وزیر اعظم کا قد صرف دو گز کا ہے۔

• ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔

آج کل کوئی ڈانسر ایسا بہانہ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ناچ گھر ٹیڑھے بنائے ہی نہیں جاتے۔ آرکٹیکٹ کی سائنس بے حد ترقی کر چکی ہے۔

وہ دونوں برہمن تھے۔

ایک قصبے میں دو برہمن رہتے تھے۔ ایک برہمن ان پڑھ تھا لیکن امیر تھا۔ امیر تھا اور عیار تھا۔ جیسا کہ اکثر امیروں کی خصلت ہوتی ہے۔ اس کے گرد ہر وقت اور ہر موقع پر عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا تھا جو اس کی جھولی روپوں پیسوں سے بھر دیتے تھے۔

دوسرا برہمن غریب تھا لیکن گریجویٹ تھا۔ اسے دھرم کے نام پر لوٹ کھسوٹ کرنا برا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے امیر برہمن کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اور لوگوں کو یہ سمجھانے لگا کہ دھرم ---- بے ایمانی اور لوٹ کی اجازت نہیں دیتا جس طرح یہ امیر برہمن کر رہا ہے۔

امیر برہمن کو اس کے اس پراپیگنڈے سے بہت اندیشہ محسوس ہوا اور ایک

دن اس نے غریب برہمن کو بلا کر کہا۔ "دیکھو، تم بھی برہمن ہو اور میں بھی میرا اور تمھارا خون کا رشتہ ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں" تمھاری کچھ مدد کروں۔"

یہ کہکر اس نے غریب برہمن کو پانچ سو روپے ماہانہ پر اپنے ہاں اکاؤنٹنٹ کی آسامی پر ملازم رکھ لیا اور دونوں برہمن ہنسی خوشی رہنے لگے۔

دھرم کا رکھشک

شہر کے بہت بڑے مندر میں شہر کے بہت بڑے بڑے معززین جمع تھے یہاں وہ مندر کمیٹی کے پردھان کا چناؤ کرنے آئے تھے۔ کئی تقریروں کے بعد سیٹھ ڈھینگر چند جی کو اتفاق رائے سے پردھان چن لیا گیا۔ تالیوں کی گونج میں سیٹھ ڈھینگر چند جی کو پھول مالاؤں سے لاد دیا گیا۔ سیٹھ جی نے جوابی تقریر میں سب کا شکریہ ادا کیا اور سر نیاز جھکا کر بھگوان کی مورتی کے سامنے وعدہ کیا کہ وہ دھرم کی رکشا کے لئے اپنی جان تک نثار کر دیں گے۔

جب پردھان جی مندر سے باہر تشریف لائے تو ایک پولیس پارٹی نے انھیں افیون کی اسمگلنگ کے جرم میں گرفتار کر لیا۔

حضرت عیسیٰ مسیح

سڑک کے بائیں فٹ پاتھ پر دو آدمی آپس میں لڑتے رہے۔ دونوں کے ہاتھوں میں تیز چاقو چمک رہے تھے۔ جس سے وہ ایک دوسرے کو زخمی کرنا چاہتے تھے۔

ایک صاحب انھیں لڑتے دیکھ کر تیزی سے ان کی طرف لپکے اور ان دونوں کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ایک پرزہ دے کر چلے گئے۔ دونوں نے پرزے کی طرف دیکھا۔ اس پر لکھا تھا:

"ڈاکٹر بھیم سنگھ سرجن۔"
"ہمارے کلینک میں زخموں کی مرہم پٹی کا بہترین انتظام ہے۔"

سیدھے سادے جواب

"آپ دوسرے ستیہ آگرہیوں کے ساتھ جیل کیوں نہیں گئے؟"
"مجھے گھر میں تھوڑا سا کام تھا۔"
"آپ دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے گئے تھے۔ لوٹ کیوں آئے؟"
"پانی ٹھنڈا تھا۔"
"آپ نے اپنی محبوبہ کے نام جو "لو لیٹر" لکھا تھا اسے پہنچانے کے لئے خود اس کے گھر کیوں گئے تھے؟"
"ڈاک کا ٹکٹ خریدنے کے لئے پیسے نہیں تھے۔"
"میں نے آپ کو اپنے جنم دن پر ڈنر کا دعوت نامہ بھیجا تھا۔ آپ تشریف کیوں نہیں لائے؟"
"دعوت نامے پر تاریخ درج نہیں تھی۔"
"آپ نے اس بھاری عورت سے کیوں عشق کرنا شروع کر دیا۔ جب کہ آپ کی اپنی بیوی انتہائی خوبصورت تھی؟"
"کیونکہ میری بیوی نے ایک موٹے بھدّے شخص سے عشق شروع کر دیا تھا!"

تین ادھوری خبریں

(۱) اٹلی میں ابھی ابھی ایک ایسی عورت کا انتقال ہوا ہے جس کی عمر ایک سو تیئیس سال تھی۔ خبر میں لکھا گیا ہے کہ اس کی درازیٔ عمر کا راز یہ تھا کہ اس نے ساری

زندگی کسی مرد کے ساتھ جنسی تعلقات قائم نہیں کئے تھے۔

۲۔ ڈاکٹروں نے ایک کا دل دوسرے کے سینے میں فٹ کرنے کے لئے چھ آدمیوں پر تجربے کئے۔ ان میں سے پانچ تجربے ناکام رہے اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ لیکن چھٹا آدمی جس کے سینے میں ایک عورت کا دل فٹ کیا گیا وہ ابھی تک زندہ ہے۔

مرد مر گیا۔ عورت زندہ ہے۔

۳۔ ایک امیر ترین آدمی نے پچاس سال کی عمر میں ایک وصیت لکھ کر رکھ دی کہ جب وہ انتقال کر جائے تو اس کی ساری جائداد ایک ودھوا آشرم کو دے دی جائے۔ لیکن جب وہ اٹھانوے سال کی عمر میں فوت ہوا تو اس وقت اس حد تک دیوالیہ ہو چکا تھا کہ اس کے کفن کے لئے بھی محلے سے چندہ جمع کرنا پڑا۔

دو بھوکے

ایک بلّی نے کہا۔ "میاؤں!"

چوہے نے جواب دیا۔ "لیکن میں بے حد بھوکا ہوں۔ پہلے مجھے کچھ کھانے کو لا کر دو۔"

بلی نے ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے لا کر اسے دیئے۔ جسے چوہا کھا گیا۔ اس کے بعد بلّی چوہے کو کھا گئی۔

ڈر کس سے ہے؟

میں اس سیاست داں سے کبھی نہیں ڈرتا جو اپنے دشمن سے دشمن کا سا سلوک کرتا رہے۔ بلکہ میں تو صرف اس سیاست داں سے ڈرتا ہوں جو دشمن کے ساتھ دوستی کا سلوک کرتا ہے اور اسے دشمنی کرنے کے قابل نہیں رہنے دیتا

لازم و ملزوم

میں نے ایک سیاست داں سے پوچھا۔
"تم نے ڈھٹائی تم کہاں سیکھی؟"
"وہ بولا سیاست سے۔"
"اور سیاست کہاں سیکھی؟"
"ڈھٹائی سے!

دو دوست

گلی میں ایک بچہ کھڑا رو رہا تھا۔ ایک پاگل نے اسے اٹھایا۔ اور اس کے سامنے زور زور سے ہنسنے لگا۔
بچہ بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔
بچے کی ماں بھاگی بھاگی آئی اور بچے کو چھین کر لے گئی۔
بچہ پھر رونے لگا۔
پاگل بھی رونے لگا۔

بیربل نامہ

ایک بار اکبر بادشاہ نے بیربل سے کہا۔
"بیربل! کل رات ہمیں خواب میں ایک پاگل دکھائی دیا۔ جو کہنے لگا میں بیربل ہوں۔"
بیربل بادشاہ کی اس چھپی چوٹ کو بھانپ گیا، مگر ضبط کر کے بولا۔
"تو حضور نے کیا کیا؟"

بادشاہ بولا۔

"میں نے اس کو اپنا وزیر بنا لیا"۔

بیربل نے فوراً کہا۔ کمبخت بڑا عقلمند تھا۔ حضور کو بھی بے وقوف بنا گیا

کوا یا خدا؟

ایک پاگل نے ایک راہ چلتے آدمی کو زبردستی پکڑ لیا۔ اور آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ دیکھو، وہ آسمان پر جو اڑ رہا ہے۔ یہ خدا ہے یا کوا ہے؟"

اس آدمی نے کہا۔

"کوا ہے!"

پاگل نے اسے چھوڑ دیا اور کہا۔

"جاؤ بھاگ جاؤ۔ تم بھی میری طرح پاگل معلوم ہوتے ہو۔

پاگل بننے کے آزمودہ طریقے

۱۔ ہمیشہ ایسی لڑکی سے عشق شروع کرو — جو انتہائی خوبصورت، اور انتہائی جاہل ہو۔

۲۔ صبح اٹھتے ہی سچ بولنا شروع کر دیجئے۔ انشاء اللہ شام تک ضرور پاگل ہو جائیں گے۔

حق بحق دار رسید

فٹ پاتھ پر ایک بھکاری کی موت واقع ہو گئی۔ اس کی گودڑی میں سے ڈیڑھ

ہزار روپیہ نقد نکل آیا۔ لوگوں نے وہ روپیہ معزز شہر کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اسے مفادِ عامہ کے لئے خرچ کر دے۔

دوسرے دن معزز شہر نے وہ تمام روپیہ شہر کے بھکاریوں میں بانٹ دیا۔ اور روپیہ پھر گودڑیوں میں پہنچ گیا۔

اشتہار باز

علاقے کے دو گروپوں میں لڑائی ہو گئی۔ شہر کے ایک معزز نے بیچ بچاؤ کرانا چاہا۔ تو اسے بھی دو چار لاٹھیاں لگیں۔ اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے اٹھا کر ہسپتال لے جانے لگے تو اس نے اچانک آنکھ کھولی اور کہا۔

ٹھہر جاؤ مجھے فی الحال ہسپتال مت لے جاؤ۔

"کیوں؟"

"پہلے اخبار کے فوٹو گرافر کو جاؤ تاکہ وہ میرا فوٹو لے کر کل کے اخبار میں چھاپ دے۔"

دلّی جو ایک شہر ہے

دہلی کا آواگون

کہتے ہیں دہلی کئی بار اجڑی اور کئی بار آباد ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دہلی کو اجڑنے اور آباد ہونے کا پرانا چسکا ہے۔ وہ اجڑنے کے لئے آباد ہوتی ہے اور آباد ہونے کے لئے اجڑتی ہے۔ یعنی آواگون کی تھیوری میں یقین رکھتی ہے۔ بار بار جنم لیتی ہے۔ بار بار مرتی ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ بار بار اسی گھر میں جنم لیتی ہے جہاں سے اس کی ارتھی نکلی ہے، وہی روح وہی نام، وہی مقام — صرف چولا بدل لیتی ہے۔ بلکہ کئی بار تو چولا بھی وہی ہوتا ہے۔ صرف اسے ڈرائی کلین کرا لیتی ہے، اس کا رنگ بدل دیتی ہے، اس پر نئے پھول اور بیل بوٹے کاڑھ لیتی ہے۔ شاید اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے یا نئے نادر شاہ کو ترغیب دینے کے لئے کہ دیکھو میں کتنی پرکشش ہوں۔ آؤ اور میرے حسن کو لوٹ لو۔ میری مانگ اجاڑ دو کیونکہ میں اجڑنے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہوں۔ میری بہار میری خزاں ہی کا عکس ہے۔ مجھے اجاڑ دو، لوٹ لو، مار دو

کیونکہ میری موت ہی سے ـــــ زندگی کا پھول کھلتا ہے۔

دہلی ـــــ ایک اٹھارہ سالہ دوشیزہ

آج کی دہلی ایک ایسی دوشیزہ کی طرح ہے جس پر جوانی ٹوٹ ٹوٹ کر آتی ہے اس سے آنکھ ملانے کے لیے سورج دیوتا کی سی آنکھ چاہیئے اور رِشی وشوامتر کا سا نفس ورنہ یہاں بھرشٹ ہونے میں ایک سکنڈ نہیں لگتا۔ ایک بار جو دہلی آگیا وہ اس کی زلفوں کے جال سے نکل نہ سکا اور جو ابھی تک دہلی نہیں آیا۔ وہ دور بیٹھا اس کے فراق میں آہیں بھر رہا ہے اور کون جانتا ہے کہ وہ ایک آہ ایسی لمبی بھرے کہ خود بخود کھنچ کر دہلی تک آجائے۔ اور دہلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر پوچھے "کیوں صاحب کیا دہلی یہی ہے؟"

اور اسے جواب ملے "معاف کیجئے مجھے فرصت نہیں' اور کسی سے پوچھ لیجئے۔"

کسان سے سمگلر تک

اگر آپ ابھی دہلی نہیں آئے ہیں تو کسی نہ کسی بہانے جلد ہی آجائیں گے۔ کیونکہ دہلی آنے کے کئی بہانے ہیں۔ آپ کسی مظاہرے میں شامل ہو کر آجائیں گے تاکہ پارلیمنٹ کے سامنے آکر مظاہرہ کریں جس کے اردگرد عام طور پر دفعہ ۱۴۴ لگی رہتی ہے۔ وزیر اعظم کی کوٹھی کے باہر بھوک ہڑتال کرنے کے لئے آجائیں گے۔ گاؤں میں بھوکوں مر مر کر دہلی میں نوکری کرنے کے لئے آجائیں گے۔ کیونکہ یہاں کے گناہگار بھکاریوں کے کشکول میں پانچ دس پیسے کے سکے ڈال کر احساس گناہ کم کرنے کے بہت شوقین ہیں اور اگر آپ کے پاس دولت زیادہ ہے تو آپ دہلی کے اشوکا ہوٹل میں چائے پینے کے لئے آجائیں گے۔ جہاں پانچ روپے فی کپ چائے ملتی ہے۔ اور جہاں کے بیرے مغل شہزادے لگتے ہیں۔

معلوم ہوتے ہیں ۔ اور اگر کوئی بہانہ نہ ملے گا تو آپ کوئی نہ کوئی چیز سمگل کرکے دہلی لے آئیں گے گھڑیاں، سونا، اناج، کپڑے، لڑکیاں، عورتیں، کیونکہ دہلی اسمگلروں کی بہت چہیتی منڈی ہے۔ جہاں گھڑی سے لے کر لڑکی تک ہر چیز بغیر رسید پرچے کے منہ مانگے داموں بک جاتی ہے۔

غرض آپ کسی بھی بہانہ سے آئیں گے، جلد یا بدیر دہلی ضرور آئیں گے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ جائیں گے۔ شادی کریں گے۔ بچے پیدا کریں گے، بچے پھر لکھ پتی ہو جائیں گے یا صرف پتی دونوں حالتوں میں دہلی آپ کو برداشت کرے گی۔

اجنبی باشندوں کی بستی

دہلی میں داخل ہونے کے کئی راستے ہیں، اور ہر راستے سے ہر روز ہزاروں لوگ دہلی پر حملہ کرنے کے لئے داخل ہوتے ہیں اور پھر دہلی کے کوچہ و بازار میں یوں کھپ جاتے ہیں کہ دہلی ہی کے باشندے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ایک اجنبی حملہ آور اور دہلی کے مستقل باشندے میں تمیز کرنا انتہائی مشکل ہے۔ آپ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ایک "پہاڑی چھوکرا" جو دہلی کے ایک ہوٹل میں برتن مانجھ رہا ہے۔ آٹھ سال سے دہلی میں مقیم ہے۔ یا آج صبح ہی مدراسیوں کے اڈے پر اترا ہے یا کافی ہاؤس میں جو سیاہ رنگ کا مدراسی جنٹلمین سیاہ رنگ کا سوٹ پہنے سیاہ رنگ کی کافی پی رہا تھا۔ سنٹرل سکریٹریٹ میں گزشتہ دس سال سے کلرکی کر رہا ہے۔ یا آج ہی مدراس میل سے سوار ہو کر دہلی میں کلرکی کرنے آیا ہے۔ اور یا اجمیری گیٹ سے جس تانگہ بان کے تانگے پر آپ سوار ہوئے ہیں وہ ۱۹۴۷ء ہی میں یہاں تانگہ بانی کرنے ــــ آگیا تھا۔ یا سہارنپور میں اس کا چھینی کا ٹھیکہ تھا جو کسی وجہ سے چل نہ سکا اور یہ دہلی میں تانگہ چلانے کے لئے ایک ہی ہفتہ پہلے آیا ہے۔

دہلی کے باشندوں اور باہر سے آنے والوں میں، امتیاز کرنا کیوں مشکل ہے؟ اس لئے کہ موجودہ دہلی کا نہ کوئی اپنا کلچر ہے نہ لباس ہے نہ زبان جس سے یہ پتہ چل سکے کہ یہ دہلی والا ہے اور یہ کلکتے والا اور یہ لکھنؤ والا۔ دہلی کی کسی سڑک پر اگر دو آدمی چل رہے ہوں تو آپ یہ جان کر حیران ہو جائیں گے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے۔ ایک نے کوٹ پتلون پہن رکھا ہے تو دوسرا دھوتی کرتے میں ملبوس ہے۔ ایک نے کوٹ پتلون کے اوپر گاندھی ٹوپی پہنی ہوئی ہے تو دوسرے نے کھدر کی اچکن۔ اور پاجامے کے اوپر ہیٹ لگا رکھی ہے۔ ایک ابھی ابھی ہوٹل سے مچھلی چاول کھا کر نکلا ہے تو دوسرے نے پراٹھا اور چھاچھ نوش فرمائی ہے اور ستم یہ کہ دونوں ہی اپنے آپ کو دہلی کا باشندہ کہتے ہیں۔

حدود اربعہ کہاں ہے؟

دہلی کا حدود اربعہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ریاضی اور جغرافیہ کا کوئی قاعدہ دہلی پر لاگو نہیں ہوتا۔ دہلی ریاضی اور جغرافیہ کو پس پشت ڈال کر آگے نکل گئی ہے۔ کہتے ہیں کچھ قدرتی حدود ہوتی ہیں، جیسے دریا، پہاڑ، نہر جن سے کسی مقام کا حدود اربعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ دہلی میں دریا بھی ہے، پہاڑ بھی اور نہر بھی لیکن دہلی نے قدرت کی لگائی ہوئی ان بندشوں کی پروا نہیں کی۔ اور تیز رفتار سیلاب کی طرح ان کے اوپر سے دندناتی ہوئی گذر گئی۔ آج کل یہ دریا، پہاڑ اور نہریں دہلی شہر کے اندر آ گئی ہیں، یہ دہلی کو قید نہیں کر سکیں بلکہ دہلی نے انہیں قید کر لیا ہے

مثلاً بیچاری جمنا دہلی شہر کے اندر یوں بہہ رہی ہے جیسے پولیس کے گھیرے میں کوئی سہما ہوا مجرم۔ دہلی کے کئی پہاڑ جو کبھی اپنے سر اٹھائے کھڑے رہتے تھے، اب دہلی کے باشندے ان پر سے موٹریں لاریاں اور سائیکلیں گذار کر یوں لے جاتے ہیں۔ جیسے یہ

پہاڑ نہ ہوں بلکہ ان کے زرخرید غلام ہوں۔ سارے پہاڑ دہلی کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور دہلی والوں نے ان کا نام پہاڑ گنج، پہاڑی دھیرج، بھوجلہ پہاڑی، آنند پربت رکھ چھوڑا ہے اور یہ پہاڑ "قدرتی پہاڑوں کی بجائے" پہاڑی چھوکرے معلوم ہوتے ہیں جو پربت ماں سے چھٹنے کے لئے دہلی میں آ گئے ہیں۔

دراصل جب سے دہلی آزاد ہندوستان کا دارالخلافہ بنی ہے۔ آزاد اور بے باک ہو گئی ہے اور کسی الھڑ دوشیزہ کی طرح چاروں کھونٹ اٹکھیلیاں کرتی پھر رہی ہے۔ اس لئے اس کی حدود بدل جاتی ہیں۔ اگر ایک ہفتہ پہلے اس کی مغربی حد پٹیل نگر نامی کالونی میں تھی۔ تو ہفتہ کے ختم ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے پتہ چلتا ہے کہ اب پٹیل نگر سے آگے ایک اور کالونی نمودار ہو گئی ہے جو اب دہلی کی مغربی حد کہلاتی ہے۔ مشرقی حد میں پہلے جمنا ندی تھی۔ اس کے بعد شاہدرہ بن گئی۔ اور اب شاہدرہ والے سرد آہ بھر کر کہتے ہیں کہ اب ہم مشرقی حد نہیں رہے کیونکہ ستاروں سے آگے ایک اور کالونی کا جہاں بس گیا ہے۔

غرض دہلی کی حدیں ٹوٹتی بنتی اور بنتی ٹوٹتی رہتی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دہلی میں شیطان آ گھسا ہے جو اپنی آنتوں کو چاروں طرف پھیلاتا چلا جا رہا ہے اور کچھ عجیب نہیں کہ ایک دن ہم یہ خبر سنیں کہ دہلی کی ایک حد کلکتہ ہے اور دوسری حد سری نگر ممکن ہے، نقشہ سے ہندوستان نام کا ملک غائب ہو جائے۔ اور دہلی نام کا ملک نمودار ہو جائے۔ کیونکہ ہندوستان سمٹ رہا ہے اور دہلی بڑھ رہی ہے۔ دہلی ایک جسم ہے جس میں ہندوستان کی روح داخل ہوتی جا رہی ہے۔ جسم اور روح کا یہ وصال ٹریجیڈی ہے یا کامیڈی۔ اس کا فیصلہ ہم آنے والے مورخ پر چھوڑتے ہیں۔

ایک نہیں پانچ دہلیاں

بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ دہلی صرف ایک ہے۔ حالانکہ یہ غلط فہمی

دور کر لینی چاہیے۔ کیونکہ دہلیاں پانچ ہیں، پرانی دہلی، نئی دہلی، شرنارتھی دہلی
چھپادوئی دہلی۔ دیہاتی دہلی اور ان میں سے ہر دہلی دوسری دہلی سے الگ مزاج رکھتی
ہے۔ ہر دہلی دوسری دہلی کی سوکن معلوم ہوتی ہے۔ پرانی دہلی اپنے آپ کو خاندان کی
اس بڑی بی کی طرح سمجھتی ہے جس کی کمر میں چابیوں کا گچھا لٹکتا رہتا ہے اور جو اپنے
سامنے خاندان کے سارے افراد کو ہیچ سمجھتی ہے اور منہ میں پان کی گلوری دبائے "پدرم
سلطان بود" کے نعرے لگاتی رہتی ہے۔ اور نئی دہلی خاندان کی وہ ماڈرن
لڑکی ہے جو چابیوں کے گچھے کی بجائے کلائی میں پرس جھلاتی ہوئی اپنے آپ کو یورپ
ریٹرن کہتی ہے منہ میں "چیونگ گم" اپنے آپ کو انڈیا کی "ہزہائینس" سمجھتی ہے اور
پرانی دہلی سے اڑکر آئی ہوئی کسی مکھی کو ناک پر نہیں بیٹھنے دیتی۔ اور "شرنارتھی دہلی
"اپنے آپ کو وہ حسینہ سمجھتی ہے جو اپنی عشوہ طرازیوں کے ساتھ یہاں آئی اور دلِ عشاق
پر حملہ کر کے فاتح بن گئی۔ کبھی منہ میں پان دبا لیتی ہے، کبھی چیونگ گم اور کبھی گنڈیریاں، اپنے
آپ کو دہلی کی ناک سمجھتی ہے، مگر سرکار اس پر ہمیشہ مکھیاں بٹھاتی رہتی ہے۔ چھپادوئی
دہلی کی پوزیشن اس جلا وطن کی سی ہے جو اب بھی اپنے آپ کو تخت و تاج کا وارث
سمجھتی ہے۔ اور اپنی رعایا سے دور ہی رہنے میں اپنی بڑائی سمجھتی ہے اور دیہاتی
دہلی اس بے بس دوشیزہ کی طرح ہے۔ جس کا بیاہ زبردستی ایک ایسے شخص سے کر دیا گیا
ہو۔ جس کے نام کا وہ صحیح تلفظ بھی نہیں جانتی۔ لیکن گھونگٹ اوڑھے "پتی ورتا دھرم"
نبھائے جا رہی ہو۔

ان پانچوں دہلیوں میں صرف ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہم حاکم ہیں
ہمارے ہی حکام کے سامنے سارا ہندوستان سر جھکاتا ہے۔ ہم اس دلی کے مالک ہیں
جو ہمالیہ سے راس کماری تک راج کرتی ہے۔ دلی کا ہر باشندہ اپنے آپ کو راجکمار
محسوس کرتا ہے۔ اپنی رگوں میں شاہی خون دوڑتا ہوا محسوس کرتا ہے چاہے اسے

آسٹریلیا کا گندم ہی کھانے کو ملے۔

دہلی کی بسیں۔

دہلی شہر کے اندر ڈی۔ ٹی۔ سی بسیں چلتی ہیں جو انسانوں کو ڈھونے کا کام کرتی ہیں ایک علاقے کے لوگوں کو اٹھا کر دوسرے علاقے میں پھینک آتی ہیں اور دوسرے علاقے کے لوگوں کو تیسرے علاقے میں۔ دہلی کا ایک انسان اگر دوسرے انسان سے جڑا ہوا ہے تو ان بسوں کی بدولت۔ اگر ایک دن کے لئے یہ بس سروس ختم ہو جائے تو محبوبہ اپنے عاشق سے نہیں مل سکتی۔ طالب علم اپنے ٹیچر سے نہیں مل سکتا۔ قرض خواہ اپنے مقروض تک نہیں پہنچ سکتا مالک اپنے ملازم کے ہجر میں تڑپتا رہے۔ اور کلرک اپنے افسر کی جھڑکیاں کھانے سے محروم رہ جائے۔ حتی کہ آتما پرماتما سے نہیں مل سکتی جب تک بس ڈھو کر اسے پرماتما تک نہ پہنچا دے۔

غرض یہ بسیں دہلی کے بچھڑے ہوؤں کا "وصال" کراتی ہیں۔ دہلی بہت سے "ہجر زدہ" ٹکڑوں کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ ٹکڑے ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اگر یہ ٹکڑے ہمیشہ الگ تھلگ رہیں تو دہلی نام کا شہر ہندوستان کے نقشے پر نظر نہ آئے۔ دہلی کو ایک وحدت ایک اکائی۔ ایک شہر کی حیثیت اسی وقت ملتی ہے جب ڈی۔ ٹی۔ سی بسیں ان ہجر زدہ ٹکڑوں کا ایک دوسرے سے وصال کراتی ہیں۔ اس اعتبار سے دہلی کی بسیں ایک ایسے "ایجنٹ" کی طرح ہیں جو طالب و مطلوب کو ایک دوسرے سے ملا دیتا ہے۔ اور اپنی دلالی کھری کرتا ہے۔

لیکن یہ بسیں صرف ایجنٹ ہی نہیں ہیں۔ صرف اپنی "دلالی" ہی کھری نہیں کرتیں صرف عاشق کو محبوبہ ہی سے نہیں ملاتیں بلکہ خود بھی محبوبوں کی طرح ناز نخرے دکھاتی ہیں۔ محبوبہ کے دیدار کے پہلے آپ کو بس کے دیدار کے لئے تڑپنا پڑتا ہے۔ بس ایک

طرح کی لیلیٰ ہے۔ جس کے مجنوں بس کے انتظار میں سوکھ کر کانٹا ہو جاتے ہیں۔ ایک
مجنوں نے تو مجھے یہاں تک بتایا کہ وہ دہلی کے ایک بس سٹاپ پہ پیدا ہوا تھا
یہیں پر ماں کا دودھ پی پی کر بڑا ہوا۔ یہیں پر مونگ پھلیاں کھا کھا کر جوان ہوا
بس کے انتظار میں ہی مطالعہ کرتے کرتے گریجویٹ ہو گیا۔ یہیں کھڑے کھڑے اس
نے شادی کی۔ یہاں تک کہ اب بوڑھا ہو گیا ہے۔ لیکن ابھی تک بس نہیں ملی جس پر
سوار ہو کر وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ جائے اور اسے یہ خوشخبری سنائے کہ میں بوڑھا
ہو چکا ہوں۔ لیکن دہلی کا ہر مجنوں اتنا صابر و شاکر نہیں ہوتا۔ کہ اپنی ساری عمر
بس کے انتظار میں گزار دے۔ چنانچہ وہ لپک کر جھپٹ کر، پھڑک کر، دوڑ کر بھاگ
کر بس کا تعاقب کرتا ہے اور اس نامعقول محبوبہ کو کسی نہ کسی طرح پکڑ لیتا ہے۔ اور
جب بس سے اتر کر گھر پہنچتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عینک کا ایک شیشہ
ٹوٹ گیا ہے، پتلون گھٹنے پر سے پھٹ گئی ہے جیب کسی بلیڈ سے کٹ چکی ہے۔ اور
ماتھے سے خون بہہ رہا ہے۔ اور گھر جانے کی بجائے اسے ہسپتال جانا چاہئے۔

لیکن آہ! ہسپتال جانے کے لئے بھی بس کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

اس ذلت و خواری کے باوجود جب صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے تو دہلی کے
ہر بس سٹاپ پر میلوں لمبی قطاریں لگ جاتی ہیں۔ دہلی کی آدھی آبادی ان قطاروں میں
سمٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور پھر رات گئے تک بسوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح بھر کر
ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دی جاتی ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق دہلی کے باشندے
اپنی آدھی عمر بسوں کی نذر کرتے ہیں اور باقی آدھی عمر بسوں کے متعلق سوچنے میں صرف
کرتے ہیں۔ ایک صاحب کا بیان ہے کہ اس نے گذشتہ چھ ماہ سے اپنے بچوں
سے بات نہیں کی۔ کیونکہ صبح وہ بس نہ ملنے کے خوف سے جلدی گھر سے روانہ ہو جاتا
ہے۔ اس وقت بچے سوتے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور جب رات کو دیر سے بس ملنے کے سبب

گھر پہنچتا ہے تو بچے بھی سو چکے ہوتے ہیں۔

دہلی کی بسیں عہدِ حاضر کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہیں جو انسان کی عمرِ لذیذ کو سمجھ کر کھائے جا رہی ہیں۔

دہلی کے بائیسکل اور سکوٹر

دہلی بابوؤں اور بائیسکلوں کا شہر ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بابوؤں نے بائیسکلوں کو جنم دیا۔ کئی کہتے ہیں بائیسکلوں نے بابو پیدا کئے۔ مگر میری رائے ہے کہ یہ دونوں جڑواں پیدا ہوئے۔ اگر بابوؤں اور سائیکلوں کو دہلی سے نکال دیا جائے تو دہلی بیوہ ہو کر رہ جائے اور گورنمنٹ آف انڈیا ماتھے پر دوہتڑ مار کر کہے۔ اب کیا فائدہ جینے کا۔ یہ حقیقت ہے کہ بائیسکل اور بابو کی برکت ہی سے انڈیا کی عظیم ری پبلک چل رہی ہے۔ ہر روز صبح بائیسکلوں اور سکوٹروں کے غول کے غول گلی کوچوں سے نکل نکل کر سڑکوں پر پھیل جاتے ہیں۔ جو بابوؤں کو اپنے کندھوں پر سوار کئے بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ اگر دہلی کی سڑکوں پر بائیسکل چل رہے ہوں تو سمجھ لیا جائے کہ ہندوستان کی حکومت چل رہی ہے ورنہ نہیں۔ سرزمینِ ہندوستان پر حکومت کی باگ ڈور بائیسکلوں کے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ اگر بائیسکل نہ ہو تو بابو دفتر نہیں جا سکتا اور جب دفتر نہیں جاتا تو ہندوستان کا وزیر اعظم تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے اور بار بار کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا رہتا ہے کہ کوئی بائیسکل آئے تو وہ حکومت کا کاروبار چلائے۔ شاید دنیا کی کوئی سلطنت بائیسکل کی اتنی محتاج نہیں رہی جتنی موجودہ زمانہ کی گورنمنٹ آف انڈیا۔

میرا خیال ہے اس مرتبہ اگر دہلی اجڑی تو صرف اس بنا پر اجڑے گی کہ بائیسکل فیکٹریاں بائیسکلیں بنانا بند کر دیں اور بابو لوگ یہ شعر پڑھتے ہوئے دہلی سے نکل جائیں کہ

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم رسائیکل اسد
ہم نے یہ مانا کہ دہلی میں رہیں کس پر چڑھیں

بابو اور بائیسکل دونوں جڑواں پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے دونوں کے فضائل اور مسائل بھی ایک دوسرے سے بے حد مشابہ ہیں۔ بائیسکل ارزاں ترین سواری ہے۔ اور بابو ایک ارزاں ترین ملازم ہے۔ بائیسکل پر آپ جتنا بوجھ لاد دیجئے اُف نہیں کرتی۔ بابو پر جتنی فائلیں لاد دیجئے اٹھا لیتا ہے۔ آپ بائیسکل کی مرمت نہ کریں تو بھی کام چلتا رہتا ہے۔ بابو کے انجر پنجر بھی چاہے جتنے ڈھیلے ہو چکے ہوں کام کرتا رہتا ہے۔ بائیسکل کچھ نہیں کھاتی، تھوڑی سی ہوا بھر دو چل پڑے گی بابو بھی کچھ نہیں کھاتا۔ صرف اس کے دماغ میں یہ ہوا بھر دو کہ وہ بابو ہے اپنے دفتر کا بادشاہ۔ بابو چلتا رہے گا۔ بائیسکل کو تھوڑی سی گریس چاہیے۔ بابو کو دو روٹیاں اور چٹنی چاہیے زیادہ عیاشی کرے گا تو دفتر کی کینٹین میں چائے کا ایک کپ پی لے گا اور پھر تر و تازہ ہو کر اپنی بائیسکل کو اٹھا کر لتا منگیشکر کے فلمی بول گنگناتا ہوا چل پڑے گا۔ وہ اپنی بائیسکل کو بیوک کار کہتا ہے بالکل اسی طرح جیسے اپنے آپ کو سلطنت کا اصل بادشاہ سمجھتا ہے۔ بائیسکل پر بیٹھا ہو تو بیش قیمت کاروں کو حقارت سے دیکھ کر آگے نکل جاتا ہے۔ دفتر کی کرسی پر بیٹھا ہو تو بڑے سے بڑے سیٹھ کو کھڑکا کر کہتا ہے۔ سیٹھ صاحب! اس وقت میرے پاس ٹائم نہیں ہے، کل آنا۔"

دہلی کا بابو اپنی اپنی بائیسکل کی فطرت خوب سمجھتا ہے اور اسے ہر سانچے میں ڈھال لیتا ہے بابو کی طرح بائیسکل بھی بڑی لچکیلی فطرت رکھتی ہے۔ بابو کبھی اسے ایرو پلین کی طرح چلاتا ہے، اس کے پیچھے فائلیں باندھ لیتا ہے۔ کبھی آٹے کی بوری رکھ لیتا ہے کبھی گھر کے سودا سلف کی گٹھڑی باندھ لیتا ہے، اور کبھی جیب چھپی کے

دن تفریح کے لیے نکلتا ہے تو اسی اپنی واحد وفادار بائیسکل پر اپنے تین چار بچوں اور بیوی کو لاد کر سارا دہلی شہر گھماتا ہے۔ اور پھر بڑے فخر سے اپنی بیوی سے کہتا ہے "منے کی ماں! چاہے تم میرا ساتھ چھوڑ جاؤ لیکن یہ بائیسکل میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گی۔ یہ تم سے کہیں زیادہ وفادار جیون ساتھی ہے اور سدا سہاگن ہے۔" بائیسکل اور بابو کی جوڑی مستقل اور پائیدار ہے۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کا سہاگ اسی جوڑی پر قائم ہے۔

دہلی کے تانگے

دہلی میں تانگے کبھی چلتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ چلتے تھے کیونکہ آج کل تو وہ حسرت سے کھڑے دیکھتے رہتے ہیں کہ کبھی جن سڑکوں پر وہ مغل شہزادوں کی طرح گردن اٹھائے چلا کرتے تھے ان پر کاریں، اسکوٹر اور بسیں چل رہی ہیں۔ سڑکوں کی مغل سلطنت ان سے چھن چکی ہے۔ اور اگر کبھی کبھار کوئی تانگہ سڑک پر چلتا ہوا دکھائی دے بھی جائے تو یوں شرما شرما کر جھجک جھجک کر سہم سہم کر کنی کترا کر چلتا ہے کہ کہیں کوئی دیکھ کر پہچان نہ لے کہ سلطنت کا معزول شہزادہ جا رہا ہے۔ "زمین" سے تانگے کے تعلقات ٹوٹ چکے ہیں۔ لیکن ان تعلقات کا احساس کبھی نہیں ٹوٹتا۔ اور احساس کا نہ ٹوٹنا ہی سب سے زیادہ دردناک ہے۔ احساس کے بغیر تانگے کو مکمل "نروان" حاصل نہیں ہو سکتا۔

لوہے کی مشین نے تانگے کو پچھاڑ دیا ہے۔ پٹرول اور انجن اسے بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں جس سے تانگے میں احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے۔ اس نے دہلی کی بڑی بڑی سڑکوں پر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی سڑکوں گلیوں، کوچوں کے اندر سمٹتا جا رہا ہے۔ دہلی کی زندگی اتنی تیز ہو گئی ہے۔ اور راستے

دور دور کے علاقوں تک پھیل گئی ہے کہ بے چارہ تانگہ اس تیز رفتار زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس لئے وہ صرف اُن تنگ و تاریک اور پسماندہ علاقوں میں محدود ہوتا جا رہا ہے۔ جن میں داخل ہو کر چرنا مشین اپنی توہین سمجھتی ہے۔ مگر لوہے کی مشین کا کوئی اعتبار نہیں۔ کب اپنی عارضی توہین کا لبادہ پھاڑ کر پھینک دے اور تانگہ کو اپنی سلطنت کی آخری پناہ گاہوں سے باہر نکال دے اور محکمہ آثار قدیمہ، دہلی کے آخری تانگے کو اٹھا کر لال قلعے کے اندر ایک کونے میں محفوظ کر کے رکھ دے۔ تاکہ غیر ملکی سیاح آکر اس "ہندوستانی عجوبہ" کو دیکھیں۔ اور اس کا فوٹو لے کر امریکہ کے لائف میگزین میں تفریح کے لئے شائع کیا کریں۔

دہلی کا تانگہ کبھی رئیسوں کی سواری سمجھا جاتا تھا۔ رئیسوں نے کاریں خرید لیں تو تانگے نے عوام کی سرپرستی قبول کر لی لیکن اب عوام بھی اسے دغا دیتے جا رہے ہیں اور وہ بھی تانگوں کی بجائے بائیسکلوں کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ کیونکہ وہ بائیسکلوں سے بھی وہی کام لینے لگے ہیں۔ جو تانگوں سے لیا کرتے تھے یعنی بائیسکلوں کو باربرداری کے لئے بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ تانگے کی طرح بائیسکلوں پر بھی گھر کی چار چار سواریاں بٹھا لیتے ہیں اور تانگوں سے شرط باندھ لیتے ہیں کہ آؤ ریس لگا کر دیکھ لو، ہم تم سے پہلے منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔

غرض دہلی کے تانگے اپنے آخری دن جوں توں کر کے کاٹ رہے ہیں اور عام خیال یہ ہے کہ وہ شاید اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں ایک بار پھر رئیسوں کی سواری بن جائیں گے۔ اور کبھی کبھی کوئی رئیس زادہ منہ کا مزا بدلنے کے لئے ململ کا کرتہ یا اچکن پہن کر دو پلی سر پر لگائے پان کی گلوری منہ میں دبائے۔ شام کو تانگے پر بیٹھ کے نکلا۔ اور لوگ باگ اچک اچک کر اسے یوں حیرت سے دیکھیں، جیسے

بچے شہر میں گھومتے ہوئے سرکس کے ہاتھی کو دیکھتے ہیں۔

دہلی کی کاریں

دہلی کی سڑکوں پر کاریں گھومتی ہیں اور پارلیمنٹ کے ممبران بھی لیکن راہ چلتے لوگوں کو دونوں کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا کہ سڑک پر کوئی کار جا رہی ہے۔ یا ممبر پارلیمنٹ، کیونکہ جب کوئی چیز عام ہو جائے تو اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے دہلی میں کاریں اور ممبرانِ پارلیمنٹ دو بہت عام چیزیں ہیں۔ اس لئے جب وہ سڑکوں پر چلتے ہیں تو صرف انھیں ہی یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کار ہے یا پارلیمنٹ کا ممبر ہے۔

جب کوئی کار والا سڑک پر چلتا ہے۔ تو نہ جانے کیوں اسے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ یہ سڑکیں اور پٹرول پمپ صرف اُسی کے لئے بنائے گئے ہیں اور باقی یہ جو لاریاں بسیں، بائیسکلیں سکوٹر وغیرہ چل رہے ہیں۔ کالے رنگ کے "ریڈ انڈین" ہیں۔ اور بدقسمتی سے ڈیموکریسی نہ ہوتی" تو انھیں ان سڑکوں پر چلنے کی ممانعت کر دی جاتی" جن پر کاریں چلتی ہیں۔ چنانچہ کار والا ان کی طرف ناک سکوڑ کر دیکھتا ہے اور بڑبڑا کر کہتا ہے" ابے اندھا ہے۔ دکھتا نہیں، کار آ رہی ہے۔ راستہ چھوڑ دے یوں سڑک پر چل رہا ہے، جیسے تیرے باپ دادا کی ملکیت ہے، ہٹ جا ورنہ چالان کروا دوں گا۔ جانتا بھی ہے ٹریفک پولیس کا سپرنٹنڈنٹ میرے داماد کا۔ بھائی ہے۔" ابھی چند سال پہلے دہلی میں صرف امیروں کے پاس کوٹھی ہوتی تھی۔ لیکن ہمارے دیکھتے دیکھتے کوٹھی کی شرط اڑ گئی۔ اور اب تو اس آدمی کے پاس بھی کار ہے، جس کے پاس صرف دو کمروں والا کوارٹر ہے۔ میں نے ایک ایسے آدمی کے پاس بھی کار دیکھی ہے۔ جو غالب کے شعر غلط پڑھتا ہے۔ اور ایک ایسا آدمی تو تین

کاروں کا مالک ہے جو چند سال پہلے ایک تنور پر روٹیاں لگانے کا کام کرتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک پہلوان کے پاس بھی کار ہے اور وہ صبح اکھاڑے میں جاتا ہے تو کار پر سوار ہو کر جاتا ہے دہلی میں بھانت بھانت کی کاریں گھومتی ہیں۔ ان کے رنگ، سائز، وزن، شکل و صورت میں "فینسی ڈریس شو" کا سا منظر دکھائی دیتا ہے۔ یہاں ایسی کاریں بھی چلتی ہیں جن پر لوگ گھاس لادتے ہیں اور ایسی کاریں بھی جو دور سے جیٹ ہوائی جہاز معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ سب کاریں ہی کہلاتی ہیں۔ چاہے کسی کے پاس کار کے لئے گیراج تک نہ ہو مگر وہ اسے گھر کے باہر سڑک یا گلی میں یوں کھڑا کر لیتا ہے جیسے کار نہ ہو کوئی گائے بھینس ہو۔

دہلی کی حسینائیں:

دہلی کی حسینائیں یوں گھومتی ہیں، جیسے جنگل میں شیر گھومتے ہیں۔ دہلی پر ان کا راج ہے۔ جہانگیر نے شراب کے ایک پیالے پر اپنی سلطنت نور جہاں کو دے دی تھی، دہلی کے موڈرن جہانگیر صرف کافی کے ایک پیالے پر سلطنت نچھاور کر دیتے ہیں۔

دہلی کی بیشتر حسینائیں دہلی کے کھیتوں سے نہیں اگتیں بلکہ باہر سے درآمد کی جاتی ہیں۔ دہلی کی اوریجنل حسینائیں اقلیت میں ہیں۔ اور یہ چھوٹی سی اقلیت بھی اب لہو لگا کر رائل فیملی میں شامل ہو رہی ہے۔ درآمد شدہ حسیناؤں کے پہلے پہلے طلائی رخسار غصہ سے لال پڑ گئے تھے۔ لیکن حملہ آور زیادہ موڈرن ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ اس لئے قدیم حسیناؤں نے معمولی سی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دئے اور پھر آہستہ آہستہ خود بھی موڈرن حسیناؤں کے سانچے میں ڈھل گئیں اور جنگل پر راج کرنے میں حملہ آور حسیناؤں کے ساتھ ساجھی دار ہو گئیں۔

ایک مورخ نے اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: "ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ سامراجی حملہ آوروں کے کلچر کو یہاں کے اصلی باشندے اپنا لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن ایسا آتا ہے۔ جب اصل باشندے بھی حملہ آور اور سامراجی حاکم معلوم ہونے لگتے ہیں۔"

آزادی کے بعد دہلی ایک کاسموپالیٹن شہر بن گیا ہے۔ اس لئے یہاں کی حسینائیں بھی کاسموپالیٹن قسم کی حسینائیں بن گئیں ہیں۔ بنگال کی جادو کرنے والی کالی لمبی زلفیں۔ سندھ کے پر بہار رنگ زاروں میں کھلی ہوئی ولایتی سگرٹوں کے پھول لگا کر، جب۔ مدراسی برہمن زادوں کی سانولی سڈول اور رقص کرتی ہوئی پنڈلیوں پر، پنجاب کے سنہرے مکئی کی طرح شوخ و شنگ چمکیلے رخساروں پر شلوار قمیصیں کا سایہ ڈالتی ہیں تو یورپ کی نیلگوں آنکھوں اور بھورے کٹے ہوئے بالوں پر بھی یہ جنون سوار ہو جاتا ہے کہ بنارسی ساڑی پہن کر بازار میں نکلیں اور آتش شوق میں کاسموپالیٹن حرارت پیدا کر لیں اور جدھر بازار سے گزریں کشتوں کے پشتے لگا دیں اور حسن کو عالمگیر بنا دیں اور عاشقوں کو "کنفیوز" کر دیں کہ نگاہ ٹھہرے تو کہاں ٹھہرے کس پر ٹھہرے کہ کانگڑی کی چنچل حسینہ اور کشمیر کی گلنار بہوٹی دونوں بیک وقت دل کو کھینچ لیتی ہیں۔ اور یہ بھی نہیں سوچنے دیتیں کہ دل کس کے حوالے کریں۔ پانچ منٹ پہلے ایک جاپانی گڑیا جو دل لے گئی تھی اب اسے کس منہ سے کہیں حضور! ایک افغان زادی ہم سے دل لینے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ براہ کرم ہمارا دل لوٹا دو کہ ؎

یہاں عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

دہلی میں حسیناؤں کی تعداد کتنی ہے؟ اس کے متعلق کوئی اعداد و شمار نہیں ملتے۔

محکمۂ مردم شماری اس سلسلہ میں خاموش ہے۔ کیونکہ رولز کے مطابق، حسن شماری اُن کے فرائض میں شامل نہیں۔ لیکن عام اندازہ یہ ہے کہ حسیناؤں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ایک مستقل قسم کے "سڑک گرد" عاشق کا حلفی بیان ہے کہ وہ ایک سڑک پر گذشتہ دس برس سے حسن شماری کر رہا ہے، لیکن ہر روز اس سڑک پر پچیس فی صدی نئی حسینائیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ نہ جانے وہی حسینائیں بھیس بدل کر سامنے آجاتی ہیں یا کسی چھپے ہوئے ریزرو سٹاک میں سے نیا مال نکال کر مارکیٹ میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس لئے تعداد کے اضافہ کی صحیح رفتار کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ ایک دن ایسا آجائے گا جب دہلی شہر کی ہر "صنف نازک" حسینہ بن چکی ہوگی اور ہر حسینہ لاکھوں دل اپنے پرس میں چھپائے پرس جھلاتی نظر آئے گی اور اس وقت شاید ان کی شمار کرنا نسبتاً آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ حسن کی نگری میں یہ عام رجحان پھیل رہا ہے کہ لباس کی موڈرن، تیکھی اور پھڑکیلی تراش خراش ہی کو حسن کی بنیاد بنا دیا جائے اور لباس ہی کو ایک ایسا فل سورج بنا دیا جائے جس سے چکا چوند میں ہر نقش کے سبھی چھوٹے موٹے ستارے او جھل ہو جائیں۔ ـــــ عشق کے لئے یہ ایک بہت جانکاہ اور آزمائشی دور ہے کہ لیے در حسار کی قدیم ترازو میں لباس نے ڈنڈی مارنا شروع کر دی ہے۔ اور بے چارے عاشق حیران ہیں کہ اس ڈنڈی سے دل کی قدر قیمت کو بچائیں یا حسین سوداگروں کی اس لئے بازی میں نقد دل وجان لٹا کر ہار مان لیں۔

دہلی کی حسیناؤں کی لیڈر شپ یونیورسٹی کی لڑکیوں کے ہاتھ میں ہے کیونکہ وہ دل لینے کے نت نئے ڈھنگ ایجاد کرتی رہتی ہیں۔ اگر کسی شام کو یونیورسٹی کی ایک حسینہ جوگئے رنگ کا لمبا کرتا زیب تن کر کے میدانِ کارزار میں اترآتی ہے تو دوسری شام کو دہلی کی تمام حسینائیں جوگئیں بنی ہوئی نظر آتی ہیں اور ابھی تیسری

شام پوری طرح ختم نہیں ہوتی کہ یونیورسٹی کی کوئی حسینہ جو گیا لباس اتار کر تنگ پتلون پہن لیتی ہے۔ جیسے وہ حسینہ نہ ہو بلکہ ریس کورس کی چاق و چوبند گھڑ سوار ہو۔ چنانچہ چوتھی شام دہلی کے سلم ایریا میں رہنے والی رام جی داس کلرک کی میٹرک پاس بیٹی ٹائپسٹ کا کام کرتی ہے۔ نزدیکی ٹیلر ماسٹر کو تنگ پتلون تیار کرنے کا آرڈر دے آتی ہے۔ کہ فیشن بدل گیا ہے اور حسیناؤں نے کوئی "ٹرائی کلر" لباس پہننا شروع کر دیا ہے۔

دہلی کی حسیناؤں کی کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ ان کی زلفوں کی طرح اس کہانی کے بھی کئی پیچ، کئی خم، اور کئی سٹائل ہیں۔ لیکن میں صرف ایک بات کہہ کر اسے ختم کرتا ہوں، دہلی کی حسینائیں وہ لیلائیں ہیں جو مجنوؤں پر جان نثار کرنے کی قائل نہیں ہیں۔ صرف کبھی کبھار ایک آدھ خودکشی کی خبر آجاتی ہے۔ حسیناؤں کی تعداد کے اعتبار سے خودکشیوں کی یہ تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

دہلی کے عاشق

دہلی کے عاشقوں کی سب سے بڑی ٹریجیڈی یہ ہے کہ ان کی اپنی کوئی آواز نہیں ہے۔ وہ صرف دہلی کی حسیناؤں کی گنبد کی صدائے بازگشت ہیں۔ اگر آپ چاہیں کہ دہلی کے کسی عاشق کو الگ کر کے دیکھیں تو آپ کو مایوسی ہو گی کیونکہ وہ کسی نہ کسی حسینہ کے دوپٹے میں تنکے کی طرح اٹکا ہوا نظر آئے گا اور وہ تنکا دوپٹے کے بغیر آپ کو لاوارث نظر آئے گا۔ دوپٹہ ہی اس کی ہستی کی ضمانت ہے۔ اور اگر آپ اسے دوپٹے سے الگ کر کے دیکھنا چاہیں گے تو وہ یوں لگے گا جیسے سگریٹ کی راکھ زمین پر گر گئی ہے

دہلی میں عاشقوں کی تعداد حسیناؤں سے کئی گنا زیادہ ہے۔ تعداد کے

اس بے ہنگم اضافہ نے عشق کا معیار گرا دیا ہے اور عاشق لوگ اس گرے ہوئے معیار کو نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ عشق اندھا ہوتا ہے۔ مجھے ایک عاشق کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ حسن کا تعاقب کرنے کے لئے ہر روز بائیسکل پر پندرہ پندرہ میل کا سفر کرتا رہا اور آخر ایک دن جب اس کی محبوبہ نے دفورِ محبت میں اس سے پوچھا "پیارے میرا جی چاہتا ہے کہ تجھ پر کچھ نچھاور کروں۔ بول کیا مانگتا ہے؟"

جواب میں عاشق کے منہ سے بے ساختہ نکلا "پیاری! مجھے ایک سکوٹر لے دو۔ مجھ سے اب زیادہ دیر بائیسکل نہیں چلائی جاتی۔"

دہلی کا عاشق حساب کتاب کا عاشق ہے۔ وہ عشق کو بائیسکل اور سکوٹر سے تولتا ہے۔ وہ بے حد چوکنا ہو کر دیکھتا ہے کہ حسینہ کے حسن کی کیا قیمت ہے۔ وہ کافی کے کتنے کپ پلا چکا ہے۔ اور اس کے بدلے میں اسے کتنی مسکراہٹیں مل چکی ہیں۔ اگر محبوبہ کی طرف سے ملی ہوئی مسکراہٹوں کی تعداد کم ہے تو عاشق کا نازک شیشہ دل چور چور ہو جاتا ہے۔ اور وہ محبوبہ پر بے وفائی کا الزام لگا دیتا ہے۔ اگر زیادہ ذکی الحس ہو جاتا ہے تو مسکراہٹیں کم ہونے کے غم میں ٹھنڈی آہیں بھرتا ہے۔ راتوں کو تارے گنتا ہے۔ اور فلمی گیت گنگناتا ہے اور کافی کے بلوں کے غیر متوازن بجٹ کو اس طرح پورا کرتا ہے کہ بڑھیا بلیڈوں کی بجائے گھٹیا بلیڈ استعمال کرنے لگتا ہے۔ بلکہ کئی بار تو ہفتوں شیو نہیں کرتا۔ اور آزردہ حال ہو کر یہ شعر بڑے رقت انگیز میں لہجہ میں گاتا ہے۔

اک بے وفا سے پیار کیا، ہائے کیا کیا
خود کو ذلیل و خوار کیا ہائے کیا کیا

دلّی کے عاشقوں کی ایک اور بلند قسم بھی ہے جو حسن کا مول تول نہیں کرتی، بلکہ اپنے عشق کا مول تول کرتی ہے۔ اس قسم کے عشق میں کافی کے پیالے

نہیں گئے جاتے اور نہ دیکھا جاتا ہے کہ حسن کے تعاقب میں کار کا کتنا پٹرول ضائع
ہوا۔ بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ عاشق کو سوشل اور اقتصادی طور پر کہیں
ہٹیا تو نہیں سمجھا جا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں مکانوں کے کرائے کی طرح حسیناؤں
کا ریٹ بھی بڑھا دیا جاتا ہے۔ بلڈنگ کا کرایہ جتنا زیادہ ہوگا۔ بلڈنگ کی سماجی
حیثیت اتنی ہی زیادہ بڑھے گی۔ اور بلڈنگ کی حیثیت بڑھنے کے ساتھ ساتھ
بلڈنگ کے مالک کا مرتبہ بھی بڑھے گا۔ اس قسم کے گھر پھونک تماشہ دیکھنے والے
مالک مکان قسم کے عاشقوں نے جہاں عشق کا مارکیٹ ریٹ بہت بڑھا دیا ہے
وہاں محبوباؤں کے دماغ بھی بگاڑ دیئے ہیں اور عشق کے مفہوم کو بنک بیلنس
کی سالانہ رپورٹ بنا دیا ہے — آپ کے پاس کار ہے یا تانگہ۔ یا آپ صرف
کسی پبلک پارک میں ایک آنے کی مونگ پھلی ہی سے محبوبہ کا دل رجھا رہے ہیں؟
کار، تانگہ اور مونگ پھلی میں جتنا فرق ہوتا ہے، اسی فرق کی بنیاد پر عشق کیا جاتا ہے
اور ان چیزوں کو پرکھنے کی کسوٹی صرف حسیناؤں کے پاس ہے۔ اسی لئے میں نے کہا
ہے کہ دہلی کے عاشق کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے حسیناؤں کے پاس ہے۔ دہلی کے
عاشق حسیناؤں کے دوپٹے کے تنکے ہیں۔ اس تنکے کو الگ کر کے دیکھیے تو نہ کار کی حیثیت
باقی رہتی ہے نہ بائیسکل کی۔ نہ پستے اور بادام کی نہ مونگ پھلی کی۔ غریب اور امیر
دونوں کے عاشق مول تول کا شکار ہیں۔ اور یہ مول تول محبوباؤں کے اختیار میں
ہے۔ عاشقوں کے اختیار میں تو صرف چند رومانٹک اشعار ہیں جنھیں پڑھ
پڑھ کر وہ اپنے شب و روز بگاڑ رہے ہیں۔ اس کے باوجود سمجھتے ہیں کہ وہ قیس
اور رانجھے کی روایات کے وارث ہیں۔

دہلی کے عاشقوں کی ایک اور قسم بھی ہے جن کے پاس کوئی محبوبہ نہیں
لیکن اس کے باوجود ان کے پاس اپنے عشق کی کئی مفروضہ کہانیاں موجود

ہیں۔ اور وہ محفلوں میں، کلبوں میں ریسٹورانوں میں اپنی ان محبوباؤں کے دلفریب قصے بیان کرتے رہتے ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئیں اور اگر پیدا ہو چکی ہیں تو عاشقوں کے نام پتے اور شکل سے آگاہ نہیں مجھ ایسے ہی ایک عاشق سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ وہ راہ چلتی ہر تیسری حسینہ کے بارے میں۔ کہتا ہے کہ وہ اس پر مرتی ہے۔ اور آج کل دو بچوں کی ماں بن چکی ہے — فلاں موتیوں جیسے دانتوں والی حسینہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی اور اس نے میرے ساتھ ساری عمر گزارنے کا عہد کیا تھا۔ لیکن اس کی ایک چھوٹی سی بے وقوفی پر میں نے اسے دھتکار دیا۔ اپنی بے وقوفی اور میری بے نیازی کے باعث ابھی تک شادی نہیں کر سکی — اور فلاں نیلگوں ساڑھی اور آنکھوں والی حسینہ مجھے اغوا کر کے تاج محل تک لے گئی تھی۔ لیکن جب میں نے کہا کہ میرے پاس شاہجہاں کی طرح اتنا روپیہ نہیں ہے کہ تمہارے لئے ایک تاج محل بنوا سکوں تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اور آج کل تاج محل کی بجائے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتی ہے اور کلرک کی نیچے پیدا کرنے والی ٹائپ مشین بنی ہوئی ہے۔

ان عاشقوں کی عمر کے متعلق جب کسی حسینہ کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب مناسب حدود سے آگے بڑھ گئی ہے اور ان کی خودکشی کا خطرہ ہے تو ان میں سے کوئی حسینہ رحم کھا کر ان کی طرف بڑھتی ہے اور کہتی ہے کہ "اب" سب قصے تمام ہوئے اب شادی کر لو۔"

جس پر وہ نہایت اکتاہٹ اور بے بسی کے عالم میں "ہاں" کہہ دیتے ہیں اور کسی بینڈ پارٹی کا ایڈریس پوچھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جو ان کے فرضی عشق کے ماتم اور حقیقی شادی کی خوشی کی دھن بجا سکیں۔

ایسی کئی ماتمی خوشیوں میں شرکت کرنے کا مجھے بھی فخر حاصل ہو چکا ہے۔

دہلی کے مکان

دہلی میں صرف دو قسم کے انسان رہتے ہیں ۔ مالک مکان اور کرایہ دار ایک اور قسم بھی ہے جو " لامکان " کہلاتی ہے اور خدا کی طرح ہر جگہ موجود ہے فٹ پاتھوں پر تھڑوں پر ، پارکوں میں ، پلوں کے نیچے ، پلوں کے اوپر ، برآمدوں میں کھنڈروں میں مگر یہ ضمنی قسم ہے ۔ خدا کی طرح مکان سے بے نیاز ہے ۔ حقیقی قسمیں دو ہی ہیں ۔ مالک مکان اور کرایہ دار ۔

مالک مکان ـــ مکان بناتے ہیں ۔ اپنے لئے نہیں بلکہ کرایہ داروں کے لئے دہلی میں جو مکان بنتا ہے اس میں کرایہ داروں کے مزاج اور تمناؤں کو اینٹوں کی طرح چن دیا جاتا ہے ۔ جن مکانوں میں ایسا نہیں ہوتا ۔ ان کے متعلق مالک مکان سمجھتا ہے بیکار پیسہ ڈبو دیا ۔ مکان کے نقشے ہی میں کرایہ داروں کے چہرے اور جیب فٹ کر دی جاتی ہے ۔ بلکہ اکثر اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ مکان کے لئے ابھی سیمنٹ کی منظوری بھی نہیں آتی کہ اس پر کرایہ داروں کا بورڈ لگ جاتا ہے ۔

دہلی میں ایسے مالک مکان بالکل گدھے سمجھے جاتے ہیں جو کرایہ دار نہیں رکھتے اور شکر ہے کہ دہلی میں گدھوں کی تعداد بہت کم ہے ۔ مجھے ایک ایسے ہی گدھے رئیس کے بارے میں معلوم ہے ۔ کہ اپنی کوٹھی میں کرایہ دار رکھنے کا سخت مخالف ہے ۔ لیکن اس کی بیوی اسے ایک سو روپیہ ماہانہ کرایہ دیتی ہے ایک چپراسی نے اپنا مکان اپنے بیٹے اور بہو کو کرایہ پر دے رکھا ہے ۔

چاٹ والے سے ممبران پارلیمنٹ تک :

دہلی کے مکان ۔ انسانوں کے لئے نہیں ، کرایہ کے لئے بنائے جاتے ہیں ۔ گ ۔ ش

دنوں ایک صاحب اپنے مکان کے سامنے ٹھڑا ابنا رہے تھے۔ میں نے عرض کیا یہ ٹھڑا کس لئے؟ فرمانے لگے ایک چارٹ والے کو کرایہ پر دینا ہے۔" دہلی میں سیڑھیاں تک کرایہ پر چڑھانے کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ دراصل دہلی کے ہر باشندے کی روح کرائے کی روح ہے۔ روح کو کبھی سیڑھی اور ٹھڑا سمجھ کر کرایہ پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کئی ممبرانِ پارلیمنٹ بھی ایسے ہیں جو اپنے ضمیر اور مکان دونوں کو کرایہ پر چڑھا دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ ممبر خود بھی کرایہ دار ہوتے ہیں اور پھر خود ہی پارلیمنٹ میں کرائے کی روحوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور اس طرح اپنے گناہ کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔

اس اعتبار سے دہلی میں کوئی مالک مکان خالص مالک مکان نہیں ہے کیونکہ اگر وہ کرایہ دار نہیں رکھتا تو اپنے آپ سے ہی اپنے مکان کا کرایہ وصول کر لیتا ہے۔

مکانوں کا شہر

دہلی صرف مکانوں کا شہر ہے۔ ——— آزادی کے بعد یہاں صرف مکان بنے۔ ان کے سوا ہر چیز بگڑ گئی ہے مکان خوبصورت ہوتے جا رہے ہیں انسان بدصورت ہو رہے ہیں۔ خدا نے انسان کو جتنا حسن عطا کیا تھا۔ وہ سب مکانوں پر لگا دیا گیا ہے۔ اس لئے انسان کے پاس کچھ باقی نہ رہا۔ صرف کرایہ کے پیسے باقی رہ گئے۔ یہاں تک کہ خدا کے مکانوں میں بھی کرایہ دار رکھ لئے گئے ہیں۔ جو پیٹ کی خاطر خدا کو کرایہ پر چڑھاتے ہیں اور خدا سے داد پاتے ہیں۔

دہلی کے مکانوں کی طرزِ تعمیر میں "کرایہ آرٹ" مدنظر رکھا جاتا ہے۔ کہنے کو دہلی کے سبھی آرکیٹیکٹ یہی کہتے ہیں کہ فلاں مکان میں مغل آرٹ ہے۔ فلاں میں یورپین آرٹ اور فلاں میں چینی آرٹ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مکانوں کے سبھی آرٹ "کرایہ آرٹ"

کے گرد کولھو کے بیل کی طرح گھومتے ہیں۔ اگر ایبرواروں کی جتنی اقسام ہیں۔ اتنی ہی اقسام
کے تعمیری آرٹ ہیں۔ آرٹ تو ایک ضمنی چیز ہے۔ مگر ابر بنیادی چیز ہے۔

یہاں کے مکان چار قسم کے ہیں۔

(۱) قدیم مکان (۲) نئے بنگلے اور کوٹھیاں (۳) عوامی مکان (۴) سلم ایریا کی جھونپڑیاں۔

دہلی کے قدیم مکان۔

مکانوں کی یہ قسم پرانی دہلی میں پائی جاتی ہے۔ انہی مکانوں کی گلیوں کے بارے میں ذوق نے کہا تھا۔ ع

کون جائے ذوق اب دلی کی گلیاں چھوڑ کر

یہ گلیاں اتنی تنگ و تاریک اور بھول بھلیاں قسم کی ہیں کہ ان سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ اس لئے انہیں چھوڑ کر جانا آسان نہیں۔ ذوق نے ٹھیک کہا تھا۔ ان سے باہر نکلنے کا واقعی کوئی راستہ نہیں۔

قدیم طرز کے یہ مکان اس زمانے کے انسانوں کی گہری اور قریبی محبت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں۔ اتنے جڑے ہوئے ہیں کہ ایک مکان کا باشندہ اپنی چھت پر کھڑا ہو کر دوسرے مکان کی چھت پر کھڑے ہوئے باشندے کا بوسہ لے سکتا ہے۔ مل کر ڈوئٹ گا سکتا ہے۔ ایک دوسرے کا سگریٹ منہ لگا سکتا ہے۔ غصہ آئے تو ہاتھ بڑھا کر تھپڑ مار سکتا ہے۔ ان مکانوں کی عورتیں اپنے گھروں سے نکلے بغیر ایک دوسرے کو گالیاں اور کوسنے دے سکتی ہیں۔ دال سبزی ایکسچینج کر سکتی ہیں۔ اپنی چھت پر کھڑے کھڑے تعزیت تک کر لیتی ہیں۔ غرض یہ قدیم طرز کے مکان دو انسانوں کے وصال اور قربت کا سمبل ہیں۔ اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں

اے دنیا بھر کے لوگو! قریب آجاؤ۔ کیونکہ قربت ہی تمہارے دکھوں کا علاج ہے نہ صرف علاج ہے بلکہ خود بھی ایک دکھ ہے۔ اس لئے دکھی ہونا چاہتے ہو تو ایک دوسرے کے مکانوں کو اتنا قریب لے آؤ کہ مردوں کو مورچے بنانے میں اور عورتوں کو سیاپہ کرنے میں سہولت ہو جائے۔

یہی جذبۂ وصال و قربت ہے کہ اگر ان میں سے ایک مکان بھی گرے تو وہ سیدھا دوسرے مکان پر گرتا ہے۔ اور دوسرا مکان تیسرے پر۔ اور اس طرح ایک مکان کے گرنے سے ایک ساتھ تین چار مکان گر جاتے ہیں۔ جیسے بچھڑے ہوئے اہلِ محبت ایک دوسرے پر بوسے ثبت کر رہے ہوں۔

اور چونکہ یہ قدیم مکان ہیں۔ اس لئے عام طور پر گرتے رہتے ہیں۔ اگرچہ ان کا گرنا بدشگونی سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ دہلی کے قدیم کلچر کی یادگار ہیں۔ انھیں محفوظ رکھنے کے لئے برابر اینٹیں اور پلستر لگائے جاتے ہیں۔ اس کلچر کو محفوظ کرنے کے سلسلہ میں قربانیاں بھی دی جاتی ہیں اور ہر سال مکان گرنے سے بہت سے لوگ ملبے کے نیچے آکر شہید ہو جاتے ہیں۔

جب یہ قدیم مکان ملبے بن جائیں گے۔ دہلی کا قدیم کلچر بھی ملبہ بن جائے گا اور انشاء اللہ وہ دن بہت جلد آرہا ہے۔

کوٹھیاں اور بنگلے

مکانوں کی دوسری قسم کوٹھیاں اور بنگلے ہیں۔ ان کی طرز تعمیر میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ ان میں مصری، ایرانی امریکی، فرانسیسی، روسی، جاپانی، افریقی روح نظر آئے۔ مگر ہندوستان ہرگز نظر نہ آئے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی روح مفلس ہے اور یہ کوٹھیاں اور بنگلے امیر لوگ بنواتے ہیں۔ اور وہ نہیں چاہتے کہ ان پر مفلس ہندوستان کا

سرمایہ پڑے ۔ اس لئے وہ اپنی کوٹھیاں مفلس عوام کی چشم بد سے دور شہر سے باہر بنواتے ہیں ۔ اگر ان کا بس چلے تو وہ اپنی کوٹھیاں شہر کے باہر ہی نہیں ہندوستان سے بھی باہر تعمیر کروائیں ۔

عوام سے دور شہر سے باہر کوٹھیاں بنوانے کا رجحان آہستہ آہستہ اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ شہر کے باہر کوٹھیوں اور بنگلوں کا ایک اور شہر بن گیا ہے اور بڑے بڑے لوگ بہت پریشان ہیں کہ اب کیا کریں ۔ وہ اس دوسرے شہر سے بھی باہر جنگلوں کی طرف بڑھ رہے ہیں ؛ تاکہ عوام سے دور اور فطرت کے نزدیک جا بسیں ۔ لیکن وہ جوں جوں جنگلوں کی طرف بڑھ رہے ہیں شہر ان کا پیچھا کر رہا ہے ۔ چنانچہ اب دہلی کے ارد گرد جنگل اور پہاڑ نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی ۔ جنگل اور پہاڑوں میں کوٹھیاں اور بنگلے نمودار ہو گئے ہیں ۔ فطرت غائب ہو گئی ہے ۔ افلاس اور سرمایہ کی ریس نے فطرت کو روند ڈالا ہے ، مار ڈالا ہے ۔ فنا کر دیا ہے ۔

ان کوٹھیوں میں وہی لوگ رہتے ہیں جو دہلی (بلکہ ہندوستان) پر راج کرتے ہیں ۔ کار ، بل ڈاگ ، ہرے ہرے لان ، برقی قمقمے ، مصوروں کے قیمتی شاہکار ریشم و کمخواب ۔ دودھ اور چاندنی میں ڈھلی ہوئی عورتیں ، ڈرائینگ روم ، بیڈنگ روم ریڈنگ روم ، ویٹینگ روم ، ڈائننگ روم ، پنگ پانگ روم ، چلڈرن روم ۔ ڈانس روم انگریزی میں ہنسنا ، رونا ، لڑنا ، عشق کرنا ۔ غرض راج کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے ۔ وہ سب ان کوٹھیوں میں جمع کر لی جاتی ہیں ۔ ان سب نعمتوں کے لئے روپیہ کہاں سے آتا ہے ؟ یہ رائل فیملی کے شہزادے ہی جانتے ہیں ۔ کیونکہ یہ ان کا " ٹریڈ سیکرٹ " ہے ۔

ہاں ! دہلی میں ایک افواہ ضرور پھیلی ہوئی ہے ۔ کہ یہ سب نعمتیں وہی لوگ مہیا کرتے ہیں ۔ جن سے یہ شہزادے بھاگ کر جنگلوں کی طرف بڑھتے اور کوٹھیاں بناتے

جارہے ہیں۔

یہ کوٹھیاں اور بنگلے کرایہ پر مل جاتے ہیں لیکن ان میں صرف وہی کرایہ دار رہتے ہیں جو خود بھی رائل فیملی سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ ان کا کرایہ بھی شاہی ہوتا ہے کہتے ہیں ایک بار ایک سرکاری افسر نے جن کی تنخواہ ایک ہزار روپے ماہانہ تھی، ایک کوٹھی ایک ہزار روپے ماہانہ کرایہ پر لے لی وہ اپنی تنخواہ کرایہ میں دے کر کوٹھی کے باہر بیٹھ گیا۔ اور ہر راہ چلتے کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا۔ بابا! خدا کے نام پر ایک پیسہ دے دو۔ بھوکا ہوں۔"

لیکن شام تک اسے بھیک میں ایک پیسہ تک نہ ملا۔ کیونکہ ہر راہ چلنے والے نے یہی سمجھا۔ ایسا سوٹڈ بوٹڈ آدمی بھکاری نہیں ہو سکتا۔ مذاق کر رہا ہے۔

عوام کے مکان

دہلی عوام کا شہر ہے۔ اس لئے ان کے مکان بھی عوامی ہیں ان کے مکانوں کی وہی ساخت ہے جو عوام کی اپنی ساخت ہے۔ عوام بھوک کے مارے ہیں۔ اس لئے ان کے مکان بھی یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے صدیوں سے بھوک ہڑتال پر ہیں۔

عوام کے مکان عوام کے کلچر کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی تعمیر کے وقت بھی عوام کے کلچر کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے۔ ایک کمرہ ایک رسوئی۔ ایک باتھ.... مگر نہیں باتھ روم کا کام رسوئی سے بھی لیا جا سکتا ہے اور بس ــ اس سے زیادہ کی عوام کا کلچر اجازت نہیں دیتا۔ اگر کسی عام آدمی کے پاس ایک کی بجائے دو کمرے ہوں تو اس کی بیوی یہ کہہ کہہ کر اس کی نیند حرام کر دیتی ہے کہ یہ دوسرا کمرہ کرایے پر اٹھا دو۔ ہماری ضرورت سے زیادہ ہے۔ اور کچھ نہیں تو اس کرایہ سے بچوں کی نیکریں اور قمیضیں ہی بن جائیں گی۔

عوام شاستروں کے انویائی ہیں۔ اس لیے ان کے مکان بھی شاستروں کا ترجمہ معلوم ہوتے نہیں۔ ان مکانوں سے صبر و قناعت ٹپکتی ہے۔ حرص و ہوا کا ادھر کبھی گزر نہیں ہوتا۔ اکڑ فوں اور جھوٹا غرور انھیں چھو تک نہیں گیا۔ ایک پاخانہ پندرہ عوامی کنبوں کے لئے کافی ہے۔ ایک غسل خانہ میں دس دس گھرانے اشنان کر لیتے ہیں ایک ہی کمرے میں چارپائیاں، کرسیاں، ریڈیو سیٹ، انگیٹھی، جوتے کتابیں برتن ہر چیز سما جاتی ہے۔ کیونکہ عوام کی تھیوری یہ ہے کہ دل بڑا ہونا چاہیے مکان نہیں۔ دل بڑا ہے تو اس میں کرسیاں بھی رکھی جا سکتی ہیں اور پانی کی بالٹیاں بھی۔ کئی لوگوں نے تو اپنے دل میں بچوں کے لئے پلے گراونڈ تک بنا رکھے ہیں۔ جسے دیکھ کر وہ خدا کا شکر بجا لاتے ہیں۔ جس نے انھیں صوفہ سیٹ عطا نہیں کیا۔ ورنہ وہ اسے کہاں رکھتے۔

عوام کے ان مکانوں کی ایک اور کلچرل خصوصیت بھی ہے وہ یہ کہ ان مکانوں کے ناموں میں تکلف اور جھوٹ روا نہیں رکھا گیا یعنی عوام نے اپنے مکانوں کے "شیش محل" "پریم بھون" "قصر احمر" "آرام محل" "عشرت کدہ" جیسے شاندار نام نہیں رکھے۔ بلکہ ان کے مکانوں کے نام ہندسوں پر رکھے گئے ہیں۔ بلاک نمبر ۸ کوارٹر نمبر ۱۵ - چوبیس نمبر، اٹھائیس نمبر، پچاس نمبر۔ ان سیدھے سادے۔ غیر پیچیدہ ناموں سے عوام کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ عوام کو اب اپنے نام رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ یعنی اگر کسی کا نام گھنشیام لال ہے تو اسے گھنشیام لال کے نام سے نہیں پکارا جاتا۔ بلکہ یہ کہا جاتا ہے۔ اٹھارہ نمبر والا آیا تھا۔ کہتا تھا بائیس نمبر والے کی بیوی اس کے تکیے کا غلاف چرا کر لے گئی ہے۔ ہم نے چھبیس نمبر والے سے اس کی شکایت کی تو آٹھ نمبر والا باہر نکل آیا اور اس کی بے جا حمایت کرنے لگا۔

یعنی عوام کا کوئی نام نہیں رہا۔ مکانوں کا نام ہی باقی رہ گیا ہے۔ عوام

اب اپنے مکان کے نام ہی سے پہچانے اور پکارے جاتے ہیں۔ عوام اب انسان نہیں رہے مکان ہو گئے ہیں۔ عوام اور مکان میں بعید کھاؤ مٹ گیا ہے۔ اور "تو من شدی، من تو شدم" کے مصداق ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے آتما، پرماتما میں مل جاتی ہے اور یہ عوام کے کلچر کی وہ بلند ترین منزل ہے۔ جہاں سے خدا صرف ایک آدھ انچ آگے رہتا ہے۔

سلم ایریا کی جھونپڑیاں۔

دہلی میں سلم ایریا کی جھونپڑیاں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ ان کا کوئی طرز تعمیر نہیں۔ یہ خودرو پودوں کی طرح اگتی ہیں اور خود بخود مرجھا جاتی ہیں۔ یہ عام طور پر گندے نالوں، نشیبی علاقوں اور جھاڑ جھنکاڑ کے پاس بنائی جاتی ہیں۔ بظاہر یہ دہلی کے ماتھے پر داغ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اس داغ کے بغیر دہلی کا ماتھا مکمل نہیں ہوتا۔ اس لئے جب دہلی کے ماتھے کو صاف کرنے کے لئے ایک جھونپڑی گرائی جاتی ہے تو نئی جھونپڑیاں جنم لے لیتی ہیں۔ دہلی کے مہذب حکام کا خیال ہے کہ جب تک ان جھونپڑیوں میں رہنے والوں کو ختم نہیں کیا جائے گا، یہ جھونپڑیاں ختم نہیں ہو سکتیں۔ لیکن جھونپڑیوں والے چونکہ سماج کی تہذیب کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اس لئے وہ ختم نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ تہذیب کی کوکھ کو بانجھ کرنا کسی کے بس کا روگ نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ تہذیب کے نمائندے ان جھونپڑیوں کو ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں۔ انھیں" پانی، بجلی اور نالیاں مہیا کرتے ہیں، انھیں ووٹروں کی فہرست میں شامل کر لیتے ہیں، ان کے خلاف آواز اٹھاتے رہتے ہیں تاکہ یہ غلاظت قائم رہے۔ زندہ رہے۔ کیونکہ جمہوریت کو زندہ رکھنے کا یہی تقاضا ہے

خط لکھیں گے...

آنریبل اُدگھاٹن سنگھ جی کے نام

وزیر صاحب قبلہ!

کل آپ نے جوتیوں کی دوکان کا ادگھاٹن کرتے ہوئے ایک شعر پڑھا تھا ۔

جب بھی کسی نے محبوب کا نام لیا
ہم نے دل اور جگر دونوں کو تھام لیا

ایک حسین شعر کو آپ نے صرف اس لیے ذبح کر ڈالا۔ کیونکہ آپ وزیر تھے اگر آپ آبپاشی کے وزیر ہوتے تو بے شک آپ شعر و ادب کا ستیاناس کر سکتے تھے لیکن آپ کو یہ یاد نہیں رہا کہ آپ تعلیم کے وزیر ہیں۔ آنریبل ادگھاٹن سنگھ جی آپ اپنے حافظے کی طرف خاص دھیان دیجیے کہ آپ کس محکمے سے متعلق ہیں۔

میرا خیال ہے آپ نے گزشتہ مہینے چارپائیوں کی دوکان کا ادگھاٹن کرتے وقت بھی یہی غلط شعر پڑھا تھا اور ایک چٹ فنڈ کمپنی کی میٹنگ میں بھی یہی غلط شعر ارشاد فرمایا تھا۔ کیا آپ کو کوئی اور غلط شعر نہیں آتا؟ میرا مطلب ہے کبھی کبھی ایک آدھ صحیح شعر بھی پڑھ دیا کیجیے اور اگر یہی غلط شعر ہی پڑھنا ہے تو اس

میں وقتاً فوقتاً تھوڑی سی تبدیلی اور اصلاح کر لیا کیجئے یعنی ہمیشہ دل و جگر ہی نہ تھاما کیجئے۔ کبھی پھیپھڑا بھی تھام لیا کیجئے۔ آخر دوسرے اعضاء نے کیا قصور کیا ہے۔ سب کے ساتھ سوشلزم برتئے۔ سنا ہے آپ سوشلزم کے بڑے حامی ہیں (اس انکوائری کمیشن کا کیا بنا جو آپ کی ناجائز اولاد کے سلسلے میں مقرر کیا گیا تھا؟)

یائی ڈی دے! یہ بتلایئے کہ آپ وزیر بننے سے پہلے کیا کام کرتے تھے؟ کیا یہ افواہ صحیح ہے کہ آپ ناجائز شراب کی بھٹی چلاتے ہوئے ایک بار گرفتار ہو گئے تھے لیکن بعد میں نشہ بندی کمیٹی کے چیئرمین بنا دیئے گئے تھے۔ ماضی تو آپ کا برا نہیں تھا۔ اپنا "حال" کیوں بگاڑ لیا اور غلط شعر پڑھنے لگے۔ لیکن قسمت کے دھنی ہو آنریبل! غلط شعر پڑھ کر بھی سامعین سے داد کی تالیاں بجوا لیتے ہو۔

نوجوان بھکارن کے نام

رام کلی ڈارلنگ۔

میں نہیں جانتا تمہارا نام رام کلی ہے یا چمپا کلی۔ کیونکہ بھکارن کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ وہ نام سے نہیں کام سے پہچانی جاتی ہے اور "ڈارلنگ" میں نے تمہیں اس لئے لکھ دیا کیونکہ خالی رام کلی کچھ اچھا نہیں لگتا۔ پھیکا پھیکا سا لگتا ہے "ڈارلنگ" کا لفظ صرف تمہاری تکمیل کے لئے لگایا ہے۔ جیسے لوگ اپنے نام کے ساتھ نواب، سردار، چودھری، شری یا مہاشے لگا کر اپنے نام میں جان پیدا کر دیتے ہیں۔

رام کلی! میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تم کہاں سے آئی ہو۔ ہو سکتا ہے۔ تمہارا سلسلہ نسب بھی کسی سردار، چودھری یا نواب سے ملتا ہو۔ کیونکہ اس دنیا کا ہر انسان کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی "رائل فیملی" سے متعلق رہا ہے (ہمارے محلے کا حلوائی اپنے آپ کو سورج بنسی خاندان سے جوڑتا ہے) عین ممکن ہے تمہاری پردادی بھی کسی شہزادے کی

محبوبہ رہی ہو۔ میں ایسے کئی سفید پوش چودھریوں کو جانتا ہوں جو یا تو کسی نہ کسی رام کلی کے بطن سے نمودار ہوئے یا کسی نہ کسی حسین اور جوان رام کلی کے بطن سے آنے والے چودھریوں کو نمودار کرنے کا باعث بنے۔

یہ جب نسب کی تکلیف دہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں رام کلی ڈارلنگ کہ جس پیڑ کے نیچے چند ماہ پہلے تم رین بسیرا کرتی تھیں وہاں سے تم ایک دم گم ہو گئیں لیکن اب کے جب تم پھر لوٹی ہو تو تمہاری گود میں ایک ننھا سا بچہ بھی تھا مستقبل کا ایک اور ننھا بھکاری۔ سچ سچ بتاؤ تم کسی راج محل میں چلی گئی تھیں سوسائٹی کا کوئی شہزادہ، کوئی چودھری، کوئی سردار تمہیں شاہی نسل کی بدنصیب بھکاری سمجھ کر لے گیا تھا اور تمہارے بطن سے ایک راجکمار پیدا کرنے کے بعد تمہیں پھر اسی پیڑ کے نیچے پھینک گیا ہے تاکہ تم اپنے پیڑ کے ساتھ جڑ جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے۔ رام کلی! رائل فیملی ابھی تک تمہیں نہیں بھولی۔ ان کی رگوں کا لہو تمہارے لئے آج بھی کبھی کبھی مچل اٹھتا ہے۔

بہرکیف تمہیں بیٹا مبارک ہو۔ بڑا ہو کر یہ بھی بھکاری بن جائے گا۔ نسل کوئی بھی ہو رام کلی! اسے قائم رہنا چاہیئے۔ کم از کم اس کی وجہ سے خاندان کا نام تو زندہ رہے گا۔ گداگری کی رسم تو جاری رہے گی۔

گھر کے چوہے کے نام۔

برخوردار نورچشم عزیزی چوہے!

جب ہماری بلی کی (جو کسی بلے کے ساتھ بھاگ گئی ہے) اور بعد اس کے میں تم سے ایک خانگی قسم کی شکایت کرنا چاہتا ہوں کہ میری بیوی کی تازہ ترین اطلاع کے مطابق اس گھر میں پانچ چوہے آچکے ہیں اور ان سبھوں کو تم لے آئے ہو۔

دیکھو عزیز! میں تم کو اپنا لے پالک سمجھتا ہوں اور تم میرے گھر میں یوں رہ رہے ہو جیسے میری جائداد پر تمہارا آبائی حق ہے۔ تم چینی کی پلیٹ توڑ دو، صابن کی ٹکیہ اٹھا کر باہر گلی میں پھینک آؤ، میز پوش کتر ڈالو، کتابیں کھا جاؤ، کیلوں سے ناشتہ کرو، مرغی سے ڈنر یا آلوؤں سے لنچ، میں نے کبھی اس کا برا نہیں مانا۔ بلکہ ہمیشہ یہ سوچ کر معاف کر دیا کہ اولاد نالائق ہو تو اسے گھر سے باہر نہیں نکال دیتے۔

مگر میری اس رواداری اور شفقت کا تم نے غلط مطلب نکال لیا اور تم میرا گھر برباد کرنے کے لئے چار مزید مشٹنڈے لے آئے ہو۔ نتیجہ یہ کہ اب میرا خرچہ چار گنا بڑھ گیا ہے۔ اے ناخلف! میں تمھیں تو اس لئے برداشت کر رہا تھا کہ ایک آدھ چوہا گھر میں ضرور رہنا چاہئے۔ اس سے ذرا گھر کی رونق اور ورائٹی قائم رہتی ہے۔ گھر میں چوہا نہ ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی میں کوئی چیز کم ہے اور پھر تمہاری وجہ سے مجھے ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ چور ہمارے گھر آنے سے کتراتے تھے۔ کیونکہ رات کی گہری تاریکی میں جب سارا گھر سو جاتا ہے تو تم فوراً بیدار ہو جاتے ہو اور گھر بھر میں اچھل کود، کھڑ کھڑ اور توڑ پھوڑ کرتے رہتے ہو۔ چور ان آوازوں کو سنکر الٹے پاؤں لوٹ جاتے ہیں کہ جب گھر میں ایک چور پہلے سے موجود ہے تو ہماری گنجائش کہاں ہے۔

لیکن اے بدبخت! تم نے اسے ہماری کمزوریوں پر محمول کیا۔ تمہیں اتنی عقل نہیں آئی چراغ خانہ صرف اکلوتا چوہا ہوتا ہے، پانچ پانچ چوہے نہیں ہوتے۔ پہلے سارے گھر پر صرف تمہاری مناپلی تھی۔ لیکن اب جائداد کے چار وارث اور پیدا ہو گئے میں تمھیں اتنا احمق نہیں سمجھتا تھا کہ اپنی سلطنت میں غیر ملکیوں کو دخل دینے کی اجازت دے دو گے۔ فرض کرو، کل کلاں یہ چاروں چوہے ملکر تمھیں ہی اس گھر سے بھگا دیں تو کہاں جاؤ گے نالائق۔

لہٰذا میں تمھیں متنبہ کرتا ہوں کہ اس خط کو تار سمجھو اور ان چاروں غیر ملکیوں کو نکال دو۔ ورنہ تمھیں بھی بوریا بستر اٹھا کر چل دینا ہوگا۔ میں بلی کو منا کر پھر لے آؤں گا۔ چوہے دان کا استعمال سنجیدگی سے شروع کر دوں گا۔ تمھیں صرف دو دن کی مہلت دی جاتی ہے۔ سنبھل جاؤ۔ ان چاروں چوہوں کو دھوکے سے پھسلا کر پڑوسی دھنی رام کے گھر لے جاؤ۔ وہاں میرے گھر سے زیادہ کھیل آتے ہیں۔ کیونکہ اس کا بہنوئی ایک تھانیدار ہے۔

نہال چند ڈاکیئے کے نام۔

نہال چند جی!

یہ تم نے کیا غضب کر دیا کہ کسی مس پربھا کی چٹھی میرے گھر پھینک گئے ہیں۔ کھول کر پڑھا۔ (یہ میری بداخلاقی تھی) تو وہ کمبخت "لو لیٹر" نکلا۔ لفافے پر ایڈریس بھی لکھا تھا، فقیر چند کا۔ تم سمجھے یہ فکر تونسوی کا خط ہے۔ لفافہ عطر کی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ بھلے آدمی! نام نہیں پڑھا جاتا تو کم از کم لفافہ سونگھ ہی لیتے کہ یہ خط فکر تونسوی کا نہیں ہو سکتا۔ تمہاری معلومات میں اضافے کے لئے یہ عرض کر دوں کہ فکر تونسوی کو نامۂ الفت نہیں لکھتا، اسے تو ماتمی خط ملتے ہیں یا قرض خواہوں کے۔ یہ حرکت کر کے تم نے صرف مس پربھا اور فقیر چند کے عشق ہی کو رسوا نہیں کیا، محکمۂ ڈاک و تار کو بھی رسوا کر دیا۔

اور نہال چند، اس المیے کا ایک اور پہلو بھی ہے کہ اگر مس پربھا کا خط میرے پاس پہنچ گیا ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ میرا کوئی خط تم مس پربھا کو دے آئے ہو۔ یا اس نا ہنجار فقیر چند کو دے آئے ہو۔ اور ہو سکتا ہے وہ میری بیوی کا خط ہو۔ جو مجھے طلاق کی دھمکی دے کر میکے چلی گئی تھی۔ میں اس کی گالیوں بھرے خط کا انتظار کر رہا ہوں

اب وہ گالیاں میرے بجائے فقیر چند کو مل گئی ہوں گی۔ بچارے فقیر چند اب میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔ اس کے دل میں میری جو عظمت ہوگی وہ خاک میں مل چکی ہوگی،

ہائے ظالم نہال چند! تم نے سب کچھ بنٹاڈل کر دیا۔ مس پرکھا، فقیر چند، فکر تونسوی سب کے راز فاش کر دیئے۔ اے اندھے! اپنی عینک کا نمبر کیوں نہیں ٹھیک کرا لیتے؟

مس پرکھا کا "لولیٹر" ابھی تک میرے پاس ہے۔ میرے لئے وہ بیکار ہے۔ فقیر چند کے لئے اکسیر ہے ہائے محبوب نہ ملنے پر نہ جانے اس بچارے پر کیا بیت رہی ہوگی کل بے اختیار میرا جی چاہا تھا قاصد بن کر یہ خط فقیر چند کو دے آؤں۔ لیکن عقل نے سمجھایا اس سے عاشق کی رسوائی ہوگی۔ خواہ مخواہ نادم ہو جائے گا۔ میں ذاتی طور پر عشق کی رسوائی کا قائل نہیں ہوں۔

اس لئے نہال چند! یہ تمہارا اخلاقی فرض ہے کہ مجھ سے وہ خط لے جاؤ اور فقیر چند کے حوالے کر آؤ اور ہاں، یہ بات نوٹ کر لو کہ اگر آئندہ مس پرکھا کا کوئی خط تم نے میرے گھر دیا تو میں اس کی اطلاع مس پرکھا اور انسپکٹر جنرل ڈاکخانہ جات دونوں کو دے دوں گا۔

پاچھی غنڈے کے نام۔

کل سیٹھ بدھر چند جی (ہلدی کی تھوک اور پرچون والے) شکایت کر رہے تھے کہ پاچھی مجھ سے خفا ہو گیا ہے۔ حالانکہ میں اس پر تقریباً ایک لاکھ روپیہ صرف کر چکا ہوں۔ لیکن اب وہ مجھے چھوڑ کر سیٹھ گوبر چند جی (کھدر ریشم رنگ والے) کا غنڈہ بن گیا ہے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے اشارہ دیا۔ کہ اب وہ کسی اور غنڈے سے

کی تلاش میں ہیں۔ جو ان کی جان و مال کی حفاظت کر سکے اور پاچھی کو کبھی سربازار ذلّت کا
کا مزا چکھا سکے۔

پاچھی دادا! میں نہ لومڑ چند ہوں نہ گودڑ چند۔ اس لئے مجھے تم سے شکایت نہیں ہے۔ لیکن ایک نکتہ تم پر ضرور واضح کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے اپنا سیٹھ بدل کر غلطی کی۔ اس سے تمہارے کردار پر ناحق ایک دھبہ آ گیا۔ لومڑ چند ہو یا گودڑ چند تمہارے لئے دونوں برابر ہیں۔ دونوں ایک ہی غزل کے دو قافیے ہیں۔ تمھیں تو خدمت کرنا ہے۔ کسی کی کر لو۔ دونوں کے لئے تم بازار کی جنس ہو۔ ایک فروختنی جنس۔ تمہیں ان میں سے کوئی بھی خرید لے تمھیں اس سے کیا ۔۔۔؟ مگر پاچھی! ۔۔۔ غنڈے کے کردار کی بلندی یہ ہے کہ وہ ایک بار جسے مالک کہہ دے اسی کا وفادار بن کر رہے۔ تم ذرا سوچو، کتے تک اپنا مالک نہیں بدلتے اور تم تو انسان ہو۔

اور پھر یہ بھی تو نہیں کہ گودڑ چند کے پاس جا کر تم کوئی ایسی نئی اور اچھوتی خدمت انجام دو گے جو لومڑ چند کے ہاں انجام نہیں دیتے تھے۔ نہیں پاچھی دادا! تمہارا کام ہر جگہ ایک جیسا رہتا ہے یعنی جیب میں چھرا رکھنا، سیٹھ کے مخالفوں کو ڈرانا دھمکانا، مالک کی ناجائز اور نازیبا حرکتوں پر اپنی قوت اور شوکت کا پردہ ڈالنا اور موقع ملے تو ایک آدھ مخالفت کا سر اتار کر گندے نالے میں پھینک دینا۔ تمھیں یاد ہوگا کہ ایک بار سیٹھ لومڑ چند کے الیکشن جلسے میں تم نے سیٹھ گودڑ چند کے تین چار حمایتیوں کے دانت توڑ ڈالے تھے۔ اب تم اسی سیٹھ گودڑ چند کے غنڈے بن کر لومڑ چند کے حمایتیوں کے دانت توڑ دو گے۔ تمہارے بنیادی رول میں کیا فرق پڑا پاچھی! ذرا سوچو ذرا سوچو۔ اس میں لومڑ چند یا گودڑ چند کی رسوائی نہیں، تمہاری رسوائی ہے۔ آنے والے مورخ تمہارے بارے میں کیا لکھیں گے کہ پاچھی نے چند ٹکوں کی خاطر غنڈہ نسل کا ایمان بیچ دیا۔

اس لئے میری مانو تو لوٹ آؤ۔ لوٹ آؤ سیٹھ لومڑ چند کے پاس لوٹ آؤ کہ لومڑ چند کا وزن بھی مع توند ایک کوئنٹل ہے اور گودڑ چند کا وزن بھی مع توند ایک کوئنٹل ہی ہے۔

پڑوسی منگل چند کے نام

پیارے منگل چند جی

تم سے ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گے!

تم ہر روز میرے ہاں تشریف لے آتے ہو اور میری میزبانی کے اخلاق سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو۔ ناجائز فائدوں کی ایک مختصر سی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) میرے سگریٹ پھونک جاتے ہو۔ کبھی کبھی ایش ٹرے بھی میز پر الٹ دیتے ہیں۔

(۲) میرے رسالے اور کتابیں اٹھا کر لے جاتے ہو اور اول تو لوٹاتے نہیں اور اگر لوٹاتے بھی ہو تو زخمی حالت میں۔

(۳) تم چائے کا مطالبہ کرتے ہو اور وہ بھی دودھ اور چینی کی۔ اس مہنگائی کے زمانے میں۔

(۴) اپنی وقت گزاری کے لئے تم میرا قیمتی وقت برباد کر جاتے ہو۔

(۵) تم دنیا کی بے ایمانیوں کا رونا روتے ہو۔ جو میرے لئے کوئی نیا انکشاف نہیں ہے۔

(۶) کبھی کبھی مجھ سے ادھار بھی مانگ لیتے ہو جو ہمیشہ ادھار ہی رہتا ہے۔

یہ خط محض اس لئے لکھ رہا ہوں کہ میں زبان کا بزدل اور تحریر کا شیر افگن ہوں۔ شاید میرے اس خط کی تحریر سے تم سنبھل جاؤ اور آئندہ ان حرکتوں سے باز آجاؤ اور اگر تم واقعی برا مان گئے تو بھئی! بے شک آجایا کرو۔ میں تمہاری خاطر

اپنا اخلاق ترک کر دوں گا۔ اطمینان رکھو۔

گھائل نامرادآبادی کے نام۔

قبلہ گھائل صاحب!

میں نے اکثر آپ کا کلام سنا ہے۔ پڑھا بالکل نہیں۔ کیونکہ آپ کا کلام پڑھنے کے قابل نہیں صرف سننے کے قابل ہے۔ خدا نے آپ کو گلا نہیں جلترنگ عطا کیا ہے۔ اگر شاعر کی بجائے قوال بن جاتے تو زیادہ نیچرل رہتے۔ اس سے جہاں شاعری آپ کی دستبرد سے محفوظ رہتی، وہاں قوالوں کے قبیلے کی ساکھ اور تعداد بھی بڑھ جاتی۔ اف! آپ کے شعر کتنے بے معنی ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کا گلا کتنا معنی خیز ہوتا ہے۔ آپ کا گلا نہیں ہے ڈکشنری ہے۔

کل ایک اور شاعر نے آپ کی تذلیل کرنے کی خاطر مجھے بتایا کہ آپ دراصل خود شاعری نہیں کرتے بلکہ دوسروں سے لکھوا لیتے ہیں۔ یہ تو انتہائی تماشا لگتی ہے۔ گھائل صاحب! کبھی کبھی خود بھی شعر لکھا کیجئے۔ جب بے معنی شعر ہی لکھنا ہیں تو خود لکھنے میں کیا حرج ہے؟ کوشش کر کے دیکھئے تو سہی۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ آپ اس سے بھی زیادہ بے معنی شعر لکھ سکتے ہیں۔ تخلیق چاہے کیسی بھی ہو اپنی ہونی چاہیے۔

اور ہاں، وہ جو آپ کی ایک کلاسیکل اچکن ہے، اسے اب بدل ہی ڈالئے وہ بھی اب آپ کے اشعار کی طرح بے معنی ہو چکی ۔ افواہ ہے کہ آپ کے پردادا جناب قاتل نامرادآبادی نے بھی یہی اچکن پہن کر شہنشاہ جارج پنجم کے دربار دہلی میں قصیدہ پڑھنے کے لیے زیب تن فرمائی تھی لیکن قبلہ گھائل! اب تو شہنشاہی دور ختم ہو گیا ہے۔ ڈیموکریسی آ گئی ہے۔ کوئی ڈیموکریٹک اچکن پہنا کیجئے۔ شاعری

نہ سہی اچکن تو اچھی ہونی چاہیئے۔

شری باگڑ بلا سنگھ کے نام

ڈیر باگڑ بلا جی

یہ معلوم کرکے کہ آپ ممبر اسمبلی بن گئے ہیں۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آپ میٹرک میں فیل ہوئے تھے تو اشتعال میں آکر ہندوستان ہی سے ہجرت کر گئے تھے اور شاید افریقہ میں بزازی کی دکان کرتے رہے اور پھر جب آپ کے پاس دس پندرہ لاکھ روپے جمع ہو گئے تو ہندوستان سے انتقام لینے کے لئے وطن لوٹ آئے۔ سچ مچ آپ نے ممبر اسمبلی بن کر اپنے میٹرک فیل ہونے کا خوب انتقام لیا۔ یہ ساری خطا یونیورسٹی کی تھی۔ کاش! وہ آپ کو میٹرک پاس ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیتی تو آج ہماری ڈیموکریسی کا یہ حشر نہ ہوتا جو آپ کے ہاتھوں ہوا۔

سنا ہے آپ نے اپنے الیکشن پر ایک لاکھ روپیہ خرچ کر ڈالا۔ بظاہر یہ کافی گھٹیا حرکت معلوم ہوتی ہے لیکن جس کے پاس پندرہ لاکھ روپیہ ہو وہ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ اہلِ ثروت کی اپنی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ لیکن ڈیر باگڑ بلا! مجھے جو چیز معیوب محسوس ہوئی وہ یہ نہیں کہ آپ ممبر اسمبلی کیوں بن گئے بلکہ یہ کہ آپ کے تیکھے نقش کافی بھونڈے ہیں۔ حسن ذہن نہ سہی حسن جسیم ہی ہوتا تو ممبر اسمبلی بننے میں کوئی خاص ہرج نہیں تھا۔ مثال کے طور پر اپنی آنکھوں کو لیجئے۔ آپ کی کل ملا کر ڈیڑھ آنکھ ہے۔ کم از کم دو آنکھیں تو سالم ہونی چاہئیں۔ آپ کی ناک اگر پوری ہو تو آلو کا ٹکڑا معلوم ہوتی ہے۔ کاش! آپ پلاسٹک سرجری سے اس کی تراش خراش کرا لیتے تو آپ مخالف امیدوار کی ضمانت ضبط کروا سکتے تھے اور جب اس پچکوٹے چہرے پر آپ کی اوٹ اور کچھ بیتا نگ داڑھی؟ ہائے رے، ائے

دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مناسب غذا نہ ملنے سے دھرتی پھٹ گئی ہے اور کچھ بے ہنگم جھاڑیاں اِدھر اُدھر سے اگ آئی ہیں اور جناب باگڑبلا صاحب! میں آپ کی توند کے متعلق کوئی تشبیہہ پیش نہ کروں گا۔ کیونکہ وہ تشبیہات کی حد سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ معاف کیجئے، میں یہ نہیں کہتا کہ آپ یوسف ثانی یا گریٹا گاربو کیوں نہ ہوئے؟ سیاست کے لئے بدن کا حسن نہیں، دماغ کا حسن چاہئے لیکن آہ آپ کو تو وہ بھی میسر نہیں۔ اچھا بتاؤ ذرا، بلی موریا کون تھا اور اس نے شادی کیوں نہیں کی تھی؟

میرے الفاظ کا برا مت ماننا۔ مجھے دراصل ابھی ابھی بلّی پر سخت غصہ آیا تھا۔ کیونکہ وہ ہمارا دودھ پی گئی اور میں اپنا غصہ کسی نہ کسی پر نکالنا چاہتا تھا۔ بلّی سے مجھے بلّے کا خیال آگیا اور پھر باگڑبلے کا اور یوں یہ غصیلا خط آپ کو لکھ ڈالا۔ ورنہ پیارے! بلیاں تو دودھ پی ہی جاتی ہیں۔ ہم ان کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟

آپ اس خط کو پڑھ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیجئے۔ اپنے ریکارڈ میں محفوظ مت کر لیجئے۔ ورنہ آنے والی نسلیں بڑھی دکھی ہوں گی کہ ہمارے آباؤ اجداد کو کیسے خط لکھے جاتے تھے۔

بابو بدری لال کے نام

اے لوئر ڈویژن کلرک

میں ہر روز دیکھتا ہوں کہ تم اپنی چھت پر کھڑے ہو کر ایک لڑکی کو اشارے کرتے رہتے ہو۔ سچ سچ بتاؤ، کیا تمھیں اس سے عشق ہو گیا ہے؟

دیکھو بیٹا! عشق بری بلا ہے۔ اس سے گھر برباد ہو جاتا ہے اور تمہارے پاس تو ابھی گھر بھی نہیں ہے۔ کرائے کی ایک ذلیل سی کوٹھری میں رہتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ

تم اپنی دو سو روپے کی تنخواہ میں گھر کے پانچ افراد کو پالتے ہو۔ تمھاری بائیسکل کی ٹیوب پر پندرہ پنکچر لگے ہوئے ہیں۔ تمہارے جوتے ہفتوں پالش سے محروم رہتے ہیں پرسوں تم نے اپنی چھوٹی بہن کو ڈنڈے سے پیٹا تھا۔ کیونکہ وہ بغیر فیس لئے سکول جانے سے انکار کر رہی تھی۔ شیو کا بلیڈ تم اکثر پڑوسی سے مانگتے دیکھے گئے ہو وغیرہ وغیرہ یعنی تم انسان تھوڑے ہو، صرف وغیرہ وغیرہ ہو۔

ایسے عالمِ افلاس میں اے بدری لال! تمھیں عشق کی سوجھی ہے۔ ارے عشق کی بجائے بائیسکل کی نئی ٹیوب ہی خرید لیتے یا کسی سیٹھ گوجر چند کے گھر پیدا ہوتے۔ پندرہ پنچروں کے ساتھ محبوبہ کے لب و رخسار کی باتیں کرتے ہوئے تم کو شرم نہیں آئی! اس لڑکی کا کیا ہے اس پر تو شباب ٹوٹ پڑا ہے۔ جس نے اسے مضطرب کر رکھا ہے اور وہ کسی نہ کسی کے گھر کو برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس لئے میری مانو تو ابھی عشق کی ملتوی کر دو۔ میں تو کہتا ہوں عمر بھر کے لئے ملتوی کر دو اور تھوڑے سے روپے جمع کر کے شادی کر لو۔ کلرک کا کام شادی کرتا ہے عشق کرتا نہیں۔ عشق کے کاغذ پر ٹائپ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ ٹائپ کرنے کے لئے دفتر کی چٹھیاں ہی موزوں ہیں۔ اپنی زندگی کی ٹائپ مشین پر "لو لیٹر" ٹائپ مت کیا کرو کیونکہ تمہاری مشین کی کوالٹی کچھ اچھی نہیں ہے۔ اپنی مشین کی طرف دیکھو، لڑکی کے تبسم کی طرف مت دیکھو۔

میں اس لڑکی کو بھی سمجھا دوں گا کہ وہ بھی تم پر رحم کرے اور اپنے شباب کا رخ کسی اور طرف موڑ دے۔

ڈلی چند جی کے نام

ڈلی چند!

معاف کرنا، تم انتہائی بور آدمی ہو اور بخدا نے کس ستم گر نے تمہیں میرے

گھر کا ایڈریس دے دیا اور کہہ دیا کہ فکر تونسوی کو بور کرنا ایک بہت بڑا کارِ ثواب ہے
تم ہفتے میں دو تین بار بقول تمہارے میرے "درشن" کرنے کے لئے ضرور آجاتے ہو
ایک خاندانی نقص کی وجہ سے مجھ میں شرافت نفس بدرجہ اتم موجود ہے لیکن اس کا
یہ مطلب نہیں کہ تم میری شرافت کے سینے پر پہاڑ بن کر بار بار گرتے رہو۔ کاش تمہیں
معلوم ہوتا کہ تم میرے پاس آکر جو گفتگو کرتے ہو اس کا کوئی مطلب اور مفہوم نہیں
ہوتا۔ تم آلو گوبھی کے ریٹ سے لے کر ہندوستان کی اخلاقی گراوٹ سے ہوتے
ہوئے عرب کی کھجوروں تک کا ذکر کر ڈالتے ہو اور پھر ان میں سے ہر ایک چیز پر
اپنی بیش قیمت رائے بھی ضرور دیتے ہو اور پھر اے ظالم! یہ تقاضا بھی کرتے ہو
کہ میں بھی تمہاری ہاں میں ہاں ملاؤں اور میں ملا دیتا ہوں، یہ صرف میری شرافت
عرف بزدلی ہے دھوکے میں مت رہنا

ہائے! اب میں تمہیں کس منہ سے کہوں کہ مجھے آلو کے ریٹ اور عرب کی کھجوروں
سے کوئی دلچسپی نہیں، اگر آلو مہنگے ہوتے جا رہے ہیں تو اس کے خلاف اخبار میں ایک
شکایتی خط لکھ دیا کرو۔ مگر خدا کے لئے مجھے روزانہ اخبار مت سمجھو اور باقی رہی عرب
کی کھجوریں تو عرض یہ ہے کہ تم میرے گھر آنے کی بجائے عراق عرب کیوں نہیں چلے جاتے
وہاں مزے سے جا کر کھجوریں کھاؤ۔ میں تمہارے خلاف کسی تھانے میں رپورٹ نہیں
کروں گا کہ یہ شخص کھجوریں کھاتا ہے اسے گرفتار کر لو۔ ایک گزارش اور بھی ہے کہ تم
مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش ترک کر دو۔ یہ کوشش بیکار جا رہی ہے۔ یعنی تم
میرے سگریٹ نوش فرماتے رہتے ہو، چائے کا مطالبہ کرتے ہو اور کل تو تم نے یہ
مطالبہ بھی کر دیا کہ پیسٹہ منگواؤ، چائے کے ساتھ بڑا لطف دیتا ہے۔ تم میری کتابیں
اور رسالے اکٹھا کر لے جاتے ہو اور اول تو لوٹاتے نہیں، اور اگر لوٹاتے بھی ہو تو یوں
جیسے پوسٹ مارٹم کے لئے کوئی کسی کی لاش حوالے کر رہا ہو۔

اے میرے نصیب بلکہ میری بد نصیبی! مجھ پر ترس کھاؤ میرے غریب خانے پر تشریف ضرور لاؤ لیکن یوں آؤ جیسے ہوا کا جھونکا آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ میرے پڑوس میں ایک اور صاحب مسٹر چاندی رام رہتے ہیں۔ تم مجھ سے گزر کر اس کے گھر چلے جایا کرو۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے گزار رہا ہے۔ اپنا مقصد حیات پورا کر چکا ہے۔ اگر تم اسے بور کرنا شروع کر دو تو اس پر کوئی اچھا یا برا اثر نہیں پڑے گا اور تمہارا کام بھی بن جائے گا۔

چاندی رام تمہارا منتظر ہے۔

بلی کے نام

چھوٹے بڑے سب کی موسی

یہ خط تمہیں سٹری رگھبیر داس کے گھر کے پتے پر بھیج رہا ہوں۔ کیونکہ سنا ہے۔ حج کرنے کے بعد جب تم نو سو چوہے کھا کر آئی تھیں تو لوٹی تھیں اور ایک کلو سونا سمگل کر کے ساتھ لائی تھیں تو رگھبیر داس تمہیں بہلا پھسلا کر اپنے گھر لے گیا تھا۔

دیکھو بی بلی! تمہیں یہ معلوم کر کے بہت مسرت ہو گی کہ ہمارے گھر میں ایک بہت موٹا تازہ چوہا رہ رہا ہے۔ اس کی فربہی کا سبب ہماری بے بسی اور اس کی ڈھٹائی ہے۔ اس کے پیٹ میں نہ جانے کتنے انواع و اقسام کے کھانے پہنچ چکے ہیں۔ پھل کیک، گوشت، مکھن، دودھ ملائی، پلاؤ۔ بادام، گھی، ڈبل روٹیاں۔ کیا کیا گنواؤں موسی! جو چیز ہاتھ لگتی ہے۔ چٹ کر جاتا ہے۔ ہم تو اس حرام خور کو یوں پال پوس رہے ہیں جیسے وہ ہمارا داماد ہو! اور کل رات تو بقول میری اہلیہ محترمہ کے وہ وہسکی کی بوتل کے ارد گرد بھی گھوم رہا تھا۔ یعنی وہ بادہ خواری پر بھی اتر آیا ہے۔

محترمہ! ہم اس چوہے سے نالاں ہیں۔ کیونکہ ایک تو وہ چوہے دان کی گرفت میں نہیں آتا۔۔ بے حد ڈپلومیٹ ہو گیا ہے اور دوسرے کھا کھا کر ہینکڑی باز بھی ہو گیا ہے۔ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔ انتہائی بدتمیز بن گیا ہے جیسے کہ حرام کا مال کھا کھا کر ہو جاتا ہے اور کل تو اس نے حماقت کی حد کر دی کہ دیوانِ غالب کو کتر کتر کے اس کے پرزے پرزے کر ڈالے۔ یعنی وہ اب ناشروں کی طرح شعر و ادب کا بھی دشمن بن گیا ہے۔ ذرا سوچو غالب سے اسے کیا دشمنی؟

اس لئے موسی! میں غالب کے نام پر تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ہمارے گھر لوٹ آؤ۔ ہمارے تمہارے تعلقات کافی پرانے ہیں۔ ان تعلقات کے واسطے ہی آجاؤ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہمارے گھر والوں نے تمہیں کافی ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچائی تھی۔ کیونکہ تم ایک بلّے کو بھی ہمارے گھر لے آئی تھیں اور اس کے ساتھ رنگ رلیاں منایا کرتی تھیں، ہم نے اسے برا سمجھا کیونکہ تم عشق میں اندھی ہو کر چوہے پکڑنا بھول گئی تھیں، ہم تمہیں پینے کے لئے جو دودھ دیتے تم چوری چھپے اس لفنگے کو پلا دیتیں ہم نے تمہیں کئی بار سمجھایا کہ یہ مناسب نہیں ہے کہ ؎

تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والے کو بھی چاہوں
مرا دل پھیر دو مجھ سے یہ سودا ہو نہیں سکتا

مگر تم بے حد جذباتی ہو گئیں اور اسی سوال پر ہم میں شکر رنجی ہو گئی اور ایک دن میرے بیٹے نے اس غنڈے بلّے کو ڈنڈا مارا تو تم نے بطور احتجاج میرے بیٹے کو اپنے پنجے سے لہولہان کر دیا اور پھر تم ناراض ہو کر بھاگ گئیں۔ (اور حج کو چلی گئیں)

لیکن موسی! اب میں سمجھتا ہوں کہ عشق ایک ازلی سچائی ہے اور تمہارے عشق میں ہماری مزاحمت غلط تھی۔ تم ہمیں معاف کر دو اور لوٹ آؤ۔ وہ موٹا چوہا اور ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں اور اگر اس بلے سے تمہارا عشق اب بھی چل رہا ہو

اسے بھی ہمراہ لے آؤ۔ کم از کم اس حرامخور چوہے کے مقابلے پر تو وہ بلا بہتر ہے کہ وہ
عاشق ہے۔ چور تو نہیں ہے۔

طوطے کے نام۔

مسٹر ٹیں ٹیں!

میرا خط پاکر تمھیں تعجب تو ضرور ہوگا کہ نہ جان نہ پہچان، لیکن فکر تونسوی نے مجھے خط کیوں لکھ ڈالا؟ لیکن پیارے! میں سماجی بیہودگی کا عادی ہوں اور تم سماج میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہو۔ اس لئے تم سے صرف چند استفسارات کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ معلوم کرسکوں کہ انسانوں کے ساتھ تمہارے تعلقات کی صحیح صحیح نوعیت کیا ہے؟

مثلاً کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم جنگل کے ایک آوارہ پنچھی ہو۔ تم جہاں چاہو جا سکتے ہو جو کھانا چاہو کھا سکتے ہو۔ درختوں کے پھل تمھاری "ڈسپوزل" پر رہتے ہیں۔ تم کتر کتر کر ان کا ستیاناس کر سکتے ہو۔ مگر اس آزادی کے باوجود تم نے انسان کی غلامی کیوں قبول کرلی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمھارا صرف خارجی ڈھانچہ آزاد ہو۔ تمہاری ذہنیت غلامانہ ہو۔ (اس دوغلے پن پر تمھیں شرم آنی چاہیے)

اور پھر تمھارے اندر یہ خاصیت پائی جاتی ہے کہ انسانوں کی آواز کی ہوبہو نقل کرلیتے ہو۔ یعنی تم نقل نویس ہو، اوریجنل نہیں ہو۔ تمہارے پاس اپنا کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے مانگے کا ہے۔ تم صرف انسانی آواز کا کھونڈا چربہ ہو۔ کیا یہ صورت حالات تمہیں پسند ہے؟ کیا نقل نویسی کی زندگی گزار کر تم فخر کرسکتے ہو؟ دوسروں کے سہارے زندہ رہنا اگرچہ جہالت تو نہیں ہے۔ لیکن غیرت مندی بھی نہیں ہے۔ اس لئے پیارے اوریجنل بننے کی کوشش کرو۔ کیا سچ مچ خدا نے تمھیں وہ ذہن عطا نہیں کیا جو خود

سوچتا ہے، خود عمل کرتا ہے۔

اور پھر سنا ہے تم بے وفا بھی ہو۔ جو مالک تمھیں پیٹ بھر کھلاتا ہے، تم اسی سے آنکھیں پھیر لیتے ہو۔ ذرا سوچو، یہ کوئی شرفاء کا کام ہے، مہذب طریقہ تو یہی ہے کہ جس کا کھاؤ اسی کا گاؤ۔ یہ نہیں کہ کھاؤ تو کسی کا، لیکن گن کسی کے بھی نہ گاؤ۔ بلکہ موقع ملے تو پنجرے سے نکل کر کسی اور کے گھر بھاگ جاؤ۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہاری آنکھ کا پانی کیوں مرگیا؟ یا اس میں ازل ہی سے پانی نہیں تھا اور کیا کبھی تمہارے اندر حیا پیدا ہونے کے امکانات بھی ہیں یا بالکل ''ہوپ لیس کیس'' ہو۔

میرے ان استفسارات کے جواب میں صرف ٹیں ٹیں نہ کرنا، مدلل جواب دینا۔

کرسی کے نام

اے نامراد حسینہ!

جب سے تم غریب خانے پر آئی ہے، میرا کردار دگرگوں ہوگیا ہے۔ بالکل ایسے جیسے کسی ان پڑھ کے ہاتھ میں پارکر کا سنہری قلم تھما دیا جائے اور وہ کہے ''میں تو اب ناول نگار ہوں اور میرے ناول پڑھ کر لوگ ڈکنس کو بھول جائیں گے۔''

جب میں تمھیں خرید کر (نیلام گھر سے) گھر لایا تھا تو صرف اس لیے کہ تم سستے بھاؤ مل رہی تھیں۔ عزت اور عظمت اگر سستے بھاؤ مل جائے تو کون چھوڑتا ہے۔ لیکن گھر لایا۔ تو میرے بچے ایک دوسرے سے دھینگا مشتی کرنے لگے۔ ہر ایک کہتا تھا کہ کرسی پر بیٹھوں گا۔ چنانچہ اس سول وار میں دو برخورداروں کی قمیص پھٹ گئیں۔ بیوی چھڑانے کے لیے آئی تو اس کے ماتھے پر ہاکی کا بلا پڑا اور مرہم پٹی کا بل ادا کرنے کے لیے خون بہہ نکلا۔

ثابت ہوا کہ عزت اور عظمت بھی ایک طرح کی نیلام میں خریدی ہوئی کرسی ہے

جو پھٹی ہوئی قمیصوں اور ماتھے کے لہو کے بدلے میں خریدی جاتی ہے۔ تم نے تاریخ عالم میں کروڑوں اربوں قمیصیں پھاڑی ہیں، بیواؤں اور یتیموں کو جنم دیا ہے، لہلہاتے کھیتوں میں زہریلی گیسوں سے آبیاری کی ہے، کئی نسلیں، کئی تہذیبیں صرف تمہارے نام پر مسمار کی گئیں لیکن اس کے باوجود اے حسین و جمیل ستم گر! تمہاری کشش ختم نہ ہوئی اور تم بدستور عظمت اور عزت کی دلربا علامت بنی رہیں ــــ (شمیم شمیم! تم پر نہیں کرسی پرستوں پر)

تمہارے آنے سے پہلے میں ایک شریف انسان تھا۔ مگر آہ! میں شاید اپنے آباؤاجداد کا آخری شریف انسان ثابت ہوا۔ تم نے میری شرافت کو بھی لذیذ لقمہ سمجھ کر نگل لیا۔ کیونکہ جونہی پہلی بار میں تم پر بیٹھا، مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے مجھے کسی کی جیب کاٹنی چاہیئے، کسی کو گالیاں دینی چاہئیں، کسی کو چانٹا مارنا چاہیئے اور کچھ نہیں تو اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا پیالہ نیچے گرا کر توڑ دینا چاہیئے اور طیش میں آکر نوکر کو آواز دینا چاہیئے۔ "ابے حرامی! یہ کپ کیوں توڑ دیا باپ کی جاگیر سمجھا تھا کیا؟"

ہر روز جب ایسے مہیب اور وحشیانہ خیالات ذہن میں آنے لگے تو تمہیں یاد ہوگا، میں (بیوی کی آنکھ بچا کر) تمہیں باہر گلی میں پھینک آیا تھا۔ شام کو گھر لوٹا تو تم پھر گھر میں براجمان تھیں اور ہماری بیوی صاحبہ تم پر جلوہ فرما تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔ "دیکھا آپ کا پڑوسی وہ جوگندر شرما بڑا دھرماتما بنا پھرتا ہے، آج ہماری کرسی ہی چرا کر لے جا رہا تھا۔ میری نظر پڑ گئی تو میں نے اسے وہ جلی کٹی سنائیں کہ اب کم از کم چھ مہینے ہم سے بات نہیں کرے گا۔"

ارے بدتمیز! دیکھیے تم نے اپنے لچھن! میری بیوی بالکل گئو تھی تم پر بیٹھ کر چیتنیا بن گئی۔ جوگندر شرما ہمارا نیک پڑوسی تھا اس کی دھوتی کسی کانٹے سے

تنگ جائے تو وہ کاٹنے سے کبھی معافی مانگ لیتا تھا۔ لیکن ہم تم دونوں پڑوسیوں کے درمیان آئیں تو چھ ماہ کے لئے ہماری بول چال بند کرادی۔ وہ مجھ سے کچھ کتابیں مانگ کر لے گیا تھا اب وہ نہیں لوٹائے گا۔ پیاری نازنین! یہ تم نے کیا غضب کیا۔ دو اچھے پڑوسیوں میں ہی چپقلش کروادی کیا یہی تمھارا خاندانی پیشہ ہے، کہ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی خاطر پڑوسیوں کے درمیان کالی لکیر کھینچ دو، دوستوں کو بھڑادو بھائی بہنوں کے لباس تار تار کروادو، مذہبوں، قوموں اور ملکوں کے درمیان رخنے ڈال کر صدیوں تک انھیں ملنے نہ دو ایک بار پھر شیم شیم! تم پر بھی ہم پر بھی

محترمہ! اب میں بے حد پریشان ہوں کہ تم سے کیسے نجات حاصل کروں میں تمھارے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہوں۔ لیکن نہ بیوی مانتی ہے نہ بچے اور ادھر اگر چھوٹ نہ ملوائے تو نہ میں ہی چاہتا ہوں۔ کیونکہ محلے والے رشتہ دار اور احباب سبھی تمھیں دیکھ کر کہتے ہیں۔ فکر تونسوی عزت دار آدمی ہے۔ کیونکہ اس کے پاس کرسی ہے۔

کبھی کبھی رات کی اتھاہ تاریکیوں کو چیر کر میں ایک دم خواب سے چونک اٹھتا ہوں اور یوں لگتا ہے جیسے تمھیں کوئی چور اٹھا کر لے گیا ہے۔ لیکن آہ! صبح تم پھر موجود ہوتی ہو تم چوروں سے تھوڑے ڈرتی ہو۔ تم تو خود چوروں کی محافظ ہو۔!

سونے کی ڈلی کے نام

اے سنہرے دیس کی شہزادی

نہ جانے تم کہاں ہو؟ میں نے کئی بار تمھیں پیغام بھیجے تار بھیجے، ٹیلیفون بھی کیا۔ لیکن خدا کی طرح تمھارا کبھی کہیں پتہ نہ ملا — ہائے کیا اچھا زمانہ تھا،

جب لوگ سڑکوں پر سونے کی ڈلیاں اچھال دیتے تھے اور کوئی اٹھاتا نہیں تھا اور اس زمانے میں تم کبھی کبھی مجھے نظر آجایا کرتی تھیں۔ لیکن اب تو ایسا زمانہ آن لگا ہے کہ سونے کی ڈلی چھوڑ، خالی ماچس تک سڑکوں پر پھینکو تو لوگ اٹھا لیتے ہیں کہ اس سے بچے ہی کھیلیں گے۔

کبھی کبھی جب خبر آتی ہے کہ فلاں سمگلر کے ہاں سونے کی ڈلیاں پکڑی گئیں تو دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ اور ایک ہوک سی اٹھتی ہے کہ کاش میں بھی سمگلر ہوتا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تمھیں زمین میں دبا کر رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے گھر کی ساری زمین کھود ڈالی۔ لیکن اس کے اندر سے لوہے کے ذلیل سے دو چار ٹھیکرے ہی نکلے۔ پھر کسی نے اطلاع دی کہ محلّے کے تاجر سیٹھ دمڑی لال جی کی آہنی تجوری میں تم نے بود و باش اختیار کر رکھی ہے۔ چنانچہ تمھیں چرانے کی نیت سے پہنچا تو تجوری کے ساتھ ایک بل ڈاگ بندھا ہوا تھا۔ لہٰذا لوٹ آیا۔ کتے سے کون جھگڑا کرے۔ یہ کوئی تہذیب کی زبان تھوڑے سمجھتے ہیں۔ لیکن اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ کتوں سے تم نے تعلقات کیوں گہرے بنا رکھے ہیں۔ کیا انسان برے تھے؟

ایک بار پتہ چلا کہ تم بینک کے لاکر میں پڑی ہو۔ میں نے بینک منیجر سے التجا کی کہ لاکر کھول کر مجھے اس سنہری شہزادی کے درشن کرا دیجئے۔ پہلے تو اس نے بہانے تراشے کہ لاکر کی چابی اس کی مالکن شریمتی پھاپھیاں دیوی جی کے پاس ہے۔ پھر کہنے لگے کہ مالکن کے علاوہ کسی اجنبی کو سونے کی ڈلی دکھانا ہمارے بینک کے قواعد کے خلاف ہے۔ میں نے کہا۔ اتنی حسین شہزادی کو قواعد کی زنجیروں میں کیوں جکڑ رکھا ہے۔ قواعد تو انسانوں کے لئے ہوتے ہیں۔ مگر یہ تو بے جان چیز ہے۔ میرے اس اصرار اور دلیل بازی کو بینک منیجر نے غلط رنگ میں لیا اور مجھے ڈاکوؤں کے گروہ کا

جواب۔ جواب میں ایک لطیفہ عرض ہے۔

ایک نوجوان نے دوسرے سے کہا: "چلو دوست آج ایک فلم دیکھ آئیں"۔ وہ بولا "نہیں دوست! میں نے ڈیڈی سے نہیں پوچھا"۔ پہلے نوجوان نے کہا: "یار! تم نے ڈیڈی کو بہت لفٹ دے رکھی ہے۔

سوال: میں نے اپنا نام فکر تونسوی رکھ لیا ہے۔ مجھے تو یہ نام بہت ذلیل لگا۔؟

جواب۔ ذلیل نہ ہوتا تو کیا آپ رکھ لیتے۔

سوال: تیتر صرف ایک بچہ کیوں پیدا کرتا ہے۔؟

جواب۔ فیملی پلاننگ۔

سوال: میں کسی ایسی بیوی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جو بولے نہیں، صرف میرے حکم کی تکمیل کرے۔ کوئی آپ کی نگاہ میں ہے؟

جواب ہاں ہے ۔ آپ ایک بائیسکل خرید لیجیے۔

سوال: محبوبہ اور لیڈر میں کونسی چیز مشترک ہے؟

جواب۔ وعدہ شکنی۔

سوال: اگر محبوبہ صرف اردو جانتی ہو اور عاشق صرف انگریزی تو آپ ان کے عشق کو کیا کہیں گے؟

جواب۔ اینگلو انڈین ۔

سوال: میری ایک رشتہ دار خاتون نے پرسوں دسویں لڑکی کو جنم دیا ہے آخر وہ چاہتی کیا ہے۔؟

جواب۔ گھر میں گرلز اسکول کھولنا۔

سوال۔ ایک والد اور ایک سسر میں کیا فرق ہے؟

جواب۔ کچھ نہیں ۔ دونوں ایک دوسرے کا غلط ترجمہ ہیں۔

جواب۔ دفتر میں اوور ٹائم۔
سوال:" میں راشٹرپتی بھون خریدنا چاہتا ہوں۔؟ سودا کرا دیجیے۔"
جواب۔ کرادوں گا۔ لیکن مالک مکان کا ایڈریس نہیں مل رہا۔
سوال:" شریف آدمی کی پہچان کیا ہے۔؟"
جواب۔ جو چور سے کہے" بھیا! خالی ہاتھ لوٹنے پر تم سے معافی مانگتا ہوں۔"
سوال:" دلہن کے حسین خواب کب ٹوٹتے ہیں۔؟"
جواب۔ جب وہ راشن ڈپو کے کیو Que میں جا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔
سوال:" میں نے اُسے کہا" عشق کروگی" تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔۔۔۔؟
بتلایئے اُس نے کیا کہا ہوگا۔
جواب۔ یہی کہ سوری، آپ لیٹ ہو گئے۔
سوال:" زندگی میں پریشانی کا علاج کیا ہے ——
اسمگلنگ یا خدا کی عبادت؟
جواب۔ اسمگلنگ کے بعد خدا کی عبادت۔
سوال:" وہ خواب میں ہاں کہہ دیتی ہے، بیداری میں نہ کر دیتی ہے۔ بتایئے وہ کون ہے؟
جواب۔ آپ کی بیوی۔
سوال:" بچہ اپنی ماں کو کیا سمجھتا ہے؟
جواب۔ دودھ کی ڈیری۔
سوال:" میں نے شادی کی تو بیوی کو دیکھ کر یوں لگا، جیسے لاٹری کا ٹکٹ نکلا ہے۔
اس ٹکٹ پر مجھے کتنا انعام ملے گا؟
جواب۔ تین بچے۔
سوال:" دورِ حاضر کی اولاد اپنے والدین کے بارے میں کیا سوچتی ہے"؟

ال: اگر چور لیڈر بن جائے تو سب سے پہلا کام کیا کرے گا۔؟"

ب۔ چوروں کی ٹریڈ یونین بنائے گا۔

ال: "بھکاری کو دان پیسہ دیتے وقت داتا کا ہاتھ کانپتا کیوں ہے"؟

اب۔ کسی دھندے میں پونجی لگاتے وقت رسک (RISK) کا احساس تو ہوتا ہی ہے۔

وال" اگر کوئی بد دیانت شخص دیانت دار بن جائے تو اسے کیا کہیں گے۔؟"

اب: خودکشی۔

وال" جب خدا ہر وقت میرے دل میں رہتا ہے، تو بتائیے میرا اور خدا کا کیا رشتہ ہے؟"

وابـ آپ — مالک مکان

خدا — کرایہ دار

وال" کیا جنت میں بھینسیں ہوتی ہیں"؟

واب۔ کیا آپ کا پروگرام وہاں بھی ملاوٹ کرنے کا ہے۔

وال" ایک شاعر، ایک عاشق — دونوں میں کوئی فرق ہے"؟

واب۔ ہاں ہے۔

شاعر — شاعری کی بنسری تیار کرتا ہے۔

عاشق — اس بنسری کو بجاتا ہے۔

سوال" کل محبوب نے مجھے لفنگا کہہ دیا۔ مگر میں نے برا نہیں مانا۔ کیوں"؟

جواب۔ سچی بات پر کوئی برا نہیں مانتا۔

سوال" ایک ہاتھ سے تالی کیسے بجتی ہے۔

جواب۔ کسی حسینہ سے تھپڑ کھا کر دیکھیے۔

سوال" شادی کے بعد بچے پیدا کرنے چاہئیں تو بچے پیدا کرنے کے بعد کیا کرنا چاہیے"؟

جواب۔ جب ملاوٹی چیزیں بھی چور بازار میں ملا کریں گی۔
سوال:- ہمارے ملک میں آبادی پچپن کروڑ ہے۔ ان میں بیوقوف کتنے ہیں اور عقلمند کتنے؟

جواب۔ بے وقوف ـــ پچپن کروڑ
عقل مند ـــ پچپن کروڑ

سوال:- پہلے زمانے میں لوگ دھرم کی خاطر پھانسی پر چڑھ جاتے تھے۔ آج کل کیوں نہیں چڑھتے؟

جواب۔ آج کل وہ دھرم کو ہی پھانسی پر چڑھا دیتے ہیں۔
سوال:- من میں کنول کھلتے ہیں، تن پر کیوں نہیں کھلتے؟
جواب۔ کنول غلیظ جگہ پر کھلتا ہے۔ مگر تن کو لوگ صاف ستھرا رکھتے ہیں۔
سوال:- میں نے ایک فلم دیکھ کر جیب کاٹنے کا گُر سیکھ لیا۔ لیکن سنیما ہال سے نکلتے وقت میری اپنی جیب کٹ گئی ـــ کیوں؟

جواب۔ اُس جیب کترے نے وہ فلم دو مرتبہ دیکھی ہوگی۔
سوال:- اگر بھینس کو عقل آجائے تو وہ کیا کرے گی؟
جواب۔ اپنے دودھ میں آپ ہی پانی ملایا کرے گی۔
سوال:- خدا کی پرستش کرنی چاہیے یا محبوبہ کی؟
جواب۔ جس میں خرچہ کم ہو۔
سوال:- ترازو میں ایک طرف حسینہ بیٹھی ہو، دوسری طرف کرنسی نوٹ۔ تو آپ کسے ترجیح دیں گے؟

جواب۔ حسینہ سے بیاہ کروا دوں گا۔ کرنسی نوٹوں کو جہیز سمجھ لوں گا۔
سوال۔ جب کوئی نئی کوٹھی بن جاتی ہے۔ تو اُس پر کالی ہانڈی کیوں لٹکا دیتے ہیں؟

جواب۔ انکم ٹیکس والوں کو ڈرانے کے لیے۔

جواب: "وہ بیک وقت باپ بھی لگے گا اور خاوند بھی۔"
سوال: عورت کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو کب آتے ہیں؟
جواب: "خوشی کے آنسو۔ عورت جب ڈولی میں بیٹھتی ہے۔"
سوال: نو زائیدہ بچہ اپنی مٹھی کب کھولتا ہے؟"
جواب: "جب وہ خیرات کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے۔"
سوال: "بچہ پیدا ہوتے ہی کیوں روتا ہے؟"
جواب: "ماں باپ کے مستقبل پر۔"
سوال: "کلرک کو اپنی بیوی کے چال چلن پر شبہ کب ہوتا ہے؟
جواب: "جب وہ خاوند کی جیبیں ٹٹولنا بند کر دے۔"
سوال: "مجھے کئی بار ٹھوکر لگی، مگر پھر بھی عقل کیوں نہیں آتی؟"
جواب: "ٹھوکر لگانے والے آپ سے زیادہ عقل مند ہوں گے۔"
سوال: "عورت اگر جوٹھا برتن ہے تو پھر مرد کیا ہے؟"
جواب: "برتن کی جوٹھ۔"
سوال: "جو بہو اپنی ساس کو ماں کا مرتبہ دے، وہ کہاں ہے؟"
جواب: "وہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہے۔"
سوال: "سوشلزم کیوں لیٹ ہو گیا؟
جواب: "بچارے کے پاس بس کا کرایہ نہیں ہے۔
سوال: "ہمارے محلے کا ایک بلیک مارکیٹیا ہر روز مندر کیوں جاتا ہے؟
جواب: "یہ دیکھنے کہ پرشادے کی بلیک کس طرح کی جا سکتی ہے؟
سوال: "اگر کوئی کا زاد احسینہ ایکا ایک آپ کے کمرے میں داخل ہو جائے تو آپ کے منہ سے سب سے پہلے کونسا فقرہ نکلے گا؟

سوال: "چور بازار میں کب کلائمکس پیدا ہو گا؟

جواب:۔ آپ کے من میں کوئی چور ہے۔
سوال۔" دنیا سے تیاگ کس وقت اختیار کرنا چاہیئے؟"
جواب۔" جب دنیا آپ کو تیاگ دے۔"
سوال:۔ سائیں بابا! خودکشی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"
جواب:۔ بس یہی کہ ناکام خودکشی نہیں کرنی چاہیے۔ ورنہ پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔"
سوال:۔ میرے ایک دوست کی بیٹی ہے جو ایک بند کتاب کی طرح ہے۔
ایسا معلوم ہوتا ہے اُسے کسی نے کھول کر نہیں دیکھا۔"
جواب:۔ کئی کتابیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن کا کور پیج ہی دیکھ کر لوگ رکھ دیتے ہیں۔"
سوال:۔ میرا خاوند کلرک ہے۔ دفتر سے گھر آتے ہی سیدھا چھت پر چلا جاتا ہے اور ایک
لڑکی کو گھورتا رہتا ہے۔ اس سے آخر کیا حاصل ہوتا ہے؟"
جواب:۔" اوور ٹائم۔"
سوال:۔ خدا نے آدم کو پیدا کر کے غلطی کی تو پھر حوا کو کیوں پیدا کر ڈالا؟"
جواب:۔" غلطی کی تصحیح کے لیے۔"
سوال:۔ عشق اگر پاسپورٹ ہے تو شادی کیا ہے؟
جواب:۔ بچے پیدا کرنے کا ویزا۔"
سوال:۔ حسین و جمیل لڑکی اگر ولایتی شراب ہے تو طوائف کیا ہے؟
جواب:۔ دیسی ٹھرا۔"
سوال:۔ وہ کس قسم کے میاں بیوی ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کو طلاق نہیں دیتے۔؟
جواب:۔ جو پہلے ہی طلاق یافتہ ہوں۔"
سوال:۔ میرا خاوند اپنے آپ کو گدھا کیوں کہتا ہے۔ حالانکہ وہ بہت عقل مند ہے۔
جواب:۔ گستاخی معاف۔ عقل مند ہوتا تو کیا آپ سے شادی کرتا۔"
سوال:۔" ڈاکٹر صاحب! اگر پچاس سال کا کوئی مرد بیس سال کی لڑکی سے شادی کر لے
تو کیا لگے گا؟"

جواب :- "اس کے پرانے نو لیٹر۔"

سوال :- "عورت کی گفتگو کا لذیذ ترین موضوع کیا ہوتا ہے؟"

جواب :- "کپڑوں کے ڈیزائن اور پڑوسنوں کی غیبت۔"

سوال :- "خدا نے خوبصورت عورتوں کو حسن عطا کر دیا، بھونڈی عورتوں کو کیا دیا؟"

جواب۔ "عقل"

سوال :- "جس عورت کے پاؤں کی ایڑیاں میلی ہوں؟"

جواب :- "وہ ضرور گر ہستن ہوگی۔"

سوال :- "عقلمند آدمی اور ایک بھینس میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

جواب :- "عقلمند آدمی بھوکوں مرتا ہے مگر بھینس کو ہر روز چارہ مل جاتا ہے۔"

سوال :- "میرا ایک لڑکا نہایت ذہین ہے۔ مگر دوسرا لڑکا نالائق ہے۔ ایک باپ کے دو بیٹے مگر قسمت جدا جدا کیوں ہے؟

جواب :- "ان میں سے ایک اپنی ماں پر گیا ہوگا۔"

سوال :- "خدائی فوجدار سے کیا مراد ہے؟"

جواب :- "جو خدا کی فوج میں ملازم ہو مگر تنخواہ مخلوق سے وصول کرتا ہو۔"

سوال :- "کیا ایک حسین عورت ایک بدصورت مرد سے بھی محبت کر سکتی ہے؟"

جواب :- "آپ کر کے دیکھ لیجیے۔"

سوال :- "اچھے پڑوسی کی کیا پہچان ہے؟"

جواب :- "جو آپ سے ڈر کر خاموش رہتا ہو۔"

سوال :- "میں نے بہت سے ایسے آدمی دیکھے ہیں جو سنتے زیادہ ہیں مگر بولتے کم ہیں۔ ایسے آدمیوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب :- "ایسے آدمی یا تو بہت زیادہ جاہل ہوتے ہیں یا بہت زیادہ عقلمند دونوں سے بچنا چاہیے۔"

سوال :- "مجھے تاریکی میں بڑا سکون ملتا ہے لیکن روشنی سے بے حد گھبراتا ہوں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کے ڈیڈی سے کیا بات کروں؟"

جواب۔" جہیز کی!"

سوال۔" جو مسجد میں بیٹھ کر شراب پیتے ہیں وہ کون ہوتے ہیں؟"

جواب۔" ایکسائز انسپکٹر!"

سوال۔" میرا دادا جواری تھا۔ باپ جیب کترا تھا۔ میں سمگلنگ کا کام کرتا ہوں۔
میرا بیٹا کیا بنے گا؟"

جواب۔" لیڈر!"

سوال۔" عورت ناقابلِ فہم کیوں ہے؟"

جواب۔" کیوں کہ وہ بھی خالق ہے ۔۔۔ خدا کی طرح"

سوال۔" آئیڈیل شادی شدہ جوڑہ کیسا ہوتا ہے؟"

جواب۔" ہوتا ہی نہیں"

سوال۔" دانۂ گندم کھانے میں قصور کس کا تھا؟ آدم کا یا حوا کا؟"

جواب۔" میرے خیال میں یہ دانۂ گندم کا قصور تھا۔"

سوال۔" کئی عورتیں عمر بھر شادی کیوں نہیں کرتیں؟"

جواب۔" وہ غرورِ حسن میں کنواری رہ جاتی ہیں۔"

سوال۔" عورت کو پاؤں کی جوتی کیوں کہا جاتا ہے؟"

جواب۔" کیوں کہ خاوند اسی جوتی سے اپنے سر کی مرمت کرتا ہے۔"

سوال۔" عورت کس وقت سب سے زیادہ حسین معلوم ہوتی ہے؟"

جواب۔" جب وہ بچے کی ماں بن جاتی ہے۔"

سوال۔" میاں بیوی کی ازدواجی زندگی کیوں کر خوش گوار ہو سکتی ہے؟"

جواب۔" اندھے بن کر۔ تاکہ دونوں ایک دوسرے کے عیبوں کو نہ دیکھ سکیں۔"

سوال۔" میں اپنی محبوبہ کو اس کی شادی پر ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں بتایئے کون سا
تحفہ دوں؟"

سوال :- "ہندوستانی سوشلزم سے سب سے بڑا خطرہ کس کو ہے؟"
جواب :- "سوشلزم کو!"
سوال :- "چاند میں جو بڑھیا بیٹھی چرخہ کاتا کرتی تھی۔ وہ کہاں گئی؟"
جواب :- "ٹیکسٹائل مل میں نوکر ہو گئی!"
سوال :- "عاشق کو کس وقت بھیانک پسینے آنے لگتے ہیں۔؟"
جواب :- "جب محبوبہ 'تنگ آکر بیاہ' کا مطالعہ کر بیٹھے۔"
سوال :- "میں کسی امیر و کبیر حسینہ کی رفاقت میں گھومنا چاہتا ہوں۔ کوئی مجرب نسخہ بتلایئے۔"
جواب :- "اس کی کار کے ڈرائیور بن جایئے۔"
سوال :- "شادی اگر عشق کی قبر ہے تو بچے....؟"
جواب :- "قبر کے مجاور!"
سوال :- "اگر انسان تنہا ہو تو کیسا لگتا ہے؟"
جواب :- "خدا۔ کیونکہ وہ بھی لاشریک ہے۔"
سوال :- "میرے والد صاحب میری ماں کے ساتھ جب بھی جھگڑا کرتے ہیں تو اُسے
طعنہ دیتے ہیں کہ تم تو پچھلے جنم میں بھینس تھیں۔
میرے والد صاحب کو کس طرح معلوم ہوا؟"
جواب :- "وہ گذشتہ جنم میں ڈیری کا مالک ہوگا اور بھینس کے دودھ میں پانی
ملاتا ہوگا۔"
سوال :- "آپ نے ایک بار لکھا تھا حسین لڑکیاں بے وقوف ہوتی ہیں۔ لیکن میں
حسین بھی ہوں اور بے وقوف بھی نہیں۔"
جواب :- "ہر حسین لڑکی بے وقوف تو ہوتی ہے۔ لیکن ہر بے وقوف لڑکی حسین نہیں ہوتی۔"
سوال :- "سالی آدھی گھر والی ہوتی ہے تو سالا....؟"
جواب :- "پورا چپڑاسی!"
سوال :- "میری محبوبہ اکثر مجھ سے کہتی ہے، میرے ڈیڈی سے بات کرو آخر

جواب ـــ "اُس عشق کا آغاز ہی نہیں ہوتا جس کا انجام ہو جائے۔"
سوال ـــ "میرے عشق کا سورج غروب ہو گیا ہے یعنی میری محبوبہ کی شادی ہو گئی ہے لیکن وہ ابھی تک میرے خوابوں میں کیوں آجاتی ہے؟!"
جواب ـــ "سورج ڈوبنے کے بعد کچھ دیر تک اس کی کرنیں کانپتی رہتی ہیں۔"
سوال ـــ "نوبرج کے بعد کونسی منزل ہوتی ہے؟"
جواب ـــ "آلو گوبھی کی۔"
سوال ـــ "جب لیڈر سٹیج پر تقریر کر رہا ہوتا ہے تو کیا سوچتا ہے؟"
جواب ـــ "لیڈر سوچے بغیر تقریر کرتا ہے۔"
سوال ـــ "شنید میں آیا ہے کہ جب فلم ایکٹرسوں کے ہاں بچّہ تولّد ہوتا ہے تو وہ اُسے اپنا دودھ نہیں پلاتیں! اس کی وجہ کیا ہوگی؟"
جواب ـــ "وہ دلیل دیتی ہیں کہ ہم مائیں ہیں، ملک بُوتھ نہیں ہیں!"
سوال ـــ "بے وقوف دوست کون ہوتا ہے اور دانا دُشمن کون؟"
جواب ـــ "پتی ورتا استری اور جنتا کا لیڈر!"
سوال ـــ "آج کل کے لوگ گلیسرین کے آنسو کیوں بہاتے ہیں۔ اصلی آنسو کیوں نہیں بہاتے۔؟"
جواب ـــ "گلیسرین کے آنسو سستے پڑتے ہیں۔"
سوال ـــ "خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے ـــ کیسے؟"
جواب ـــ "جیسے جیب کترے کو دیکھ کر پولیس والا رنگ پکڑتا ہے۔"!
سوال ـــ "وہ کون سے معززین ہیں جو ہندوستان اور پاکستان کو ایک نگاہ سے دیکھتے ہیں؟"
جواب ـــ "سمگلر"!
سوال ـــ "راجہ اندر کے دربار میں جو اپسرائیں رقص کرتی تھیں، وہ آج کل میرے ڈانسر بن گئی ہیں تو راجہ اندر کہاں گیا؟"
اب ـــ "بلیک میں کیبرے ڈانسر کی ٹکٹیں بیچتا ہے۔"

سوال — "اپنے حسن کا بھیکرایے گریبی نے کئی مکانوں کے کواڑ کھٹکھٹائے لیکن کسی نے مجھے بھیک نہیں دی؟"

جواب — "آپ نے خالی مکانوں کے در کھٹ کھٹائے ہوں گے۔"

سوال — "گائے کی خدمت کرنا بہتر ہے یا انسان کی؟"

جواب — "گائے کی۔ کیونکہ انسان کی خدمت کریں گے تو وہ آپ کی گائے بھی چرا لے گا۔"

سوال — "کیا یہ سچ ہے کہ محبوبہ کی آواز کانوں میں رس گھول دیتی ہے؟"

جواب — "یہ کانوں کی کوالٹی کے اوپر منحصر ہے۔"

سوال — "انسان دوسروں کی نظر میں گرنا کیوں پسند نہیں کرتا؟"

جواب — "کیونکہ اپنی ہی نظر میں گرنا کافی ہوتا ہے۔"

سوال — "بہادر شاہ ظفر نے یہ شعر کیوں لکھا تھا ؎

ہے کتنا بدنصیب ظفر دفن کے لیے

دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

جواب — "اُن دنوں دہلی میں زمین بہت مہنگی ہو گی اور بہادر شاہ ظفر کی اقتصادی پوزیشن بڑی نازک تھی۔"

سوال — "ہم کہتے ہیں پالیٹکس بہت غلیظ گیم ہوتی ہے تو پھر اچھے آدمی اِس میں کیوں پھنستے ہیں؟"

جواب — "آپ سے کس نے کہا کہ وہ اچھے آدمی ہوتے ہیں۔"

سوال — "پھول کب پتھر بن جاتے ہیں؟"

جواب — "جب کوئی خوبصورت لڑکی لیڈی پولیس میں بھرتی ہو جاتی ہے۔"

سوال — "میں کسی بھینس کے آگے بین بجانا چاہتا ہوں، کسی معقول بھینس کا پتہ بتایئے۔"

جواب — "فکر تونسوی، سرینٹ گل مہر پارک دہلی۔"

سوال — "عشق کا آغاز کیا ہوتا ہے اور انجام کیا۔؟"

سوال — "سوشلزم کے نعرے کی کتنی اہمیت ہے؟"

جواب — "امیروں کی ڈائننگ ٹیبل کے ایک لقمے کی!"

سوال — "وہ لوگ کہاں گئے، جو کہا کرتے تھے ملک میں انقلاب لائیں گے۔"

جواب — وہ مندرجہ ذیل مقامات پر مل جائیں گے:۔

(۱) پبلک پارک میں گلی سڑی مونگ پھلیاں کھاتے ہوئے۔

(۲) راج محلوں میں پستے کھا کر مونگ پھلیوں پر آنسو بہاتے ہوئے۔"

سوال — "عاشقوں اور بوڑھوں کو نیند کیوں نہیں آتی؟"

جواب — "عاشقوں کو محبوبہ اور بوڑھوں کو موت کے انتظار میں۔ دونوں نہ جانے کب ٹپک پڑیں۔"

سوال — "وہ کونسی آنکھ ہے جو روتی نہیں مگر آنسو بہاتی ہے؟"

جواب — "لیڈر کی آنکھ!"

سوال — "اس دنیا سے ناطہ کب توڑنا چاہیے؟"

جواب — جب دنیا آپ سے ناطہ توڑ لے۔"

میری آغوش میں گر گئیں، میرے کندھے پر سر رکھ کر رو دیں، میرے ہونٹوں تک آپہنچیں (کبھی کبھی میری جیب تک بھی جا پہنچیں) میں نے تمہاری پلکوں پر اپنے کپکپاتے ہوئے آنسو دیکھے اور انھیں اپنے ریشمی رومال سے پونچھ ڈالا۔ تم نے اپنی ریشمی مخروطی، نازک انگلیوں سے میرا سگریٹ سلگایا اور پھر دھوئیں کے نیلے نیلے مرغولوں کے ہلکے ہلکے، تیرتے ہوئے بادلوں میں ہم دونوں گم ہو گئے۔ ایک دوسرے سے اوجھل ہو گئے۔ اور پھر یہ گم شدگی کا عالم اکثر و بیشتر صدیوں تک پھیل گیا۔ اور میں نے اکثر افسوس ظاہر کیا کہ محبت کے لیے صدیاں بھی کتنی کم ہوتی ہیں کاش محبت کے لیے وقت کی کوئی قید نہ ہوتی، گھڑیاں اور ٹائم پیس نہ ہوتے، کیلنڈر اور جنتریاں نہ ہوتیں۔

لیکن اے میری صدیوں پرانی محبوبہ! کل رات ایک افسوس ناک گھٹنا ہوگئی کہ جب مجھے سگریٹ نوشی کی زیادتی سے نیند نہیں آ رہی تھی اور میرا سر گھوم رہا تھا تو میں نے تمہیں سر دبانے کے لیے بلایا۔ اور جب تم میری آرزوؤں کے ساز پہ تھرکتی، اٹھلاتی ہوئی آئیں تو تمہارے ساتھ پانچ چھ حسینائیں اور بھی تھیں۔ اور یہ دیکھ کر میں بوکھلا گیا کہ تمہاری ہرنی ایسی آنکھیں تمہارے چہرے پر نہیں تھیں بلکہ ایک اور حسینہ کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ تمہارے ہونٹوں کے گلاب دوسری حسینہ کے پاس تھے۔ تمہاری مخروطی انگلیاں تیسری کے پاس اور زلفیں چوتھی کے سر پہ سوار تھیں۔ غرض تمہارا عضو عضو بٹ چکا تھا، بے ٹھکانہ ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا بھر کی حسیناؤں نے مل جل کر تمہارے حسن کو لوٹ لیا ہے

ڈارلنگ! یہ بات مجھے بہت بری لگی کہ تم اپنا حسن (جو میں نے تمہیں عطا کیا تھا) یوں الم غلم لڑکیوں میں لٹاتی پھرو۔ اور پھر تمہارے سامنے سب نے میرا مضحکہ اڑایا۔ غضب یہ کہ اس تذلیل میں تم بھی شامل تھیں۔

پیاری! اگر تم واقعی مجھے چاہتی ہو تو آئندہ ایسی حرکتوں سے گریز کرو۔ یاد رکھو

تمہارا عاشق

(نام لکھنے سے فائدہ)

کا زخم ہو چکا اور اب صرف تمہارا فاتحہ باقی ہے۔ اس لیے آؤ، اب تو اپنا وعدہ پورا کر ڈالو، زیادہ نہ تڑپاؤ، گلے لگ جاؤ۔ تمہارے بغیر ساٹھ سال گزار دیئے مگر اب یہ باقی کے دو چار سال گزارنا انتہائی مشکل ہو رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم بھی اب بور ہو چکی ہو اور اپنا بوڑھا دل کسی نہ کسی کو دے دینا چاہتی ہو۔ مگر

میں ہر ڈاک سے تمہارے لویٹر کا انتظار کروں گا بلکہ میں تو کہتا ہوں پیاری بڑھیا! لویٹر کا تکلف بھی کیوں کرتی ہو؟

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

تمہارا قدیم ترین عاشق
بدری ناتھ، ریٹائرڈ ایڈوکیٹ

ان بیجھی محبوبہ کے نام ——

شیلا، نیلا، کملا، زہرہ، طاہرہ، (جو بھی تمہارا نام ہو)

یہ عجیب ٹریجڈی ہے کہ میں تمہیں نہیں جانتا (اور ظالم! تم مجھے نہیں جانتیں) نہ تمہارا نام، نہ تمہارے والد صاحب کا نام، نہ تمہارا پوسٹل ایڈریس، نہ گلی اور مکان کا میونسپل نمبر۔ اور اس ٹریجڈی کے بعد کا میڈی یہ ہے کہ میں نے تمہیں کبھی دیکھا بھی نہیں۔

لیکن جانِ من! اس کے باوجود میں تم سے محبت کرتا ہوں، کیوں کہ میری تھیوری یہ ہے کہ محبت کسی رسمی تعارف کی محتاج نہیں، پوسٹل ایڈریس اور میونسپل نمبر سے بہتر چیز ہے۔ اور اسی بلندی ہی کا نتیجہ ہے کہ میں نے گھنٹوں تمہارے ساتھ بیٹھ کر محبت بھری باتیں کی ہیں، مگر کبھی ہم دونوں نے ایک دوسرے کا نام اور پتہ نہیں پوچھا —— میں نے تمہیں جب بلایا، جس نام سے بلایا، تم آگئیں۔

بڑھ گیا کہ مہابھارت کا منظر سامنے آگیا۔ مہابھارت کی جنگ بھی تو صرف پانچ گاؤں کے سوال پر لڑی گئی تھی اور ہمارے محلّے کی جنگ بھی پانچ پیسے کی اینٹ پر لڑی گئی۔ میں پوچھتا ہوں اری اینٹ ری اینٹ! تم نے یہ کیا کر دیا۔ کیا تم اس لیے پیدا کی گئی تھیں کہ انسانوں کو بھڑا کر لہولہان کروا دو۔ تم تو سایہ دار مکان بنانے کے لیے پیدا کی گئی تھیں۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تمہارے اندر مکان مسمار کرنے کی خاصیت بھی موجود ہے۔

لہٰذا کل تمہاری وجہ سے ہمارے محلّے بھر میں جو دنگا ہوا اس کے لیے تمہیں شرم سے ڈوب مرنا چاہیے — جے ہند!!

کنوارا بوڑھا بنام کنواری بوڑھی

میری شامِ حیات!

اس سے پہلے کہ قبر کے دروازے ہم دونوں پر کھل جائیں، آؤ ہم ایک دوسرے پر کھل جائیں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ آج سے چالیس برس پہلے میں نے تمہیں ایک لو لیٹر لکھا تھا، جسے پڑھ کر تم نے کہا تھا "مسٹر بدری ناتھ! یہ بچپن ہے۔ انسان صرف عشق اور شادی کے لیے پیدا نہیں ہوا، بلکہ ایک بہت بڑا کاز لے کر آیا ہے" چنانچہ میرا دل ٹوٹ گیا اور میں نے طے کر لیا کہ اگر عشق کروں گا تو صرف تم سے، ورنہ عمر بھر محرومِ عشق یعنی کنوارا رہوں گا۔

چنانچہ اے میری پیاری! میں نے چالیس برس تک تمہارا انتظار کیا۔ اگر چالیس برس تک میں ہمالیہ پربت پر جا کر تپسیا کرتا تو اب تک خدا کو پالیتا۔ لیکن آہ نہ میں خدا کو پاسکا نہ تمہیں۔ میں نے پرسوں تمہیں بازار میں جاتے ہوئے دیکھا۔ تمہاری کمر خمیدہ تھی، ارمانوں کی لاش تمہارے کندھے پر سوار تھی۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک تھی۔ سنی برس کے بوجھ سے تمہارے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں پوچھتا ہوں ظالم! کیا یہی تمہارا کاز تھا؟ یہی خمیدگی، یہی لاشیں، یہی عینک اور یہی کپکپی؟ اگر واقعی یہی کاز تھا تو جانِ تمنّا! اب اس کی تکمیل ہو چکی

سرغنہ سمجھ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔

غرض اے جانِ تمنا! میں نے تیرا جلوہ دیکھنے کے لیے کیا کیا مصائب برداشت نہ کیے۔ لیکن تمہارا دل نہ پسیجا۔ عجیب بات ہے کہ تمہارے وصال کے لیے ہمیں چور بننا پڑتا ہے، ڈاکو اور سمگلر کہلانا پڑتا ہے، وحشی کتے ہم عاشقوں کا راستہ روک لیتے ہیں۔ تم جہاں بھی بستی ہو کسی نہ کسی پردے میں یا قید میں یا تالے کے اندر۔ آخر تم نے کون سا جرم کیا ہے کہ تمہیں ہر آدمی اندھیری، تاریک قیدوں میں رکھتا ہے۔ آخر تم ایک دھات کا ٹکڑا ہی تو ہو۔ تمہارے اِس دھات کے چمکیلے حسن کی خاطر پورے انسانی سماج نے اپنا حلیہ بگاڑ لیا ہے۔ تمہاری خاطر دنگے، قتل، ڈکیتی یہاں تک کہ تہذیبیں ایک دوسرے کو فنا کر دیتی ہیں، آخر کیا وجہ ہے؟ کیا وجہ ہے؟ کیا وجہ ہے؟

اینٹ کے نام ــــ۔

اینٹ ری اینٹ!

کل تمہاری وجہ سے ہمارے محلّے میں جو دنگا ہوا اُس کے لیے تمہیں شرم سے ڈوب مرنا چاہیے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہماری پڑوسن (نام تو تمہیں بھی معلوم ہو گیا ہوگا) تمہیں سامنے کے پبلک پارک سے اٹھا کر (بلکہ چرا کر) لے آئی تھی۔ جہاں تم دوسری سینکڑوں اینٹوں کے ساتھ کسی کی دیوار چننے کی خاطر پڑی ہوئی تھیں۔ تم صرف پانچ پیسے کی اینٹ تھیں لیکن غضب یہ ہوا کہ اسکول ماسٹر رام سہائے کی لڑکی نے اُسے اینٹ چراتے دیکھ لیا اور محلے بھر میں شور و غل مچا دیا۔ بس پڑوسن بچاری بدنام ہو گئی اور اس نے غصّے میں آکر تمہیں اسکول ماسٹر کی بیوی کے سر پہ دے مارا۔ اسکول ماسٹر نے پھر تمہیں اٹھا کر پڑوسن کا سر پھاڑ ڈالا اور یوں دنگا فساد

جواب : جب امیری اور غریبی دونوں ترقی کر رہی ہوں ۔
سوال : کال بیل اور کال گرل میں کیا فرق ہوتا ہے ؟
جواب : کال بیل بجائی جاتی ہے ۔ کال گرل خود بخود بج اٹھتی ہے ۔
سوال : کچہری کے وکیل اور کوٹھے کی طوائف میں کونسی چیز مشترک ہے ؟
جواب : گاہک ۔
سوال : اگر جنتا اپنے لیڈر کو بے ایمان کہہ دے ۔ تو لیڈر کیا جواب دے گا ؟
جواب : یہی کہ میں اس پر غور کروں گا ۔
سوال : انسان گری ہوئی چیز کو اٹھا لیتے ہیں ۔ مگر گرتے ہوئے انسان کو کیوں نہیں اٹھاتے ؟
جواب : کوڑا کرکٹ کو اٹھانا اچھا نہیں سمجھا جاتا ۔
سوال : ناستک کس کی پوجا کرتا ہے ؟
جواب : اپنی
سوال : کئی لوگ اپنی قبر آپ کیوں کھودتے ہیں ،
جواب : کھدائی کے پیسے بچانے کے لئے ۔
سوال : اگر کسی لیڈر میں قوم کا درد اچانک روپے پیسے کے درد میں بدل جائے تو آپ اسے کیا کہیں گے ؟
جواب : دردناک
سوال : رام راج اور جنتا راج میں کیا فرق ہے ؟
جواب : رام راج میں دیا اور تیل مل جاتا ہے ۔ مگر جنتا راج میں صرف دیا ملتا ہے ۔ تیل نہیں ۔
سوال : جب عاشق اور محبوبہ ایک دوسرے کی بات نہ مانیں تو کیا ہوتا ہے ؟

جواب: پیچ ڈھیلا ہو جاتا ہے۔

سوال: پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ کچھ سورن سنہاروں نے چیڑ ہری جن عورتوں کی ہتیا کر ڈالی۔ آپ اسے کیا کہیں گے؟

جواب: گئو ہتیا۔

سوال: لوگوں نے پیسے کو بھگوان بنا لیا ہے۔ تو اصلی بھگوان کو کیا کہا جائے؟

جواب: کھوٹا سکہ۔

سوال: میں باوجود خواہش کے زندگی کی اونچی منزل پر نہیں پہنچا۔ کارن؟

جواب: لفٹ خراب ہو گی۔

سوال: انسان اور بھگوان میں کیا رشتہ ہے؟

جواب: دونوں ایک دوسرے کی تخلیق ہیں۔

سوال: اس ہیروئن کا نام بتائیے جس نے ہمیشہ ایک ہیرو کے ساتھ رول کیا ہو؟

جواب: آپ کی بیوی۔

دل کی ڈائریاں

ایک جیب کترے کی ڈائری

پہلی اپریل۔

آج اپریل فول تھا۔ اس لئے میں نے اپنی آتما سے کہا۔ "اے ملنگ دل کی آتما! آج لوگ دوسروں کو فول بنائیں گے۔ میں تمھیں بناؤں گا!" اور میں نے کبھگو ے کپڑے پہنے۔ ماتھے پر ماتھے سے بھی لمبا۔ سیندوری تلک لگایا اور شہر کے اس مشہور مندر میں چلا گیا، جس کے پجاری کی جیب پچھلے مہینے کاٹی تھی۔ مجھے اس پجاری پر غصّہ بھی بہت آیا تھا۔ کیونکہ اس کی جیب میں سے کئی کھوٹے سکے نکلے تھے۔ نہ جانے لوگ پوجا کے لئے کھوٹے سکے کیوں چڑھاتے ہیں۔

جب میں مندر میں پہنچا تو عقیدت مندوں کی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ بے اختیار جی چاہا جیب کاٹنے کا نادر موقع ہے۔ لیکن آتما نے مجھے فحش گالی دی کہ تم مرد ہو یا سیاسی لیڈر؟ وعدہ کر کے ایفا نہیں کرتے۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گیا۔ اگرچہ مجھے آتما پر سخت طیش آیا کہ یہ کیسی ڈھیٹ ہے۔ ہر وقت انسان سے چمٹی رہتی ہے۔

شردھالوؤں کی بھیڑ کو چیر کر میں بھگوان کی مورتی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اندھی عقیدت کے ساتھ آنکھیں بند کرلیں (اگرچہ کبھی کبھی ایک آنکھ تھوڑی سی کھول کر چڑھاوے کے دھن کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا) اور پھر بھگوان کی مورتی کے سامنے حلف لیا کہ اگر میں آئندہ کسی کی جیب کاٹوں تو تم مجھے کانا یا بہرا دونوں بنا دینا! یہ حلف میں نے دل ہی دل میں لیا۔ کیونکہ بلند آواز میں لیتا تو ارد گرد کھڑے ہوئے لوگ سن لیتے۔ انسان کو ایمان دار بنتے ہوئے بھی لوگوں سے شرم آتی ہے۔

حلف لینے کے بعد جیب میں چڑھاوے کے لئے جیب سے پیسے نکالنے لگا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری جیب کٹ چکی تھی!

اس کے بعد سارا دن اداس رہا۔ میں آتما کو فول بنانے نکلا تھا۔ لیکن آتما نے مجھے فول بنا دیا! میں نے آتما سے پوچھا: "یہ تم نے کیا حرکت کی؟ میں تو صرف تم سے اپریل فول کر رہا تھا۔ صدق دل سے جیب کتری سے توبہ تھوڑے کر رہا تھا لیکن تم سو گئیں اور کوئی میری جیب ہی کاٹ کر لے گیا۔

"آتما نے جواب دیا قہہ قہہ قہہ!!"

میں نے کہا "شیم! شیم شیم!!"

تین اپریل۔

مندر میں جس آدمی نے میری جیب کاٹی تھی آج اس کا پتہ چل گیا ہے۔ جیب کتروں کے گرو دلے جسے ہم سب "جگی دادا" کہتے ہیں، مجھ سے ذکر کیا کہ آج کل مندروں میں ٹٹ پونجیے شردھالو جانے لگے ہیں۔ پرسوں ہمارے گروہ کے ایک جیب کترے شمبھو نے ایک بھگوے کپڑوں والے بھگت کی جیب کاٹی تو اس میں سے صرف سوا روپیہ اور ایک ادھ جلی بیڑی نکلی! — یہ کہہ کر جگی دادا قہقہہ مار کر ہنسا میرا ماتھا ٹھنکا کہ یہ سوا روپیہ اور ادھ جلی بیڑی تو میری جیب میں تھی۔ جی میں آئی کہ دادا کے

سامنے اعتراف کر لوں کہ وہ مجھو ذاتِ شریف ہی کی جیب تھی لیکن پھر یہ سوچ کر لرزا اٹھا کہ دادا اپنے چابک سے میری چمڑی ادھیڑ دے گا۔ —— اپنے گروہ میں ہی خارج کر دے گا یہ فن جیب کتری کی توہین ہے کہ جیب کترے کی ہی جیب کٹ جائے۔ دادا مجھے ان کو الیغائیڈ کر دے گا۔ اس لئے اپنی ندامت کا زہر چپ چاپ پی گیا۔

البتہ مجھے شمبھو سالے پر بہت غصہ آیا کہ اس نے مجھے پہچانا کیوں نہیں حالانکہ ہم نے کئی بار اکٹھے مل کر جیبیں صاف کی تھیں۔ دل میں فیصلہ کر لیا کہ کسی دن شمبھو کسی کی جیب کاٹے گا، تو میں ہاتھ کی صفائی دکھا کر اس کی جیب کاٹ لوں گا۔

آج شام کو ایک بس سٹاپ پر اپنا "کاروبار" کرنے کے لئے گیا تھا۔ ایک نوجوان کالجیٹ کا بٹوا اڑا لیا گیا، مگر اس بٹوے میں صرف ایک حسین لڑکی کا فوٹو نکلا، شاید اس کی کالجیٹ محبوبہ ہو گی۔ فوٹو کی اپشت پر لڑکی کا ایڈریس لکھا ہوا تھا میں نے اس ڈریس پر فوٹو واپس ڈاک سے بھیج دیا اور اس کے نیچے کالجیٹ نوجوان کی طرف سے لکھ دیا۔ "شکریہ کے ساتھ واپس!"

۱۴/اپریل ——————

کئی دنوں سے کاروبار مدھم ہے۔ میں جیب میں کبھی ہاتھ ڈالتا ہوں، شرمناک سی رقم ہاتھ لگتی ہے۔ نہ جانے لوگوں کی آمدنی کم ہو گئی ہے یا مہنگائی بڑھ گئی ہے کہ لوگوں کی جیب میں پیسے ٹکتے ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے ہم سے بھی بڑے جیب کترے یعنی بلیک کیٹ میدان میں سرگرم ہو گئے ہیں۔ آخر گورنمنٹ ان بلیک مارکیٹیوں کے خلاف ایکشن کیوں نہیں لیتی۔ ان کی وجہ سے ہمارے ایسے خاندانی جیب کتروں کا بزنس تباہ ہو رہا ہے۔

مجھ پر قرض چڑھ گیا ہے۔ آمدنی نہ ہو تو قرض چڑھنا لازمی ہے۔ کاش! کوئی مرفی اسامی ہاتھ لگے۔ جائے تو سارا دلدر دور ہو جائے۔ جگی دادا نے کئی بار پیغام بھیجا بلکہ دھمکی بھی دی کہ ہمارا بھتہ ادا کر جاؤ۔ نہیں تو پولیس کے ہاتھوں گرفتار کرا دوں گا! ادھر علاقہ مدن پورہ کا چھوٹا تھانیدار بہت پریشان کر رہا ہے کہ ہمارا بھتہ ابھی تک کیوں نہیں پہنچا؟ جگی دادا اور چھوٹا تھانیدار دونوں ایک دوسرے کے ہمراز ہیں اور بھوتوں کی طرح ان کی روحیں میرے اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں کہ سالے ڈکیٹر بنے پھرتے ہیں۔ ہمارے ایسے عوام کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے مفت خورے کہیں کے!

آج میں نے ایک راہ چلتے جیوتشی کو روک کر اپنے ہاتھ کی لکیریں دکھائی۔ مہاراج! ذرا ان لکیروں پر نظر جاؤ اور دیکھو کہ مجھ بدبخت کے نصیب میں کوئی دولت لکھی ہے یا نہیں؟ جیوتشی نے مجھ سے اکیاون پیسے لے کر بتایا کہ میری پچاس ہزار روپے کی لاٹری نکلنے والی ہے! میں نے اٹھتے اٹھتے جیوتشی کی جیب پر اپنی قسمت آزمائی تو اس میں سے صرف پچاس پیسے نکلے! یہ گویا میری پچاس ہزار روپے کی لاٹری تھی! بہت تیز رے جاہل جیوتشی کی ایسی تیسی! ان کا ایک ہزار روپے ایک پیسے کے برابر ہوتا ہے۔ بدبختوں کو میتھمٹیکس کبھی نہیں آتا۔

۱۷ / اپریل۔ ——————

سنیچر جو کئی ہفتوں سے میری تقدیر کے خانے میں کھیکڑا مارے بیٹھا تھا اچانک بھاگ گیا ہے۔ اس کے فرار سے میرے اندر بہار آگئی۔ آج کا دن میری زندگی کا خوبصورت ترین دن تھا۔

آج ایک اعلیٰ ترین ہوٹل کے سامنے کھڑا تھا کہ اچانک تیزی سے ایک ٹیکسی آکر رکی اور اس میں سے ایک خوش پوش ادھیڑ آدمی اور غضب کی نوجوان حسینہ باہر

نکلی۔ راکٹ کی سی تیزی کے ساتھ میرے دونوں ہاتھ حرکت میں آئے اور دوسرے لمحہ میرے ہاتھ میں دو بٹوے آ چکے تھے۔ دونوں کی مجموعی رقم ایک ہزار دو سو سولہ روپے تھی اور تیسرے منٹ میں نے دیکھا نوجوان حسینہ اور خوش پوش آدمی دونوں خوبصورت ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ ادھیڑ آدمی نوجوان حسینہ کا نازک گورا گورا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ دونوں قہقہے لگا رہے تھے۔ دونوں محبت کے نشے میں چور تھے۔ محبت انسانوں کے ہوش وحواس گم کر دیتی ہے۔ اور ہم جیب کتروں کے لئے نعمت غیر مترقبہ بن کر سامنے آتی ہے۔

وہ اس وقت تو قہقہے لگا رہے تھے، جب ہوٹل کا بیرا ان کے سامنے بل پیش کرے گا تو دونوں زار و قطار روئیں گے۔ سچ ہے محبت صرف ہنساتی نہیں ہے، رلاتی بھی ہے — مجھے ان دونوں پر رحم بھی آیا کہ وہ ہوٹل کے منیجر کے سامنے کتنے شرمندہ ہوں گے۔ سارا عشق کافور ہو جائے گا۔ جی چاہا ان کی درد شا دیکھنے کے لئے ہوٹل کے باہر کھڑا رہوں اور ممکن ہو کسی بہانے ان کی جیب میں دس روپے کا ایک نوٹ ڈال دوں تاکہ بے چارے ٹیکسی پر واپس جا سکیں۔ نوجوان حسینہ اگر پیدل چلے گی تو اس کے نرم و نازک تلووں میں چھالے پڑ جائیں گے۔

لیکن جیب تراشی کے عظیم اصولوں کے مطابق اس جگہ رکنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لئے میں ایک ٹیکسی پر چلا گیا۔ قرض اتار دیا۔ جگی دادا اور چھوٹے تھانیدار کا بھتہ بھی ادا کر دیا۔ بیوی کے لئے ایک ساڑی اور اپنے لئے خشک گوشت اور وہسکی خریدی اور اس وقت وہسکی کا پیگ سامنے رکھے آہستہ آہستہ نوش کر رہا ہوں اور ڈائری بھی لکھ رہا ہوں۔ کاش! مجھے اس ادھیڑ عاشق کا ایڈریس مل جاتا تو اسے شکریے کا ایک خط لکھ دیتا۔

۲۰ر اپریل —

آج تین دن بعد گھر سے باہر نکلا تھا۔ ان دونوں ہڈوں کا نشہ ابھی اترا نہیں، لیکن اتار کا احساس ضرور شروع ہو گیا ہے۔ اس خدشے سے مارکیٹ میں پھر آگیا کہ کہیں جیب تراشی کی پریکٹس نہ بھول جائے۔ آج تو ایک چھرا بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ کیونکہ اخباروں میں پڑھا کہ آج کل حفاظت خود اختیاری کی خاطر جیب کترے حضرات چھرے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ بلکہ جب ایک کترا جیب کاٹتے پکڑا گیا تو اس نے جیب کٹوانے والے کی بجائے شور مچانے والے ایک اور آدمی کے پیٹ میں چھرا اتار دیا جب وہ بھاگنے میں کامیاب ہوا۔

ٹہلتے ٹہلتے ایک جلسہ گاہ میں پہنچا۔ ایک جگہ تو دس سال کے ایک چھوکرے کو لوگ پکڑے ہوئے تھے اور لات، مکوں اور طمانچوں سے اسے "با اخلاق" بنا رہے تھے۔ معلوم ہو کہ اس نے ایک بوڑھے کی جیب میں سے تین روپے اڑا لئے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس چھوکرے کو تڑاخ تڑاخ چانٹے رسید کئے جس سے اس کی ساری جیب کتری نکل گئی اور اس سے تین روپے لے کر بوڑھے کو واپس دے دیئے اور اعلان کر دیا کہ میں خود اس لونڈے کو تھانے میں لے جاؤں گا!

بوڑھے نے میرا شکریہ ادا کیا اور جب میں اس لونڈے کو کان سے پکڑے تھانے کی طرف لے جا رہا تھا تو اس بوڑھے کے تین روپے میری جیب میں واپس آچکے تھے۔ کیونکہ جب وہ بوڑھا میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ میں اس کی جیب دوسری بار کاٹ رہا تھا! میں نے راستے میں اس چھوکرے کو گالیاں دے کر ان تین روپوں میں سے ایک روپیہ دے دیا۔ اور اسے سمجھایا کہ بے وقوف! جیب کاٹنا ہو تو پہلے کسی استاد سے یہ ہنر سیکھ لو۔ تمہارے ایسے خام کار جیب کتروں نے

اس فنِ لطیف کو رسوا کیا ہے۔

میں نے وہ دو روپے بھکاریوں میں بانٹ دیئے۔ آخر وہ بھی انسان ہیں انھیں بھی زندہ رہنے کا حق ہے۔ اگر خود جیب نہیں کتر سکتے تو جیب کتروں ہی کی کمائی کھائیں۔

۲۵ر اپریل ــ

بدقسمتی جب ساتھ دیتی ہے جیب کترا کسی کلرک کا بٹوہ اڑا لیتا ہے۔ آج ایک کلرک کا بٹوہ اپنے سامنے رکھا اس کی بدقسمتی اور اپنی بے وقوفی پر ہنس رہا ہوں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ بٹوا نہ ہو۔ قبر کا نشان ہو۔ جس پر لکھا ہو "شمشان گھاٹ کو ــ"

درحقیقت غلطی مجھ سے ہوئی۔ میں گذشتہ تین دن سے ایک رشوت خور کلرک کا پیچھا کر رہا تھا تاکہ وہ فلسفہ مساوات کی رو سے اپنی رشوت کا روپیہ ہم جیب کتروں میں بھی ففٹی ففٹی بانٹ سکے۔ لیکن عین موقع پر وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ جس پر مجھے سخت غصہ آ گیا اور میں نے غصے میں آ کر ایک دوسرے کلرک کی جیب کاٹ لی۔ اس میں سے جو کچھ برآمد ہوا، ذرا ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ ایک ٹیلرنگ شاپ کا بل ساڑھے چھ روپے۔ یہ شاید ایک قمیص کا بل تھا جسے یہ کلرک نہ ادا کر سکا نہ قمیص لا سکا۔ حالانکہ مقررہ تاریخ کو دو ہفتے گزر چکے تھے!

۲۔ کلرک کے سالے کا ایک خط جس میں اس نے دھمکی دی تھی کہ ہم اپنے بال بچوں سمیت آپ کے گھر میں گرمی کی تعطیلات گزارنے آ رہے ہیں۔ کلرک کے گھر کو اس نے ہل اسٹیشن سمجھ لیا تھا۔

(۳) ایک چھوٹی سی ربڑ جو اس نے اپنے بچے کے لئے دفتر سے چرائی ہوگی۔

۴۔ "ور کے لئے کنیا کی ضرورت" کے اشتہار کی ایک کٹنگ۔ اس کا مطلب ہے کلرک کی بیٹی اپنی جوانی کا بوجھ لئے اس کے کندھے پر بیٹھی ہے۔

۵۔ دس پیسے کا رسیدی ٹکٹ (اسے رسیدی ٹکٹ کی کیا ضرورت پڑی ہوگی، نہ جانے کیسے اس کے ہاتھ لگ گیا) جو میرے لئے بھی بیکار نہ تھا۔

۶۔ ایک فوٹو گراف جس میں کلرک اپنے پانچ بچوں اور ایک بائیسکل کے ساتھ کھڑا تھا ۔۔۔ وہ بائیسکل اس کا چھٹا بچہ معلوم ہو رہی تھی!

۷۔ دو روپے کے ایک میلے کچیلے نوٹ کے تین ٹکڑے ۔۔۔ وہ نوٹ اس کی غیر منقولہ جائداد کے طور پر محفوظ رکھا ہوا تھا۔

اس کے علاوہ کچھ انتہائی (غیر ضروری) کاغذات تھے۔ ایک میل سے بھری کنگھی تھی لیکن سب سے زیادہ بیش قیمت چیز جو کلرک مذکور کے ہارٹ فیل ہونے کا باعث بنی ہوگی وہ تھی دو روپے بیس پیسے کی نقد رقم! جس کے بل بوتے پر کلرک اس مہینے کے آخری نازک دن گزارنا چاہتا تھا!

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ تمام چیزیں ایک رجسٹرڈ پیکٹ کے ذریعہ کلرک مذکور کو پوسٹ کر دوں گا اور دو روپے بیس پیسے کی رقم اس کی رجسٹریشن فیس پر خرچ کر دوں گا۔

اور آئندہ کے لئے میں نے حلف لے لیا ہے کہ جب بھی کسی کی جیب کاٹنے لگوں گا، اس سے پہلے پوچھ لوں گا کہ تم کلرک تو نہیں ہو؟

۲۸/اپریل

آج جیل میں بیٹھا ہوں۔ کل فٹ بال میچ کے دوران اچانک جیب کاٹتے ہوئے پکڑا گیا تھا میرا دوسرا ساتھی تو بٹوہ لے کر فرار ہو گیا۔ لیکن میں سستے چھوٹ گیا۔ البتہ داروغہ جیل جب مجھے جیل میں بند کرنے لگا تو میں نے اس کی جیب سے

کبھی دس بارہ روپے کی رقم اڑا لی!

مجھے افسوس صرف یہ ہے کہ یکم مئی آنے والی ہے۔ یہ سرکاری ملازموں کی تنخواہ کا دن ہے۔ اور تنخواہ کے دن ایک جیب کترے کا جیل میں رہنا جیب تراشی کی تاریخ کا ایک المناک حادثہ ہے۔ میں نے جیل داروغہ کو پیغام بھجوایا ہے کہ مجھے یکم مئی سے پہلے پہلے رہا کروا دے!!

ایک لیڈر کی ڈائری

نوٹ: میری یہ ذاتی ڈائری میرے انتقال کے پانچ سال بعد شائع کی جائے۔

۱۷ اکتوبر

کل میرا جنم دن تھا۔ کہتے ہیں جو لوگ اکتوبر میں پیدا ہوتے ہیں وہ راج گدی پر بیٹھتے ہیں۔ میرا رسوئیا رام دھن بھی اکتوبر میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن وہ راج کے جھوٹے برتن دھوتا ہے۔ رام دھن نے اپنا جنم دن کبھی نہ منایا۔ کیونکہ کانسٹی ٹیوشن کی رو سے ہر آزاد شہری کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنا جنم دن منائے یا نہ منائے (ہمارا کانسٹی ٹیوشن ——— آزاد خیال ہے)

میں نے اخباروں میں یہ مجاہدانہ اعلان شائع کروا دیا تھا کہ اپنا جنم دن نہایت خاموشی اور سادہ طریقے سے مناؤں گا۔ لیکن صبح صبح مبارکباد دینے والوں کا یوں تانتا بندھ گیا جیسے گڑ کی بھیلی پر مکھیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ مجھے ہاروں اور تحفوں سے لاد دیا گیا۔ ایک پریس رپورٹر نے مجھ سے پوچھا "کیا آپ اپنے پہلے بیان کی تردید کرنا پسند کریں گے؟ کہ آپ کے جنم دن میں گاندھی جی کی سی سادگی ہوگی!"

لیکن میری بجائے میرے خرانٹ سکریٹری نے جواب دیا۔ "اس کا جواب عوام سے پوچھئے۔ کیونکہ لیپارڈیا صاحب کا یہ جنم دن عوام خود منا رہے ہیں۔ عوام نے اپنے لیڈر کے ہاتھ سے باگ ڈور چھین لی ہے۔

میرا سکریٹری جھوٹ بول رہا تھا۔ کیونکہ ہار اور تحفے لانے والے عوام بالکل نہیں تھے۔ ان میں کچھ وزیر تھے، کچھ بڑے بڑے کارخانہ دار تھے، کچھ میرے ٹٹ پونجئے سیاسی لیفٹننٹ تھے۔ کچھ میری بیوی کی نقل کرتے جسموں والی سہیلیاں تھیں۔ جن کے دبیز ہونٹوں پر تھپی ہوئی لپ اسٹک کی کئی تہیں چڑھی ہوئی تھیں اور ان تہوں پر جب مبارک باد کی مصنوعی مسکراہٹ ابھرتی تھی تو مجھے گھن آجاتی تھی۔ لیکن میں اس گھن کا جواب مصنوعی مسکراہٹ سے دیتا تھا۔ میرے پاس اپنا کچھ بھی نہ تھا، جو کچھ تھا، میرے مداحوں کا دیا ہوا تحفہ تھا۔

میرے جنم دن کی خوشی میں رات کو عوام نے اپنی جوائے ہوٹل کے مالک سیٹھ ٹھینگا پرساد نے عوام یعنی سیٹھوں وزیروں، سمگلروں اور دھارمک نیتاؤں کو ایک سادہ اور خاموش ڈنر دیا۔ جس میں سلکی پردے کے پیچھے۔ وہسکی اور پردے کے باہر مونگ کی دال اور مرغ مسلم شامل تھے۔ سیٹھ ٹھینگا پرساد کے ہوٹل کی بدعنوانیوں کے خلاف جب دو سال پہلے میں نے ایک عوامی اندولن شروع کیا تھا۔ اس وقت سے وہ میرا مدّاح بن گیا تھا۔ ڈنر کے بعد میں نے سیٹھ ٹھینگا پرساد کے ساتھ فوٹو کھنچوایا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس فوٹو کی بدولت اپنے معزز گاہکوں کو بلیک میل کرے گا۔

میں اس بلیک میلر کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتا تھا۔ لیکن اندولن کے دوران اس کی منتیری بیوی میرے پاس سمجھوتے کا فارمولا لے کر آئی تھی۔ وہ

کم بخت بے حد خوبصورت تھی۔ کسی عورت کو اتنا بھی خوبصورت نہ ہونا چاہیے کہ پورے کا پورا سوشلزم اس کے سامنے سربسجدہ ہو جائے!

ڈنر کے بعد سکریٹری نے اعلان کیا کہ عوام کے محبوب نیتا شری لیلا ڈیاجی کو جو سادہ تحفے موصول ہوئے ہیں وہ جھگی جھونپڑی والوں کی بہبودی پر خرچ کئے جائیں گے۔

ایسا اعلان میرے گزشتہ جنم دن پر بھی کیا تھا۔ ہر دوسرے اعلان کا حشر پہلے اعلان کا سا ہوتا ہے۔ جھگی جھونپڑی کے کالے کلوٹے ادھ ننگے بچوں کے نصیب میں تو دو دو لڈو لکھے تھے۔ حالانکہ ان میں سے کئی بچے اکتوبر مہینے میں بھی پیدا ہوئے تھے۔

۱۳ر نومبر ——————

شاید یہی چودہ نومبر کا دن تھا۔ آج سے چودہ برس پہلے میں نے اپنے پھٹے ہوئے جوتے اور پھٹے ہوئے پاجامے کے ساتھ ایک جلسے میں اخبار "دین بندھو" کی چودہ کاپیوں کو آگ لگائی تھی۔ اور اسی رات کو اخبار "دین بندھو" کا توندیل مالک لالہ بھگتی چند اپنی چمکیلی کار پر میرے تنگ و تاریک کوارٹر میں یوں آیا تھا جیسے کرشن بھگوان سداماں کے گھر آئے ہوں! اور ایک ہزار روپے کے کرنسی نوٹ میرے میلے کچیلے تکیہ پر رکھتے ہوئے کہا تھا: "لیلا ڈیاجی! آپ سچ مچ ایک ایک آتش بیان مقرر ہیں۔ لیکن افسوس! کہ اس ابھاگے دیش میں جوہر قابل کی قدر نہیں ہے۔ آپ دین ہیں اور ہمارا اخبار "دین بندھو" ہے۔ یہ ایک ہزار روپے کی تچھ بھینٹ "دین بندھو" کی طرف سے قبول فرمائیے اور اپنے لیے نئے پاجامے سلوا لیجئے۔

"تم مجھے رشوت دے کر میرا ضمیر خریدنا چاہتے ہو؟" میں نے گرج کر

کہا تھا! ان دنوں میں کافی احمق تھا)

مگر لالہ کھگتی چند ضمیروں کا گھاگ۔ بیوپاری تھا، میری جاہل انقلابی ضمیر سر کر بلند یانگ۔ دعوے سے دل برداشتہ نہیں ہوا۔ میری پیٹھ پر مشفقانہ تھپکی دیتے ہوئے مسکرا کر بولا، نوجوان انقلابی! دیش کے کروڑوں مفلس تمہاری رہنمائی کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر دیش کا افلاس دور کرنے سے پہلے اپنا افلاس دور کرو۔ ورنہ دو چار سال بعد تمہاری یہ کبھی ک۔ اور تاریکی اور غلاظت تمہاری ہڈیاں چاٹ جائے گی۔

اس ایک ہزار روپے کو تم ملٹی پرپز وٹامنز کی گولیاں تصور کر کے قبول کر لو، یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ وٹامنز کی گولیاں میرے غلیظ سرہانے کے اندر گھٹتے ہوئے ٹی۔ بی کے جراثیم کو مارنے کے لئے پڑی رہ گئیں، میرے ایمان کی مضبوط دیوار کی پہلی اینٹ گر چکی تھی۔ غصے اور بے بسی کے ملے جلے تاثرات ساری رات بھوتوں کی طرح میرے خوابوں میں وحشیانہ رقص کرتے رہے۔ لیکن جب دوسری صبح پیدا ہوا تو اخبار "دین بندھو"، کا تازہ پرچہ میرے سامنے پڑا تھا جس میں جلی عنوان کے ساتھ یہ خبر درج تھی:۔

"عوام کے محبوب رہنما شری لپاڑیا کی گرفتاری آج متوقع ۔۔"، معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ کل جنتا کلاتھ ملز کے اندر عوام کے محبوب ترین رہنما شری لپاڑیا نے ریشمی کپڑوں کی ایک گانٹھ کو جو آگ لگائی تھی، اس سلسلے میں سرکار کی طرف سے ان کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کئے جا چکے ہیں اور آج کسی وقت بھی ان کی گرفتاری متوقع ہے۔ مل ورکروں میں ان کی گرفتاری کے بعد کتنا غیض و غضب پھیل سکتا ہے؟ اس کے متعلق سارے شہر میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ مل کے ارد گرد دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی ہے۔"

گویا لالہ بھگتی چند نے میری شہرت اور میری لیڈری کا شاندار آغاز کر دیا تھا میرا سر مارے احسان کے اخبار "دین بندھو" کے اوپر جھک گیا اور مجھے زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ اخباروں کی آزادی صرف ایک پر فریب جمہوری طلسم ہے اور یہ دنیا ضمیروں کی خرید و فروخت کی ایک بہت بڑی منڈی ہے۔ اور میں بھی منڈی کی ایک جنس ہوں۔

آج چودہ برس بعد لالہ بھگتی چند میرا لنگوٹیا دوست بن چکا ہے اور آج جب بھی ہم دونوں اس واقعہ کو یاد کرتے ہیں تو ہم خوشی کے آنسو بہاتے ہیں۔

ہاں، آج چودہ نومبر ہے اور میں اپنی ڈائری میں یہ چند الفاظ خوشی کے آنسوؤں کی طرح بہا رہا ہوں۔ اور اپنے اس پھٹے ہوئے پاجامے کو الماری سے نکال کر سوچ رہا ہوں ——— یہ پاجامہ آج بھی موجود ہے۔ ہندوستان کے افلاس کی طرح اور افلاس آج بھی ہندوستان میں زندہ ہے۔ اگر چودہ نومبر کو میں اخبار "دین بندھو" کے پرچوں کو آگ نہ لگاتا تو اس پاجامے کو ٹی۔ بی کے جراثیم چاٹ چکے ہوتے۔ چودہ نومبر زندہ باد! افلاس کے پاجامے پائندہ باد!!"

۳ر دسمبر ———

کچھ دنوں سے زندگی بہت ڈل ہو رہی تھی، نہ کوئی ہنگامہ تھا نہ شور و شر۔ سیٹھ ٹھینگا پرساد کی حسین ترین بیوی بھی پیرس کے سیر سپاٹے پر چلی گئی تھی اور مجھے داغ جدائی دے گئی تھی۔ غلطی میری اپنی تھی۔ میں نے ہی اسے ہندوستانی سنگیت کاروں کی ڈیلی گیشن میں شامل کرا دیا تھا۔

حالانکہ وہ علم موسیقی میں پرائمری پاس بھی نہ تھی۔ لیکن میرے دل کے تار کو کبھی کبھار چھیڑ دیا کرتی تھی۔ اس لئے اس کے سنگیت کار ہونے میں کوئی شک

نہ تھا۔

وہ چلی گئی اور مجھے سرکاری کاموں کے بیابان میں تنہا چھوڑ گئی۔ میں نے اپنی تنہائی اور اداسی اور جدائی کا غم دور کرنے کے لئے ایک نیا شوشہ کھڑا کر دیا شہر کے ایک ویران ٹیلے پر ایک ذلیل سا چھوٹا سا مندر بنا ہوا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس مندر میں بھگوان رہتا ہے۔ میں نے اپنے ایک جنونی ورکر کے ہاتھوں اسے گروا دیا اور بھگوان کا بھگوان منہدم ہو کر نیچے گر پڑا۔

مندر گرنے کی خبر سے بھگوان کے ہزاروں بھگت پاگل ہو گئے۔ منہ سے جھاگ بہانے لگے۔ انھوں نے جوش اور غصے میں دوسرے ہی دن مندر کی تعمیر پھر شروع کر دی۔ دوسری طرف سے خدا کے پرستاروں نے بھی خدا کی حفاظت کے لئے جھنڈے اٹھا لئے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اس مندر کے نیچے ایک پرانی مسجد دبی پڑی ہے اور کہ ہم اس مسجد میں دبے ہوئے خدا کو باہر نکالیں گے۔ دونوں طرف سے حقوق کی جنگ شروع ہو گئی۔ صبح کو مندر کی دیوار کھڑی ہو جاتی، دوپہر تک مسجد کی دیوار اور شام تک پھر مندر ابھرنے لگتا۔ بھگوان اور خدا آپس میں گتھم گتھا ہونے لگے۔ میری اداس اور ڈل زندگی میں ایک ہنگامہ، ایک رونق پیدا ہو گئی۔ میری پیرس میں گئی ہوئی حسین محبوبہ کا عارضی نعم البدل مجھے مل گیا۔

جب صورت حالات نازک ہونے لگی۔ تو میں نے تین ہنگامی اقدامات کئے۔ (۱) فریقین کے نام صلح اور آشتی کی دردناک اپیل جاری کر دی (۲) دونوں طرف کے ورکروں کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ (۳) پیرس میں اپنی حسین محبوبہ کو ٹیلی گرام بھیج دیا: "ڈارلنگ! سارا شہر فساد کی لپیٹ میں آگیا ہے۔ دن بھر بھاگ دوڑ کرتا ہوں۔ تم لوٹ آؤ تو اس تھکا دینے والے ہنگامے میں سکون اور سرور کے چند لمحے میسر آجائیں۔

میری امن کی اپیل اور ٹیلی گرام دونوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ تناؤ اپنے عروج پر ہے۔ اخدا اور کھگوان دونوں خاموش تماشائی ہیں۔ لاٹھیاں اور گولیاں چلائی جا چکی ہیں۔ کل سے سارا شہر ہڑتال پر ہے۔ آج دن بھر میں نے ہڑتال زدہ شہر کا دورہ کیا۔ ایک امن کمیٹی بنا دی گئی ہے جس میں فریقین کے فسادی رہنما شامل ہیں۔ دونوں طرف کے فسادی رہنما میرے عقیدت مند ہیں۔ میں ایک انکوائری کمیٹی بنا کر اسے متنازعہ جگہ کی تاریخی ریسرچ کرنے کا حکم جاری کر دیا ہے۔

فیصلہ کرنا دشوار نہیں ہے۔ مگر میں ابھی پیرس سے ٹیلی گرام کے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔

۱۰ / دسمبر

پیرس سے ٹیلی گرام آگیا ہے ۔ (مایوسی)

انکوائری کمیٹی کی رپورٹ بھی آگئی ہے۔ (ایک طرفہ ہے)

اس دوران میں فسادی فریقین کے پانچ آدمی ہلاک ہو چکے ہیں۔ یہ سرکاری اطلاع ہے۔ غیر سرکاری اطلاع میں ہمیشہ مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے نہ جانے سرکاری طور پر آدمی زیادہ کیوں نہیں مرتے؟

سنگدل محبوبہ نے واپس آنے کی بجائے مجھے پیرس آنے کی دعوت دی ہے اس نے حکم دیا ہے کہ مندر اور مسجد کا فیصلہ فوراً کر دو۔ سیاسی فیصلے حسیناؤں کے حکم سے کئے جاتے ہیں۔ عجیب دنیا ہے۔ عجیب سیاست ہے۔

لیکن میں ابھی تک الجھن میں ہوں۔ میرے کچھ مخالف لیڈر انکوائری کمیٹی کی رپورٹ شائع کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ کل مظاہرین کا ایک ہجوم اپوزیشن لیڈر شری گورکھ ناتھ جی کی قیادت میں میری کوٹھی کے باہر نعرے لگاتا رہا اور میں

اندر بیٹھا اطمینان سے ٹیلی ویژن دیکھتا رہا۔ آج رات میں شری گورکھ ناتھ کو ڈنر پر بلا رہا ہوں۔ اسے مچھلی کے پکوڑے بہت پسند ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتا ہے۔ مچھلی کے پکوڑے عوام کے گوشت پوست سے زیادہ لذیذ ہوتے ہیں۔

میرا خیال ہے ڈنر کی مستی میں ہم مسجد اور مندر دونوں کا فیصلہ کرلیں گے۔

۱۲ دسمبر

گورکھ ناتھ کے ساتھ میرا سمجھوتہ نہیں ہوسکا وہ کم بخت اس معاملے کو طول دینا چاہتا ہے۔ کچھ اور زخمی، کچھ اور گرفتاریاں، کچھ اور قتل، کچھ اور بے وقوفیاں جو عوام کی طرف سے سرزد ہوں اور وہ ان بے وقوفیوں کے بل بوتے پر میرے سر سے تاج اتارے اور خود پہن لے۔

کیوں نہ میں وزارت سے استعفیٰ دے دوں اور اعلان کر دوں کہ اس زمین پر مندر کا حق ہے اور میں مندر کی دیواروں میں اپنی ہڈیاں چنوا دوں گا۔ میرا لہو اور میرا گوشت مندر کی تعمیر میں لگا دیا جائے، اس سے دو فائدے ہوں گے

(۱) گورکھ ناتھ کی تقدیر پھوٹ جائے گی۔ کیونکہ وہ بھی مندر کے حق میں شور و غل مچایا کرتا ہے۔ میرے میدان میں اترتے ہی لوگ گورکھ ناتھ کو بھول جائیں گے

(۲) مندر کی حفاظت کے لئے جو دو لاکھ روپیہ چندہ جمع ہو چکا ہے۔ وہ میری تحویل میں آجائے گا۔

لیکن مسجد بچاؤ کمیٹی کا کیا ردِّ عمل ہوگا۔ کیونکہ اس کمیٹی کا صدر بھی میرا فرشتہ ہے اور وہ اب تک مجھ سے پچیس ہزار روپے لے چکا ہے۔ اور پھر وہ میرا سچا وفادار بھی ہے۔

بڑی الجھن ہے۔ ابھی مجھے کچھ اور سوچنا چاہیئے، کچھ اور انتظار کرنا چاہیئے۔

۱۶ر دسمبر

کامیابی ۔ مسرت ۔ ذہانت !

متنازعہ جگہ کا حل تلاش کر لیا گیا ہے ، ریسرچ کمیٹی کی رپورٹ میں ایک سنسنی خیز تبدیلی کر لی گئی ہے کہ یہاں مندر اور مسجد سے پہلے گوالے رہا کرتے تھے ۔ اس لئے اس جگہ پر گائیوں کی پرورش و پرداخت کی جائے گی اور عوام کو خالص ، پاکیزہ دودھ بازار سے پچیس فی صدی رعایتی قیمت پر سپلائی کیا جائے گا ۔ ریسرچ کمیٹی کے پانچ معزز ممبروں نے پانچ پانچ ہزار روپے لیکر یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ہسٹری لپاڑیا ہم سے زیادہ بہتر مورخ ہیں ۔ انھوں نے تو رپورٹ میں یہ ترمیم بھی منظور کر لی ہے کہ اس جگہ کی کھدائی کے دوران ایک گائے کا سینگ بھی ملا ہے ، اور دودھ دوہنے والا ایرتن بھی ۔

آج شام کو عوام کا ایک بھاری جلوس نکل رہا ہے جو گئو شالہ بنانے کے حق میں ہوگا ۔ عوام کو مہنگے خدا کی ضرورت نہیں ، سستے دودھ کی زیادہ ضرورت ہے !

کل صبح سرکار کی طرف سے ایک قاعدانہ پیش کش کی جائے گی کہ مندر اور مسجد کی تقدیس کو برقرار رکھنے کے لئے گئو شالہ کے دائیں اور بائیں طرف کی زمین الاٹ کر دی جائے گی اور تعمیر کا سارا خرچ سرکار ادا کرے گی ۔

فریقین کے دو بڑے رہنما میرے ہاتھوں سے جوس کے گلاس پی کر کل صبح اپنی بھوک ہڑتال ختم کر رہے ہیں ۔ اپنے ہی عزیز ہیں ۔ بڑے فرمانبردار ہیں ۔ میں کل صبح ہوائی جہاز سے پیرس کی طرف پرواز کر رہا ہوں ۔ اس اندولن کی تکان مٹانے کے لئے محبوبہ کی آغوش بہت ضروری ہے ۔ اگرچہ سرکاری طور پر میں فرانس میں بندروں کی ایکسپورٹ کے سلسلے میں گفتگو کرنے جا رہا ہوں ۔

ایک بابو کی ڈائری

۳ مئی ۱۹۷۰ء

کل میسرز ٹھینگا رام ٹھینگا مل کے مالک ٹھینگا چند نے مجھے خوش کرنے کے لئے ۱۹۷۰ء کی ایک ڈائری عنایت فرمائی۔ کیونکہ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ ریلوے کے گڈس پارسل کلرک بجو ناتھ سے آپ کا "مناسب" تعارف کرا دوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے لفظ "مناسب" پر خاص زور دیا تھا۔ ایک لفظ کے بدلے میں ایک ڈائری مل جاتی ہے۔ مارکیٹ میں لفظ بھی بکتے ہیں۔ کتنی پیاری دنیا ہے۔ کتنی پیاری مارکیٹ ہے!

سنا ہے ہر بڑا آدمی ڈائری لکھتا ہے، مجھے شک ہو گیا ہے کہ میں بڑا آدمی ہوں یا بننے والا ہوں۔ جب میں چھوٹا سا تھا تو میرا والد کہا کرتا تھا "میرا بیٹا بڑا ہو کر سیکھا سش بابو بنے گا۔" والد کی دعا کا ففٹی ففٹی اثر ہوا۔ یعنی میں سیکھا سش بابو تو نہ بن سکا۔ صرف بابو بن گیا۔ مجھے اس لفظ بابو سے سخت نفرت ہے۔ رکشا والا، تانگے والا، قلی، چپراسی سبھی مجھے بابو کہہ کر بلاتے رہیں گے میں بڑا آدمی نہیں بن سکتا کسی نے مجھے بتایا کہ بابو لفظ "بابونہ" سے نکلا ہے۔ جس کا مطلب "بندر" ہے۔ میں نے جب کبھی آئینہ دیکھا ہے مجھے بندر کہیں دکھائی نہ دیا جس دن مجھے اپنے اندر بندر نظر آ گیا میں خودکشی کر لوں گا۔

میری بیوی ادھر آ رہی ہے۔ بندر کی بیوی! جب یہ دلہن بن کر آئی تھی تو بالکل تلمشار سائرہ بانو معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اب چھ ہی سات سال میں "سلم ایریا" بن کر رہ گئی ہے۔ میرے خیال میں مجھے ڈائری لکھنا بند کر دینا چاہئے۔ کیوں کہ وہ مجھ سے آ کر کہے گی۔ اے میرے چار بچوں اور پانچویں امیدوار بچے کے ڈیڈی! اپنے اس بچے کو ڈانٹو یہ اپنی نئی قمیص پھاڑ لایا ہے اور اسے یہ وارننگ بھی دے دو

کہ اسے تنخواہ کے لیے تک تنگدار رہنا پڑے گا۔

۶ مئی ۱۹۷۰ء

آج سارا دن بے حد مصروف رہا۔ مالک مکان آٹھویں بار مکان خالی کرنے کی دھمکی دینے آیا۔ آدھ گھنٹہ تک اسے گالیاں دیں اور گالیاں کھائیں گالیوں کے اس کاروبار کے دوران ننھے بچے کو بوتل میں سے دودھ بھی پلاتا رہا کیونکہ میری بیوی سلم ایریا پریم کماریوں کے ست سنگ میں بھگوان کے ساتھ براہ راست تعلقات قائم کرنے گئی ہوئی تھی۔ خاوند گالیاں کھاتا ہے۔ بیوی ست سنگ کرتی ہے جب وہ لوٹی تو میں نے مالک مکان سے جتنی گالیاں کھائی تھیں، وہ بیوی کے حلق میں انڈیل دیں۔ دفتر میں جا کر بڑے صاحب سے جھڑپ ہوگئی۔ اس نے دھمکی دی کہ تمہارے خلاف ان ایفی شینسی کی کچھ رپورٹیں آئی ہیں۔ مالک مکان مجھے دھمکی دیتا ہے۔ میں بیوی کو دھمکی دیتا ہوں۔ بیوی بچوں کو دھمکی دیتی ہے ہر بڑا ہر چھوٹے کو دھمکیوں تلے پیٹا جا رہا ہے صاحب بڑا ہے، میں چھوٹا ہوں اگر نوکری چھوٹ گئی، اگر بیوی پریم کماریوں کے ساتھ بھاگ گئی؟ میں ڈر گیا صاحب سے وعدہ کر لیا کہ میسرز ٹھینگا مل کی دکان سے آپ کے مکان کے لئے ایک من لوہے کا سریا لا دوں گا۔ بیوی کو ٹیلیفون کر دیا کہ فی الحال پریم کماریوں کے ساتھ بھاگنے کا پروگرام ملتوی کر دو۔ مالک مکان کے گھر جا کر منت سماجت کی کہ میں رشوت لینے کا نیک کام شروع کر رہا ہوں اور ڈیوڑھا کرایہ ادا کیا کروں گا۔ اور کیا کرتا۔ تین سو روپے ماہانہ پانے والا بابو ذلت آمیز سمجھوتوں کے سوا اور کر بھی کیا کر سکتا ہے۔

سارا دن سمجھوتے کرتا رہا۔ شام کو کلرکوں کی ریلی میں انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتا رہا۔ اس کے بعد من کی شانتی کے لئے ایک بھگوتی جاگرن میں شریک

ہوا۔ اس وقت نیند نہیں آرہی ہے۔ اس لئے ڈائری لکھ رہا ہوں۔

۱۰ مئی ۱۹۷۰ء

آج کوئی خاص گھٹنا یا درگھٹنا نہیں ہوئی۔ اتوار کی چھٹی تھی، اس لئے دن بھر اکتاہٹ رہی۔ بیوی کے ساتھ فلم دیکھنے کا وعدہ کیا اور توڑ دیا، تاش کھیلنے والے کچھ کلرک یالو آ گئے۔ وہ جوا کھیلنا چاہتے تھے۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میں نے اپنے کیرکٹر کی تعمیر شروع کر دی ہے۔ اس لئے جوا نہ کھیلوں گا۔ انھوں نے مجھے جورو کا غلام کہہ دیا۔ میں نے قبول کر لیا۔ شام کو تفریح کے لئے بچوں کو لے کر میونسپل پارک میں چلا گیا اور ان کے ساتھ گھاس پر بیٹھ کر مونگ پھلیاں کھاتا رہا۔ کئی مہینوں بعد بچوں نے اعلان کیا کہ تم ہمارے ڈیڈی ہو۔ مونگ پھلیاں، اور میونسپل پارک صرف دو چیزیں ایسی ہیں جو انسان کو ڈیڈی بنا دیتی ہیں۔ میں نے جب بچوں کو اپنے اوپر اتنا مہربان دیکھا تو انھیں ان کی ممی کے خلاف بھڑکاتا رہا۔ اور ان میں سے ایک بچے نے تو مجھ سے وعدہ بھی کر لیا کہ آئندہ ممی کے راز ہائے سربستہ آپ کو بتا دیا کروں گا۔

۱۳ مئی ۱۹۷۰ء

گذشتہ کئی دنوں سے محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے گھر کے سامنے والی چھت پر ایک نوجوان لڑکی ٹھیک اس وقت بال بکھرے آکھڑی ہوتی ہے۔ جب میں دفتر جانے لگتا ہوں وہ زلفوں کو کسی رقاصہ کے انداز میں جب جھٹکا دیتی ہے تو میرے دل میں گھنگھرو بج اٹھتے ہیں۔ شروع شروع میں تو مجھے نگاہیں ملانے کی جرأت نہ ہوئی کیونکہ ایک تو میں کلرک ہوں۔ دوسرے محلے والے بھی مجھے شریف آدمی کہتے ہیں اور تیسرے یہ کہ پیار کرنے کے لئے ٹائم چاہیئے۔ میرا ٹائم دفتر کے لئے مخصوص ہے۔ پیار کرنے کے لئے نہیں۔ لیکن ایک دن تنگ آکر میں نے اسے ہاتھ سے

سلام کر دیا۔ وہ کمبخت مسکرا دی۔ اس مسکراہٹ نے میرے اندر کا سارا نظام اتھل پتھل کر دیا۔ اس دن بس پر سوار ہونے وقت اچانک اس کی مسکراہٹ یاد آ گئی تو بس سے پاؤں پھسل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روٹی کا ڈبہ تو بس کے اندر چلا گیا۔ اور میں بس سے باہر رہ گیا۔

بیوی نے پوچھا تھا "ڈبہ کہاں گم کر آئے ہو" میں نے جواب دیا "چوری ہو گیا۔" اب میں اسے کیسے بتاتا کہ سامنے وہ جو زلفوں والی سانولی سلونی لڑکی رہتی ہے۔ ڈبہ اسی نے چرایا ہے۔

آج صبح وہ سانولی سلونی لڑکی چھت پر نہیں آئی۔ میرا دل ڈوبنے لگا، جی چاہا، آج محمد محروم دیدار کو دفتر نہ جانا چاہیے۔ کئی منٹ تک اس سانولے چاند کے طلوع ہونے کے انتظار میں سڑک پر کھڑا رہا۔ میرا چھوٹا بچہ بالکونی سے مجھے "بائی بائی" کرتا رہا۔ بچے کی اس حرکت سے گھبرا کر چل دیا۔ جاتے جاتے ایک ٹھنڈی آہ محبوبہ کی چھت کی طرف پھینک دی۔ سارا دن دفتر میں طبیعت مضمحل رہی کسی کام کو جی نہ چاہا۔ شام کو اوور ٹائم پر بھی کام نہیں کیا اور جلدی گھر لوٹ آیا کیا دیکھتا ہوں ــــ کہ چاند میرے گھر کی بالکونی میں اتر آیا ہے اور میری بیوی کے ساتھ غیر رومانی باتوں میں مصروف ہے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکا جیسے باہر نکل کر محبوبہ کے قدموں پر جا گرے گا۔ میں نے جلدی جلدی بیوی کی آنکھیں بچا کر محبوبہ سے آنکھ ملائی۔ ایک خاموش دہری مسکراہٹ نے جواب دیا "بائی بائی" بعد میں بیوی نے مجھے بتایا کہ ان لوگوں کا تبادلہ کانپور ہو گیا ہے اور کل جا رہے ہیں۔ عجیب محبوبہ ہے۔ اتنی جلدی بائی بائی کرنا تھا تو مسکرا کر کیوں دیکھا تھا۔ ابھی تو خاموش پیار گفتگو کی منزل میں تھا۔ لبوں کو جنبش تک نہ ہوئی تھی۔ محبت کے دو بولوں کا تبادلہ تک نہ ہوا تھا۔ اور تم چلی گئیں، اتنا مختصر پیار! اس سے پہلے کہ میں

جرأت اظہار کروں، انداز گفتار سوچوں، تم یا ہیں چھوڑ کر بھاگ گئیں!

اب تو ڈائری لکھنے میں لطف آنے لگا تھا۔ اب کیا فائدہ ڈائری لکھنے کا سوچ رہا ہوں ڈائری کے باقی صفحے مِیبرز ٹھینگا مل کو لوٹا دوں۔۔ اس پیار میں میرے دو نقصان ہوئے۔ ایک تو دل ٹوٹ گیا اور دوسرے روئی کا ڈبہ گم ہو گیا۔

۱۴ مئی ۱۹۷۰ء —

آج صبح ریشمیں زلفوں والی محبوبہ اپنی فیملی کے ساتھ ٹیکسی پر سوار ہو کر روانہ ہو گئی۔ میں نے عینک لگا کر اس کی طرف دیکھا۔ میرا خیال ہے وہ اداس تھی میری عینک بہترین کوالٹی کی ہے، جھوٹ نہیں بولتی۔

میں نے آج اس کے ہجر میں تڑپنے کے لئے دفتر سے چھٹی لے لی۔ اس کے جانے کے بعد بہت پچھتایا کہ اس سے کانپور کا ایڈریس ہی پوچھ لیتا۔ میرا سب کچھ چھین کر لے گئی۔ کم از کم اس کا ایڈریس تو میرے پاس رہ جاتا۔ سارا دن اپنی اس بے وقوفی اور محبوبہ کے مستقبل پر آہیں بھرتا رہا۔ آہیں بھرنے کے دوران میرا بڑا سالا آ گیا۔ اس کے ساتھ انتہائی لغو اور بے معنی باتیں کرتا رہا۔ وہ اپنی بہن کو چند دن کے لئے لینے آیا تھا۔ میں نے بجوشی اجازت دیدی۔ بچے اپنے انکل کو دیکھ کر مجھے بھول گئے۔ ایک تو محبوبہ کا ہجر اور اب بیوی کا ہجر۔ ایک میں آہیں ہیں دوسرے میں حسرت ہے۔ اس وقت بیوی بچے میرے سالے صاحب کے ساتھ سنیما دیکھنے کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ اور میں گھر میں تنہا ہوں۔ یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔ بار بار نگاہیں اس چھت کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ جہاں کبھی زلفیں لہرایا کرتی تھیں آج ایک کوا بیٹھا کائیں کائیں کر رہا ہے۔

اور میں سوچ رہا ہوں اب جبکہ رومان کے امکانات تاریک ہو گئے ہیں اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے کوئی اور شغل اختیار کر دوں۔ رشوت کا کام ہی شروع کر دوں۔ محبت نہ سہی رشوت ہی سہی۔ دل و دماغ کے لئے کوئی ہنگامہ تو رہنا ہی چاہئے

۲ مئی ۱۹۷۰ء

آج مندرجہ ذیل کارہائے نمایاں سرانجام دئے۔

۱ ۔ گھر کی چار پائیوں کی ادوائنیں کس دیں۔

۲ ۔ راشن کارڈ کی تجدید کروائی اور گھر کے پانچ افراد کی بجائے چھ افراد لکھوائے

۳ ۔ بلیک میں بناسپتی گھی کا ایک ڈبہ خرید لیا۔

۴ ۔ دفتر سے سٹیشنری چرائی۔ بچوں کے کام آئے گی۔

۵ ۔ ایک دوست سے دس روپے ادھار لئے۔ کیونکہ تنخواہ ختم ہو چکی تھی۔ یہ دس روپے لوٹانے کا ارادہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس دوست نے دو سال پہلے مجھ سے پانچ روپے ادھار لئے تھے۔ لیکن ابھی تک نہیں لوٹائے تھے۔

۶ ۔ بیوی کو اس کے میکے میں ارجنٹ خط لکھا کہ اسے او لیٹر سمجھ کر جلدی لوٹ آؤ تمھارے ہجر نے مجھے دو کوڑی کا نہیں رکھا۔

۷ ۔ اپنے ایک ساتھی کلرک کے خلاف بڑے صاحب کو چٹھی لکھی کہ وہ ہر روز دفتر آکر صرف حاضری لگاتا ہے اور پھر بھاگ جاتا ہے۔ تحقیق کی جائے۔ اس چٹھی کے نیچے اپنا نام نہیں لکھا۔ اس کلرک نے بھی میری سٹیشنری چرانے کی رپورٹ کر دی تھی۔

۸ ۔ گھر لوٹتے وقت بس پر سوار ہوا۔ رش زیادہ تھا اس لئے میں نے کنڈکٹر سے ٹکٹ لینا مناسب نہ سمجھا۔

۹ ۔ فروٹ شاپ پر آکر پھلوں کا ریٹ پوچھا، خریدے نہیں۔ کیونکہ حسب سابق بے حد مہنگے تھے۔ گھر آکر ایک "لیٹر ٹو دی ایڈیٹر" لکھا کہ مہنگائی نے ہم کلرکوں کی کمر توڑ دی ہے۔

۱۰ ۔ ایک بلی کو مارا جو بیوی کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر دودھ پینا چاہتی

تھی ، لیکن ڈنڈا بلی کے بجائے دودھ کی کڑھائی کو جا لگا ۔ دودھ الٹ گیا ۔ نہ بلی کے کام آیا نہ میرے ۔ میں اور بلی دونوں بہت دیر تک کف افسوس ملتے رہے ۔

۲۵ مئی ۱۹۷۰ء

کل سے اہلیہ محترمہ تشریف لے آئی ہیں ۔ آتے ہی انہوں نے دو اہم سنسنی خیز خبریں سنائیں ۔ ایک یہ کہ بڑا برخوردار عزیزازجان دیش حیدر جوا کھیلتے ہوئے پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا ۔ بہت مشکل سے ناناجی کے رسوخ کی بدولت معافی مانگ کر رہا کرایا گیا اور دوسری خبر یہ کہ پانچویں عزیزازجان کی ڈلیوری کا وقت قریب آپہنچا ہے ۔ لہٰذا باادب باملاحظہ ہوشیار !

میں نے بیوی سے دست بستہ عرض کی کہ جہاں تک جوئے کے کیس کا تعلق ہے وہ ننھیال سے ورثے میں عنایت ہوا ہے ۔ سنا ہے برخوردار کے نانا بھی بالکل اسی عمر میں جوا کھیلتے ہوئے حوالات تشریف لے گئے تھے ۔ اس لئے تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے ۔

اور پانچویں برخوردار کی ڈلیوری کے سلسلے میں عرض یہ ہے کہ فیملی پلاننگ کے اصول توڑنے کا یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے ۔ تمہارے بطن سے جوئے باز پیدا ہو رہے ہیں جس سے دلیش کا مستقبل خطرے میں پڑ رہا ہے ۔ اس لئے ہر صبح بیدار ہوتے ہی چوک میں لٹکتی ہوئی فیملی پلاننگ کی لال تکون کی طرف دیکھا کرو ۔ مندر جانے کی بجائے لال تکون کی طرف دیکھنا زیادہ مفید ہے ۔

ان دونوں سوالوں پر بیوی سے ان بن ہو گئی ہے ۔ آج رات کا کھانا نہیں پکایا گیا ۔ کھانا نہ کھانے سے میری آنما (آتما) پڑی شفاف ہو گئی ہے ۔ اور میں گوتم بدھ کی طرح آج رات کو نروان کی تلاش میں بھاگ جانا چاہتا ہوں ،

۲۰ رمئی ۱۹۷۰ء ———

افسوس! کہ میں گوتم بدھ نہ بن سکا۔ کیونکہ فرار کی اس رات کو اچانک میری آنکھ لگ گئی اور صبح اس وقت کھلی جب میری بیوی میرے پلنگ کے پاس چائے کا گرم گرم کپ لئے کھڑی تھی۔ اس نے رو رو کر مجھ سے معافی مانگی جو میں نے عطا کر دی اور پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھایا کہ ہم دونوں زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اس لئے الگ نہیں ہو سکتے۔ روکھی سوکھی کھا لیں گے لیکن دنیا کے سامنے رسوا نہ ہوں گے۔ ہمارا مطلب یقیناً یہی تھا کہ ہم اپنی ہی نگاہوں میں رسوا ہوتے رہیں تو کوئی حرج نہیں جب نصیب میں کلرکی لکھی ہے تو پھر کیسا گوتم بدھ اور کیسی خانہ جنگی؟

گوتم بدھ نے آج دو روپے رشوت لی اور بچوں کے لئے خربوزے اور فالسے خرید لایا۔

۲ر جون ۱۹۷۰ء ———

کل ہمیں تنخواہ ملی تھی تنخواہ سے زیادہ مسرت انگیز چیز یہ تھی کہ نئے گریڈ منظور ہو جانے کے بعد گزشتہ ایک سال کا "ایریر" (بقایا) کا روپیہ مل گیا۔ میں نے بیوی کو چمپئی رنگ کی ایک نئی ساڑھی لے دی جسے پہن کر وہ یوں معلوم ہوتی تھی جیسے پہلی رات کی دلہن ہے اب بے اختیار جی چاہا، ہنی مون منانے کے لئے ہل اسٹیشن پر چلا جاؤں لیکن بیوی نے سمجھایا کہ آئندہ سال چلیں گے۔ اس سال تو ڈلیوری ...؟؟

لغاتِ فکری

الیکشن ــــ ایک دنگل جو ووٹروں اور لیڈروں کے درمیان ہوتا ہے
اور جس میں لیڈر جیت جاتے ہیں ووٹر ہار جاتے ہیں۔
الیکشن پٹیشن۔ ایک کھمبا جسے ہاری ہوئی بلی نوچتی ہے
ووٹ ــــ چیونٹی کے پَر، جو برسات کے موسم میں نکل آتے ہیں۔
ووٹر ــــ آنکھ سے گر کر مٹی میں رلا ہوا آنسو جسے الیکشن کے دوران موتی
سمجھ کر اٹھا لیا جاتا ہے اور الیکشن کے بعد پھر مٹی میں ملا دیا
جاتا ہے۔
ووٹرز لسٹ جوہری کی دکان پر لٹکی ہوئی موتیوں کی لڑیاں۔
امیدوار ــ بڑے بڑے عقلمندوں کو بھی بے وقوف بنانے والا عقلمند
زرِ ضمانت ــ کنوئیں میں پھینکی ہوئی رقم، جو اکثر ڈوب جاتی ہے۔
انتخابی جلسہ۔ ایک طنبورہ جس پر بے سرے گانے گائے جاتے ہیں۔
چناوی مینی فیسٹو جس میں بعد میں توڑنے کے لئے وعدے کئے جاتے ہیں۔
انتخابی تقریر ــ الیکشن کے جنگل میں گیدڑوں کا نغمہ کہ میرا باپ بادشاہ تھا۔
انتخابی جھنڈے زنگارنگ پتنگوں کی دکان
انتخابی پوسٹر امیدوار کا شجرۂ نسب۔ اس کے خاندان کی مکمل تاریخ۔
ڈور ٹو ڈور کنویسنگ در در کی خاک چھاننے کا شوق۔

پولنگ ایجنٹ - امیدوار کا چمچہ

بوگس ووٹ - ایک جھوٹ، جو سچے آدمی الیکشن کے دنوں میں بولتے ہیں۔

الیکشن کا خرچہ جوئے پر لگائی ہوئی نقدی

چناؤ کے نتائج لڑائی ختم ہونے کے بعد میدان جنگ میں گنتی کا عمل کر (۱) کتنے ڈھیر ہوئے - (۲) کتنے زخمی ہوئے (۳) کتنے بچ نکلے۔

محبوبہ — ایک قسم کی غیر قانونی بیوی

بیوی — محبوبہ کا انجام

بائیسیکل — کلرک بابو کی دوسری بیوی

کلرک — ایک گیدڑ جو شیر کا جامہ پہن کر کرسی پر بیٹھتا ہے۔

خدا : — وہم اور حقیقت کے درمیان ڈولتا ہوا پینڈولم

عشق — ایک معزز قیدی جسے جیل میں ہمیشہ اے کلاس ملتی ہے

کاغذ : — کورا ہو تو بے ضرر لکھا جائے تو ضرر رساں۔

بے روزگاری - عزت حاصل کرنے سے پہلے بے عزتی کا تجربہ

کرپشن :- ایک زہر جسے شہد کی طرح مزے لے کر چاٹا جاتا ہے۔

سیاست :- پیسے والوں کی عیاشی اور بن پیسے والوں کے گلے کا ڈھول۔

بیوی : — ایک لطیفہ جو بار بار دہرانے سے باسی ہو جاتا ہے۔

سچائی : — ایک چور جو ڈر کے مارے باہر نہیں نکلتا۔

جھوٹ : — ایک پھل جو دیکھنے میں حسین ہے۔ کھانے میں لذیذ ہے لیکن جسے ہضم کرنا مشکل ہے۔

جمہوریت :- ایک مندر جہاں بھگت لوگ چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔ اور پجاری کھا جاتے ہیں۔

عشق : — خودکشی کرنے سے پہلے کی حالت۔
غریبی : — ایک کشکول جس میں امیر لوگ پیسے پھینک کر اپنے گناہوں کی تعداد کم کرتے ہیں۔
شاعر : — ایک پرندہ جو عمر بھر اپنا گم شدہ آشیانہ ڈھونڈتا رہتا ہے۔
لیڈر — دوسروں کے کھیت میں اپنا بیج ڈال کر فصل اگانے اور بیچ کھانے والا۔
قبرستان : مردہ انسانوں کا حال، زندہ انسانوں کا مستقبل۔
امید : — ایک پھول جو کبھی بنجر زمین کو زرخیز بنا دیتا ہے۔ اور کبھی زرخیز زمین کو بنجر۔
خوشامد : کمزور کی طاقت اور طاقتور کی کمزوری۔
ڈھٹائی : — صرف جسم ہی جسم۔ روح غائب۔
شرافت : — ایک عینک جسے اندھے لگاتے ہیں۔

تعلیم — ان پڑھ لوگوں کو بے وقوف بنانے کا ہتھیار۔
بہادر — آگ کو پانی سمجھ کر پی جانے والا کم علم
اندھیرا — شیطان کا گھر جسے خدا اپنے ہاتھ سے تعمیر کرتا ہے۔
رسوئی گھر۔ گرہستی عورتوں کی راجدھانی۔
گرہستی عورت: گرہستی مرد کی گاڑی کا پٹرول پمپ
محل : — جھونپڑی کے مقابلے پر کھینچی ہوئی بڑی لکیر
طالب علم: ایک پیاسا جسے سمندر میں دھکا دے دیا جاتا ہے اور وہ عمر بھر ڈبکیاں کھاتا رہتا ہے۔
جیب کترا : — ایک شرارتی چھوکرا جو دوسروں کی بائیسکل میں پن چبھو کر

اس کی ہوا نکال دیتا ہے اور بھاگ جاتا ہے۔

سڑک :۔ ایک راستہ جو جنت کو بھی جاتا ہے اور جہنم کو بھی۔

جنت :۔ ایک خواب

جہنم :۔ اس خواب کی تعبیر

پیسہ :۔ ایک چھپکلی جو انسان کے منہ میں آگئی ہے۔ اور اب اسے کھائے تو کوڑھی۔ چھوڑے تو کلنکی۔

دریا :۔ جس کے کنارے گھر بناؤ تو اسے جوش آجاتا ہے۔ اور گھر کو بہا لے جاتا ہے۔ لیکن اگر اس میں ڈوبنے کے لئے جاؤ تو ہمیشہ سوکھا ملتا ہے۔

خودکشی :۔ جائز چیز کا ناجائز استعمال

کرسی :۔ جس پر بیٹھ کر عقل مند آدمی بے وقوف بن جاتا ہے۔

نیکی :۔ جسے پہلے زمانے میں لوگ دریا میں ڈال دیتے تھے۔ آجکل منڈی میں برائے فروخت بھیج دیتے ہیں۔

اخبار :۔ ایک پھل جو تسکین کے لئے کھایا جاتا ہے۔ مگر کھاتے ہی بے چینی پیدا کر دیتا ہے۔

میگسار :۔ رات کا شہنشاہ۔ صبح کا فقیر۔

طوائف :۔ ڈسپوزل کا مال جسے اونے پونے دام پر نیلام کر کے بیچ دیا جاتا ہے اور بڑھ چڑھ کر بولی دے کر دوبارہ خرید لیا جاتا ہے۔

خدا :۔ انسان کی وہ کمزوری جس سے وہ طاقت حاصل کرتا ہے۔

دوست :۔ دشمنی سے پہلے کی ایک منزل۔

دشمن :— دوستی کا انجام

مہمان :— جس کے آنے پر خوشی اور جانے پر اور زیادہ خوشی ہوتی ہے

ڈاکٹر :— جو بیماروں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے مگر تندرستوں کو دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہے۔

جج :— انصاف کرنے میں آزاد مگر قانون کا غلام

گواہ :— جھوٹ اور سچ کے درمیان لٹکتا ہوا پنڈولم

یاد :— دکھوں کا چھوڑا ہوا پرانا بہی کھاتہ

کوشش :— اندھیرے میں تیر چلانا۔ لگ جائے تو واہ واہ! چوک جائے تو آہ آہ!

اندھیرا :— بجلی کمپنی کا سر درد

بجلی :— چوروں کا سر درد

چور :— ایک جیب کا مال دوسری جیب میں منتقل کرنے والا آرٹسٹ

ماڈرن انسان: جو اپنے سے پہلے زمانے کے ماڈرن کو برا کہے۔

خوراک :— جو حیوان کو انسان اور انسان کو حیوان بنا دیتی ہے۔

انجان :— جو وہ چیزیں نہ جانتا ہو جنھیں جاننے سے دکھ پیدا ہوتے ہیں

استاد :— بیوقوفوں کو عقل مند بنا کر اپنے دشمن بنانے والا بے وقوف

کوڑا اکرکٹ :— استعمال شدہ چیزوں کا جنازہ

جنازہ :— واپسی ٹکٹ

بیل :— گائے کا بیاہا خاوند۔

لنگڑا :— دو پاؤں والوں سے زیادہ خطرناک۔

کمزوری :— ایک مردہ جس پر زندہ لوگ حملہ کر دیتے ہیں اور بڑے خوش

ہوتے ہیں۔

سائنلڈ :۔ مردوں کے چھوڑے ہوئے تخت پر بیٹھنے والا حکمران

فن :۔ آنکھوں والوں کی اندھی حرکت۔

مکان :۔ چڑیوں، مکھیوں اور انسانوں کا مشترکہ ایک رین بسیرا۔

مفلس :۔ جو اگر موجود نہ ہو تو اہل دولت خودکشی کر لیں۔

خودکشی چوری کی جائے تو ڈکشنری سے ایک لفظ کم ہو جائے۔

لفظ :۔ جو منہ سے ادا ہو جائے تو باہر جنگ چھڑ جائے، ادا نہ ہو سکے تو اندر جنگ چھڑ جائے۔

مریض :۔ جس کے بل بوتے پر دنیا بھر کی میڈیکل کمپنیاں چلتی ہیں۔

قبرستان :۔ لاشوں کی سوشلسٹ سٹیٹ

روح :۔ مجہول کی مفروضہ کمر۔ جس کے متعلق ایک شاعر نے کہا تھا کہ
کہاں ہے، کس طرف کو ہے، کدھر ہے

شاعر :۔ اندھیرے میں بھٹکتا ہوا ایک چراغ۔

بدصورت شوہر : حسیناؤں کو پرکھنے کا آلہ۔

آدم :۔ خدا کی وہ غلطی جس کی وہ آج تک تصحیح نہیں کر سکا۔

غلطی :۔ معاف کر دینے والوں کے لئے ایک نادر موقع۔

موقع :۔ جس سے ہمیشہ عقل مند لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور بیوقوف لوگ یہ سوچ کر ٹال جاتے ہیں کہ یہ ہماری شان کے شایاں نہیں۔

بے وقوف :۔ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں بے وقوفوں نے قائم کی ہیں اور عقل مندوں نے اجاڑی ہیں۔

عوام :۔ چوپال پر رکھا ہوا ایک حقہ جسے ہر راہگیر آکر پیتا ہے۔

سرمایہ دار: دوسروں کی کترنوں سے اپنے لئے پتلون تیار کرنے والا ایک ماہر ٹیلر ماسٹر۔

امن :۔ وحشی لوگوں کی نیند کا زمانہ۔

بوڑھے :۔ دیوالیہ دکان کے باہر لٹکا ہوا پرانا سائن بورڈ۔

بکری :۔ جس کی عقل زیادہ ہے دودھ کم

بیوی :۔ محبوبہ کی بگڑی ہوئی شکل۔

رشتے دار :۔ ایک رسی جو ٹوٹ کر بھی سر پر لٹکتی رہتی ہے۔

تنکا :۔ ٹیکسٹائل ملوں کا مذاق اڑانے والا۔

مقروض :۔ ایک شہنشاہ جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتا ہے۔

قرض خواہ :۔ جو قرض دیتے وقت دوست اور قرض واپس لیتے وقت دشمن لگے

دہلی :۔ جہاں مکان بڑے ہیں انسان چھوٹے ہیں۔

بمبئی :۔ ایک سمندر جہاں سے بھگوان نکل گیا ہے۔

کلکتہ : جہاں کے لوگ دن کو ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ رات کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گاتے بجاتے ہیں۔

حکومت :۔ کانٹوں کا تاج جسے ہر گنجا پہننا چاہتا ہے۔

عقل :۔ محبت اور خلوص کا قبرستان۔

بے وقوفی :۔ ایک خزانہ جو کبھی خالی نہیں ہوتا۔

بیاہ :۔ عشق کا انجام، بچوں کا آغاز

بچے :۔ ماں باپ کے پیدا کیے ہوئے ماں باپ۔

ماں باپ :۔ بیک وقت بچوں کے حاکم اور بچوں کے غلام۔

دل :۔ ایک قبر جس کے نیچے اکثر زندہ مردے دفن کر دیئے جاتے ہیں

دماغ :۔ شیطان اور خدا دونوں کا مشترکہ گھر۔

آنکھیں : جو باہر سے بند ہو جائیں تو اندر کی طرف کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔

ہاتھ :۔ جو بھیک دیتا ہے۔ لیتا نہیں ہے۔

پاؤں : جو دوسروں کو ٹھوکر مارتا ہے۔ خود ٹھوکر کھاتا ہے۔

سُود :۔ دوسروں کا بھلا کرنے کے لئے ایک برائی۔

بے وفا :۔ ایک طوطا جسے پستہ کھلایا جائے تو تعریف کرتا رہتا ہے۔ نہ کھلایا جائے تو آنکھیں پھیر لیتا ہے۔

وفادار :۔ بغیر پستہ کھائے تعریف کرنے والا جاہل طوطا

خوش قسمت :۔ ایک لاٹھی جو جس کے ہاتھ لگ جائے، اسی کی ہو جاتی ہے

فارن ایکس چینج :۔ ایک چھلنی جو سمندر کو خالی کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔

بدیشی قرضہ :۔ ایک ڈائن جو بچے پیدا کرتی ہے۔ انھیں کھلاتی اور پالتی پوستی ہے۔ اور پھر خود ہی انھیں کھا جاتی ہے۔

راشن :۔ بھوکے پیٹ کے لئے بدہضمی دور کرنے کا چورن۔

ٹیڈی بوائے : جو ساڑھی پہن کر محبوباؤں کے دل جیتے۔

ہِل اسٹیشن :۔ صحت مند مریضوں کا ہسپتال۔

لوہاری :۔ ایک چابک، جو ہِل اسٹیشن پر نہ جانے کے جرم میں لگایا جائے۔

عرقِ انفعال

کُھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
اپنے ہی انتخاب نے رسوا کیا مجھے

کروڑپتی بن جاؤ گے

"تم جلدی کروڑپتی بن جاؤ گے!"

۱۹۳۸ء میں آج سے ۲۵ برس پہلے میں نے یہ فقرہ ایک مشہور جنتری میں پڑھا تھا۔ جنتری کا نام پرسدھ گھمنڈی جنتری" تھا جسے ملک کے مشہور و معروف جیوتشی پنڈت گھمنڈی دیال جی شائع کرتے تھے اور صرف اس لئے شائع کرتے تھے کہ ان کے والد صاحب قبلہ پنڈت پاکھنڈی دیال جی بھی ہر سال جنتری ہی شائع کرتے تھے۔

اور انھیں پنڈت گھمنڈی دیال جی نے ۱۹۳۸ء کی پرسدھ گھمنڈی جنتری میں میری قسمت کا حال لکھتے ہوئے پیش گوئی کی تھی کہ "تم جلد ہی کروڑ پتی بن جاؤ گے" چنانچہ پورے پچیس سال تک میں نے کروڑپتی بننے کا انتظار کیا لیکن میری بجائے جب سوسائٹی کے دوسرے رذیل اور دوئی صفت آدمی کروڑپتی بننے گئے تو میں طیش میں آگیا اور فیصلہ کیا کہ گھمنڈی لال کے علم جیوتش کے خلاف ایک

زبردست مضمون لکھ ڈالوں۔

اور اس مضمون کے سلسلے میں مجھے ۱۹۲۸ء کی تلاش میں اس شہر کے مشہور کباڑی بازار میں جانا گیا۔ ہمارے شہر کے اس کباڑی بازار کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ یہاں قدیم سے قدیم اشیا بھی بالکل نئی حالت میں مل جاتی ہیں اور پھر یہاں کے کباڑیوں کے پاس دنیا کی ہر نایاب اور نادر چیز موجود رہتی ہے مثلاً ایک دوست نے مجھ پر عجیب و غریب انکشاف کیا تھا کہ جاپان سے انھوں نے ایک تخت خریدا تھا جس پر سکندر اعظم بیٹھا کرتا تھا۔ لیکن بالکل ویسا تخت ہندوستان کے لئے کباڑی بازار میں بھی اسے دکھایا گیا۔ جس پر سکندر بیٹھ کر حکومت کرتا تھا۔

غرض یہ کباڑی بازار نوادرات دنیا سے بھرا پڑا تھا۔ یہاں وہ ترکش بھی موجود تھا جس سے ارجن نے مہابھارت کی جنگ لڑی تھی، وہ کوزہ بھی تھا جسے محمد بن قاسم پانی پیا کرتا تھا۔ وہ بہی کھاتہ بھی تھا جس میں ہیمو بقال اپنی فوج کا حساب کتاب لکھا کرتا تھا۔ اس کباڑی بازار میں ایسی انسانی کھوپڑی بھی دستیاب ہو جاتی تھی جسے ایک کباڑی بکرماجیت کی کھوپڑی کہہ کر بیچتا تھا۔ دوسرا کباڑی اسے علاءالدین خلجی کی کھوپڑی کے طور پر فروخت کرتا تھا۔

اس کباڑی بازار کے متعلق ایک لطیفہ بہت مشہور تھا کہ ایک بار ایک بوڑھا آدمی ایک کباڑی کی دکان پر پہنچا اور بولا "کیا آپ کے پاس مہاراجہ رنجیت سنگھ کی کھوپڑی موجود ہے"۔ کباڑی نے بڑے کاروباری تفاخر کے ساتھ کہا "کیوں نہیں۔ ابھی حاضر کرتا ہوں"۔ چنانچہ اندر جا کر وہ ایک کھوپڑی اٹھا لایا۔ بوڑھے کھوپڑی کو غور سے دیکھ کر کہا "معاف کیجیے میں نے خود مہاراجہ رنجیت سنگھ کو دیکھا تھا۔ ان کا سر بہت بڑا تھا مگر یہ تو چھوٹا سا سر ہے"۔ کباڑی نے جھٹ جواب دیا۔ "جناب یہ ان کے بچپن کی کھوپڑی ہے۔"

چنانچہ ایسے عالمگیر قسم کے کباڑی بازار میں کوئی وجہ نہیں تھی کہ مجھے پچیس سال پہلے کی پرسدھ گھمنڈی جنتری دستیاب نہ ہوتی۔

اس کباڑی بازار کی دکانیں چوبی کھوکھوں کی بنی ہوئی تھیں۔ شکستہ اور میلے کچیلے کھوکھوں کی یہ قطار دور سے یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی یتیم خانے میں یتیموں کی فہرست لٹکی ہوئی ہو۔

میں نے یہ فہرست ساری کی ساری دیکھ ڈالی، مگر جنتری نہ ملنا تھی نہ ملی کباڑی بازار کی آخری دکان سے جب میں مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا تو کباڑ یئے نے میرا کندھا پکڑ کر کہا "جناب اگر جنتری نہیں ملی تو نہ سہی کچھ اور لے جائیے مگر میری دکان سے خالی ہاتھ مت لوٹیے۔ میری ہاں جنتری سے زیادہ نادر چیزیں موجود ہیں۔"

"مثلاً ... ؟" میں نے تلملا کر کہا۔

"مثلاً ..." کباڑیئے نے ایک ٹوٹے پھوٹے گرامو فون پر رکھا ہوا ایک میلا کچیلا پیتل کا چراغ دکھلاتے ہوئے کہا۔ "یہ چراغ لے جائیے یہ ایک تاریخی چراغ ہے۔ شہنشاہ اکبر اس کی روشنی میں بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتے تھے۔"

کچھ ہنستے ہوئے اور کچھ روتے ہوئے میں نے عرض کیا "مگر جناب معاف کیجئے شہنشاہ اکبر تو ان پڑھ تھے۔"

"تو پھر یہ اکبر نہیں ہوگا شاہ جہاں ہوگا۔" کباڑیئے نے کاروباری دقار کی خاطر اپنی غلطی کی فوراً تصحیح کر ڈالی۔

اگرچہ جنتری کی بجائے چراغ لے جانے میں کوئی تک نہیں تھا لیکن نجانے کیوں چراغ مجھے پسند آ گیا۔ جیسے انسان کو کچھ چیزیں بلاوجہ خواہ مخواہ پسند آ جاتی ہیں جیسے شادی

سے پہلے ایک لڑکی مجھے خوامخواہ پسند آگئی تھی۔ جو بعد میں میری بیوی بن گئی اور عمر بھر کے پچھتاوے کا باعث بنی۔

میں نے اس کباڑیئے سے اس چراغ کی قیمت پوچھی اور اس سے شاید یہ سمجھ کر کہ میں کوئی ریسرچ اسکالر ہوں "مغل ریاستوں میں چراغوں کا رول" پر ایک تھیسس لکھ رہا ہوں۔ چراغ کی قیمت پچاس روپے بتادی۔ لیکن جیسے اکبر بادشاہ سے نیچے اتر کر شاہ جہاں سے بھی نیچے گرتی پڑتی آخر مغل بادشاہ تک چراغ کی بات پہنچی تو قیمت گر کر پچاس روپے سے پچاس پیسے تک آپہنچی اور سودا طے ہو گیا۔

میری بیوی نے چراغ کا استقبال بڑی سرد مہری سے کیا۔ بالکل ایسے جیسے وہ ہر شام میرا استقبال کیا کرتی تھی۔ چراغ دیکھ کر اس نے طعنہ دیا کہ تمہارا انتخاب ہمیشہ غلط ہوتا ہے تم زندگی میں کبھی کوئی صحیح چیز گھر نہیں لائے۔

میں نے کہا "میں تمھیں گھر لایا ہوں۔ ہندوستان کی کروڑوں عورتوں میں سے منتخب کر کے، کیا میرا یہ انتخاب غلط تھا؟"

بیوی کے لئے اس کی تردید مشکل تھی۔ (اگرچہ ناممکن نہیں تھی)

اور پھر اس نے اس چراغ میں ایک عجیب خوبی ڈھونڈ نکالی کہ الیکٹرک سپلائی کمپنی کی نا اہلی کی وجہ سے جب کبھی بجلی فیل ہو جائے گی تو اس بحران میں یہ چراغ بڑا سود مند رہے گا۔

اس خوبی کو دریافت کرنے کی دیر تھی کہ بیوی کو ایک دم جیسے چراغ سے محبت ہو گئی اس نے اعلان کیا کہ میں اسے ابھی مانجھ کر شیشے کی طرح چمکا دیتی ہوں۔ میری بیوی کو سگھڑاپے کا مرض لاحق ہے۔ بلکہ اس کے میکے والے

دنیا بھر میں پروپیگنڈہ کرتے پھرتے تھے کہ ہم نے ایک سگھڑ بیٹی ایک نالائق آدمی سے بیاہ دی اور نہ اس نالائق خاوند کا گھر آج تک بدنام ہو چکا تھا۔ (اور یہ بات پروپیگنڈہ کے باوجود صحیح تھی)

مگر جوں ہی بیوی نے آنگن میں جا کر اپلوں کی راکھ سے شہنشاہ اکبر کے اس چراغ کو رگڑنا شروع کیا، اچانک ایک دہشتناک سا دھماکہ ہوا اور آنگن کی زمین پھٹی۔ زمین سے دھوئیں کا ایک طوفان اٹھا، اور اس دھوئیں میں سے تقریباً پندرہ فٹ لمبا ساڑھے سات فٹ چوڑا ایک خوفناک پیکر مہیب صورت دیو نمودار ہوا۔ اور گرج کر بولا۔

"اے الہ دین! میں تیرا غلام ہوں! بتا! میرے لئے کیا حکم ہے؟"

میں اس وقت برآمدہ میں ایک آئینہ کے سامنے کھڑا اپنی ڈاڑھی کے چند تازہ تازہ سفید بال گن رہا تھا۔ دھماکے اور دھوئیں سے گھبرا کر میں اپنی اکلوتی بیوی کی طرف دوڑا، جو اس وقت تک دو تین گز دور جا پڑی تھی، اور کراہ رہی تھی۔ اور دیو اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ سچ مانیئے تو اتنے بڑے گھناؤنے دیو کو دیکھ کر میرے اپنے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ لیکن اس خیال سے کہ بیاہ کے وقت میں نے سات پھیرے لئے تھے۔ اور ہر پھیرے میں بیوی کی حفاظت کا عہد کیا تھا ـــــ لپک کر بیوی کو اٹھا لیا اور دیو کی آنکھ بچا کر دیو سے کہا۔

"تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

دیو بدستور ہاتھ جوڑے ہوئے گرج کر بولا۔

"میں الہ دین چراغ کا دیو ہوں اور یہ عورت الہ دین ہے اور میں اس کا غلام ہوں۔"

"معاف کیجئے، یہ تو شیلا ہے الہ دین نہیں ہے۔ الہ دین کمہار کا گھر اگلے

چوک پر ہے۔ آپ غلطی سے الہ دین کی بجائے شیلا کے گھر آ گئے ہیں۔"

دیو نے میری تشریح کو کلتیاً رد کرتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتا جس انسان کے پاس یہ چراغ ہو گا وہ الہ دین ہو گا۔ اس لئے یہ عورت بھی الہ دین ہے۔ اس نے مجھے بلا لیا ہے۔ اور یہ مجھے جو حکم دے گی میں اس کی تعمیل کر دوں گا۔"

حکم دینے والے الہ دین کی گھگھی بندھ چکی تھی اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور وہ مارے خوف کے مجھ سے یوں چمٹ گئی تھی جیسے کسی فلمی پوسٹر میں کوئی محبوبہ اپنے عاشق سے چمٹی ہوئی ہو۔ مجھے فوری خطرہ یہ لاحق ہو رہا تھا کہ کہیں میرے بچوں کی اس واحد ماں کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے کیونکہ وہ گذشتہ پانچ برس سے ضعف قلب کا شکار تھی اور ڈاکٹر کا آخری بل ادا کئے ہوئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں گذرے تھے۔

بیوی کے ہارٹ فیل ہونے کے احساس سے میرا اپنا ہارٹ دھڑکنے لگا کہ میری بیوی کے بیوہ ہونے میں صرف ایک آدھ منٹ کی کسر باقی ہے۔ مگر نہ جانے میری بیوی نے کون سے اچھے کرموں کا پھل تھا کہ میں نے اپنے آپ کو فوراً سنبھال لیا اور کہا۔

"جاؤ تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر شانتی پرکاش گولڈ میڈلسٹ کو بلا لاؤ۔"

مگر دیو ٹس سے مس نہ ہوا۔ جما کھڑا رہا۔

"جاؤ۔ جانے کیوں نہیں اے غلام نمک حرام!"

نمک حرام نے دھمکی دی۔

"جس کے پاس چراغ ہے میں صرف اسی کا حکم مانوں گا۔ تم کون ہوتے

ہو حکم دینے والے؟"

دیو کی سماجی کم شعوری پر مجھے سخت افسوس ہوا۔ اس کم بخت کو اتنا بھی معلوم نہیں، کہ تم جس کے غلام ہو وہ خود میری غلام ہے۔ جب وہ میرا حکم مان لیتی ہے تو تم کیوں نہیں مانتے۔ لیکن صورتِ حالات چونکہ انتہائی نازک تھی اور سوشل رشتوں پر بحث و مباحثہ سے میرا اور بیوی کا رشتہ ٹوٹ جانے کا خطرہ تھا اس لئے میں نے فوراً بیوی کے ہاتھ سے چراغ چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا۔

"اب میں اللہ دین ہوں۔ چراغ میرے پاس ہے۔"

مگر دیو شاید کچھ با اصول واقع ہوا تھا بڑے وقار لہجہ میں بولا۔

"پہلا حکم پہلے اللہ دین کا۔ دوسرے اللہ دین کا حکم بعد میں۔۔۔۔"

مجبور ہو کر میں اللہ دین نمبر ایک کے تلوے چاٹنے لگا اور کہا۔

"جانِ من! ہوش میں آجاؤ۔ خدا کے لئے کوئی حکم دے دو۔ کوئی سا بھی حکم۔ کوئی اینٹ شنٹ اوٹ پٹانگ سا حکم۔"

اور میری بیوی میں نہ جانے کیسے اتنی ہمت پیدا ہو گئی اور نہ جانے اس نے مجھ سے کہا یا دیو سے کہا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

اور پھر ایک دم زمین شق ہو گئی اور دیو دفع ہو گیا۔

کچھ دن تک ہم میاں بیوی حواس باختہ رہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہمارے ساتھ یہ کیا سلوک روا رکھا گیا ہے کہ ہم اپنی خالص اور ستھری محنت کی کمائی کے عادی تھے۔ مگر ہمیں حرام کی کمائی دکھا دی ہے۔ اور

چراغ عنایت کر دیا گیا تھا۔ اس لئے ہمارے حواس کا مختل ہوجانا "ناگزیر" تھا کیونکہ اس سے ہماری عادات و خصائل میں بڑی گڑبڑ کا اندیشہ ہو گیا تھا۔ ہم اپنی نارمل زندگی میں اس امر کے عادی ہو چکے تھے۔ کہ نئی جرابیں نہ خریدی جاسکیں تو پھٹی ہوئی جرابیں پہننے میں بھی ایک لطف آتا ہے۔ ہم تو اپنے بچوں تک کو یہ سکھا چکے تھے کہ باپ کی پرانی پتلون سے خالی بنیان بنانا ہندوستانی کلچر ہے اور ہمیں اپنے کلچر کی ہر قیمت پر حفاظت کرنی چاہیئے۔

اس لئے جب الٰہ دین کے چراغ کے تصور سے ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہم ایک منٹ میں امیر کبیر بن سکتے ہیں۔ تو ہمارے کلچر کو ایک اچانک صدمہ ہوا اور ہم اپنے ہوش اس حد تک گنوا بیٹھے، کہ پورا ہفتہ ایک دوسرے سے کھل کر بات بھی نہ کر سکے۔

سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس چراغ کو کہاں رکھا جائے۔ تاکہ نہ یہ بچوں کے ہاتھ لگے اور نہ اسے چور اٹھا کر لے جائیں۔ اس معاملے میں چور اور بچے دونوں کو ہم نے ایک سطح پر رکھا اور اسے زمین کے اس حصّے میں دبا دیا جہاں بیوی کے طلائی زیورات کا ڈبّہ دبا ہوا تھا۔ ایک قباحت تھی کہ ممکن ہے چراغ نکالنے کی کئی بار ضرورت پڑے اس لئے اس کو ٹرنک میں رکھا جائے جہاں نانا جی کی وصیت اور بیوی کے جہیز کی کچھ باقی ماندہ نشانیاں اور عریاں میگزین کے خفیہ فوٹو رکھے ہوئے ہیں۔ بڑی مشکل سے بیوی اس بات پر رضامند ہوئی کہ ٹرنک کی دو چار چابیاں رکھی جائیں۔ ایک میرے پاس رہے اور ایک میری بیوی کے پاس۔

یہ پہلا واقعہ تھا کہ میرے اور بیوی کے اعتماد کی دیوار میں دراڑ پڑ گئی، ورنہ اس سے پہلے ہم دونوں شاستروں کی ہدایات کے مطابق ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ مجھے پہلی بار شبہ ہوا کہ شاستر اور بیوی دونوں ناپائیدار ہیں اور اس چراغ کے ساتھ شاستر کا سورج نہیں جل سکتا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے بیوی سے زیادہ چابی پر یقین آیا۔

چند دن اور بے معنی طور پر گزر گئے۔

ایک دن میں چوری چھپے الہ دین چراغ کا مشہور قصہ میرزا ٹولہ کا رام پک سیلرز کے ہاں سے خرید کر رات بھر پڑھتا رہا۔

دوسرے دن جب شام کو گھر لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں بیوی الہ دین کا قصہ کتاب دوپٹے کے پلو میں چھپائے پڑھ رہی ہے۔

میں نے کہا۔

کیا پڑھ رہی ہو جانِ من!"

"بھجنوں کی ایک کتاب ہے۔ ایشور بھگتی کے بڑے بڑے سندر گیت لکھے ہیں اس میں۔"

میں نے مردانہ جرأت سے کام لے کر کتاب چھین لی۔

یہ تو الہ دین کا قصہ ہے جناب!"

میں نے طنزاً عرض کیا۔

ظاہر ہے بیوی مشتعل ہو گئی۔ بالکل ایسے ہی جیسے سبزی میں نمک زیادہ پڑ جائے تو اس کا الزام کوئل ڈپو والے پر لگا دیتی ہے کہ وہ گیلا ایندھن مہیا کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے بھڑک کر کہا۔

"میں جانتی ہوں تمھیں اب مجھ سے محبت نہیں رہی، بلکہ اب تو اس کوڑی

کالی کلوٹی چھوکری کے پیچھے گھومتے ہو۔ میں پوچھتی ہوں وہ کیوں آئی تھی ہمارے گھر؟ اب کے آئی تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

میں نے کہا۔

"دیکھو، میری محبوبہ اور الہ دین کے درمیان محبت کو مت لاؤ۔ محبت ایک مقدس عظیم جذبہ ہے اور میری محبوبہ چھوکری کا رنگ کالا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ محبت نہیں کر سکتی۔ باقی رہا ٹانگیں توڑنے کا معاملہ تو میں اپنی محبوبہ کی ٹانگوں کا تحفظ اب زیادہ معقول طریقے سے کر سکتا ہوں کیونکہ میرے پاس دیو موجود ہے۔"

یہ ایک ایسی کھلی دھمکی تھی جو بہت کم خاوند بہت کم بیویوں کو دے سکتے ہیں۔ عام حالات میں شاید میں یہ کہنے کی جرات کبھی نہ کرتا۔ بلکہ اس کالی کلوٹی چھوکری سے بدستور خاموشی اور محفوظ محبت کیے جاتا کہ محبت کی یہ دھڑکن ہمارے اپنے کانوں کو بھی سنائی نہ دیتی۔ لیکن جب سے الہ دین کا چراغ میرے قبضے میں آیا تھا میرے اندر ایک حیرت انگیز تبدیلی آ رہی تھی۔ گزشتہ آٹھ دس نسلوں سے نیکی، نجابت، شرافت اور بزدلی میرے ورثے میں آئی تھی وہ میری گرفت سے نکلتی جا رہی تھی اور اس کی بجائے وہ وحشیانہ قوت اور جارحانہ بربریت میرے اندر داخل ہو رہی تھی جو انسان کو مچھر، گیدڑ اور گدھا وغیرہ سمجھتی ہے اور اس طرح وہ تاریخی حالات پیدا کر دیتی ہے۔ جب ایک انسان دوسرے انسان کا اور ایک قوم دوسری قوم کا خون پی کر مورخین کے لیے مواد مہیا کرتی ہے۔

"میں چراغ کے اس دیو سے جو چاہے کروا سکتا ہوں۔" میں دن بھر حسین ترین خواب دیکھتا۔ "میں اگر چاہوں، تو آگرہ کے تاج محل کو اکھڑوا کر اپنے کوچہ گھاسی رام میں نصب کروا سکتا ہوں، میں اگر چاہوں تو پورے دہلی شہر کو یہاں سے جزیرۂ

انڈیمان میں منتقل کروا سکتا ہوں۔ میرے ہاتھ میں جادو ہے۔ طلسم ہے، طاقت ہے دولت ہے۔ میں عظیم ہوں، میں اندر ہوں، میں شہنشاہ ہوں، میرے قدموں پر ساری دنیا جھک سکتی ہے (اس ہندوستانی بیوی کی کیا بساط ہے؟)

میری بیوی کھجنوں کی لپیٹنگ یعنی "قصہ الہ دین چراغ کا" میرے منہ پر پٹخ کر اندر چلی گئی۔ معلوم ہوتا تھا اس کے اندر بھی وہی شہنشاہ جاگ چکا تھا۔ جو میرے اندر جاگ رہا تھا۔ اس میں بھی وہی وحشیانہ قوت اور جارحانہ بربریت جنم لے چکی تھی۔ جو میرے اندر۔ میرا ماتھا ٹھنکا یہی بیوی کتنی نرم دل، وفادار اور محکوم و بیبت کی مالک ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب یقیناً اسے بھی یہ احساس ہو چکا ہے کہ الہ دین کا چراغ اس کے پاس ہے۔ اس لئے اس دیو کے مقابلے پر میرے اس خاوند ایسے آدمی کی کیا ہستی ہے۔ میں تو دیو سے کہہ کر اسے بحر ہند میں ڈبو سکتی ہوں۔

چنانچہ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ اندر جاتے ہی وہ پلنگ پر جا گری اور منہ چھپا کر مظلوم بیویوں کی طرح بسورنے لگی۔ مگر میں انتہائی ڈھیٹ میں تھا۔ متاثر نہ ہو سکا، ورنہ مظلوم بیویوں کا رونا ہمیشہ رومانٹک لگتا ہے۔ میں نے تیزی سے ٹرنک کے تالے کی چابی گھمائی، اور چراغ نکال لیا۔

میرا پروگرام سرسری یہی تھا کہ دیو کو بلاتے ہی اسے پہلا حکم یہ دوں گا۔ کہ میری بیوی کو اٹھا کر ماؤنٹ ایورسٹ پر پھینک آؤ اور واپسی پر میری کالی کلوٹی محبوبہ کو لیتے آنا۔

میں نے جلدی جلدی فرش پر چراغ رگڑا۔ میں غصے میں اپنے آپ کو پاگل بھی محسوس کر رہا تھا، اور انتہائی دانشمند بھی۔ کیونکہ جس بیوی پر سے اعتماد اٹھ جائے اسے اپنے گھر میں رکھنا انتہائی پاگل پن تھا۔

چراغ رگڑا گیا۔

کچھ بھی نمودار نہ ہوا۔

نہ دھواں، نہ دیو، نہ دھماکہ

صرف فرش پر ایک ہلکی سی رگڑ کا نشان پڑ گیا۔

شاید چراغ کے رگڑنے میں کوئی ٹیکنیکل نقص رہ گیا ہو۔ میں نے سوچا۔ اس لئے دوسری بار میں نے اسے پوری جوانمردی سے رگڑا۔ یہ ایک ایسی زور دار رگڑ تھی۔ جیسے کوئی بڑھئی آرے سے لکڑی چیر رہا ہو۔

مگر دیو اس بار بھی نمودار نہ ہوا۔

یہ دیو کو کیا ہو گیا؟

کم بخت کہیں دوسری جگہ مصروف نہ ہو۔

کہیں ہسپتال میں بیمار نہ پڑا ہو۔

کہیں مجھ سے ناراض نہ ہو گیا ہو۔

مگر الہ دین کے قصے والا دیو کبھی بیمار نہ ہوتا تھا۔ خاصی اچھی ہیلتھ تھی اس کی۔ شاید وہ اصلی دیو ہو گا۔ اور میرے چراغ والا دیو اس کا ہندوستانی ایڈیشن ہو گا۔

قریب قریب مایوس ہو کر میں نے چراغ کو فرش پر دے مارا کہ وہ ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ لیکن میرے اس غلام دیو کا، جو تاج محل کو اٹھا کر کوچہ گھاسی رام میں نصب کر سکتا تھا۔ دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔

میں نے بیوی سے کہا

"دیو کیوں نہیں آتا؟"

اس نے جل بھن کر جواب دیا۔

"میں کیا جانوں؟ تمھاری اس کالی کلوٹی چھوکری سے عشق کرنے میں مصروف ہو گا۔"

یہ طعنہ علین میرے کلیجے میں لگا۔

میرے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔

آج کا دن مجھ پر عدم اعتماد کا دن تھا۔ پہلے بیوی پر اعتماد ٹوٹا۔ اب دیو پر دونوں میں اخلاق و کردار کی کمی دردناک تھی۔ اب کوئی کس پر اعتماد کرے۔ سچ ہے اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔ سب اکیلے ہیں۔ کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ نہ دکھ میں نہ سکھ میں۔ ہر دکھ تنہا ہے، ہر سکھ اکیلا ہے۔

درد اور بیراگ کی اس کیفیت میں میری عجیب حالت ہو گئی صاف ثابت ہو رہا تھا کہ یہ دنیا صرف مایہ ہے بلکہ سرمایہ ہے۔

سرمایہ دار، مردہ باد!

انقلاب، زندہ باد!

دنیا بھر کے دکھی لوگو! تنہا ہو جاؤ، اکیلے ہو جاؤ، ایک دوسرے سے الگ ہو جاؤ!

دنیا بھر کی بیویو! اپنے خاوندوں کے ساتھ دغا کا فراڈ چھوڑ دو۔ او رائے الہ دین کے چراغ! میری آنکھوں سے دور ہو جا۔ نہیں تو اپنی آنکھیں پھوڑ لوں گا۔

میں رونے لگا۔

بیوی پہلے ہی رو رہی تھی۔

لیکن ہم دونوں الگ الگ وجہ سے رو رہے تھے۔

بچے ہمیں روتا دیکھ کر دوڑے آئے اور وہ بھی رونے لگے ان کے رونے کی وجہ ہم دونوں سے الگ تھی۔

(''ماڈرن الہ دین'' میں سے)

ہم نوشیرواں بنے

پروفیسر شیدا اس کئی دن سے ہمیں گمراہ کر رہا تھا کہ ہم دارالسلطنت کا دورہ کریں اور بھیس بدل کر کریں، جیسے نوشیرواں بادشاہ کیا کرتا تھا۔ ہم نے نوشیرواں کا نام بچپن ہی سے سنا تھا۔ ہمارے مرحوم دادا مہاراج ادھیراج کن کھجورا تھے تو کبھی کبھی کبھار دو چار جام چڑھانے کے بعد ترنگ میں آ کر اپنے آپ کو نوشیرواں کہا کرتے تھے۔ لیکن بھیس بدل کر کبھی دورے پر نہ نکلے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ گھوڑوں والی بگھی کے بغیر وہ کہیں نہیں جا سکتے۔ چاہے ہمیں جنت کا دورہ کیوں نہ کرنا پڑے۔

لیکن ہماری مشکل کچھ اور تھی۔ ہمیں زمانہ جمہوریت میں بادشاہ بننے کا چانس ملا تھا۔ گھوڑے اور بگھی کا رواج ختم ہو چکا تھا اور ہمیں کار پر سوار ہونا پڑتا تھا۔ کار کہیں بھی جاتی، کیبنٹ سے اس کی منظوری لینی پڑتی تھی۔ ڈرائیور اس منظوری کے بغیر کار چلاتا تو اسے بادشاہ کو اغوا کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا جاتا۔ غرض جمہوری دور میں، نوشیرواں بننا ایک بہت بڑا رسک (R I S K) تھا۔

نسٹھل داس نے ایک اور نکتہ بتا کر ہمیں ہراساں کر دیا کہ یہ ڈیموکریسی ہے
رعایا سے براہ راست تعلق قائم کیجئے۔ ورنہ وزیر لوگ موقع پا کر آپ کو گدی سے
اتار پھینکیں گے۔ اور رعایا چوں تک نہ کرے گی۔ رعایا پر کیا
گزر رہی ہے؟ اس کا آپ کو برابر علم ہونا چاہئے۔ تاکہ آپ وزراء کی فنا طرانہ دروغ
بیانیوں کا پول کھول سکیں۔

مقام تاسف ہے کہ نسٹھل داس کا سیاسی شعور ہم سے بہت زیادہ گہرا
ہے۔ ورنہ بیچارے یہ پہرا مٹی میں کیوں رُل رہا ہے۔

بہرحال ہم نوشیرواں بننے کے لئے بے قرار بھی ہیں اور جیتے ہوئے ڈرتے بھی
ہیں۔ ہمارے راج محل سے غائب ہونے کی خبر بجلی کی طرح پھیل جائے گی
اور شہر کی ساری پولیس شکاری کتوں کی طرح سونگھتی پھرے گی۔ بڑی الجھن بن
جاتی ہے۔ کیا کریں؟ کدھر جائیں؟ اے خدا! اے! اے دادا مہاراج کن
کھورانا نند جی! ہماری رہنمائی کر!

بالآخر ہماری تالا لکتی رنگ لائی اور ہم آج نوشیرواں بن کر باہر نکلے ہم نے
ایک مالی کا بھیس بنایا اور شاہی محل کے گیٹ کیپر کو شاہی اجازت نامہ دکھا کر چل
دیا۔ کیونکہ ہم نے خود ہی اجازت نامہ تحریر کیا، خود ہی دستخط کئے اور خود ہی باہر نکل
آئے۔ جل دینے کا یہ فعل ہمیں بے حد لذیذ معلوم ہوا۔ جل دیتے وقت سارے بدن
میں ایک رومانٹک سنسنی سی دوڑ گئی۔ جمہوریت میں بادشاہ بھی دھوکا دے سکتا
ہے۔ یہ ہمیں پہلی بار معلوم ہوا۔

محل سے نکل کر ایک فرلانگ تک ہم دم سادھے سیدھے چلتے رہے جیسے
ہم راجہ نہ ہوں، چور ہوں۔ جب تھک گئے تو پیپل کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو گئے
ہم نے سوچا۔ اب ہم اپنی رعایا کے درمیان آ چکے ہیں۔ لیکن بہت شش و پنج میں ہیں

کہ رعایا سے بات کیسے کریں۔ رعایا سے براہ راست باتیں کرنے کا ہمیں کوئی تجربہ نہ تھا۔

ہم کھڑے ہوئے ہانپ رہے تھے۔ ہمیں ہانپنے کا تجربہ بھی پہلی بار ہوا تھا۔ ہمارے سامنے ہماری رعایا پیادہ چل رہی تھی۔ لیکن وہ ہماری طرح ہانپ نہیں رہی تھی عادت کی بات ہے، ہم نے سوچا اگر رعایا بھی ہماری طرح بادشاہ ہوتی تو ضرور ہانپتی۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ پیدل چلنا حماقت ہے۔ جب ہماری جیب کرنسی نوٹوں سے بھری ہوئی ہے تو کیوں نہ ٹیکسی پر چلیں۔ ہم نے ایک ٹیکسی کو اشارہ دیا۔ وہ اس غرور کے ساتھ رکی جیسے ہمارے اشارے سے اس کی توہین ہوئی ہو۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک ہٹا کٹا مشٹنڈا نوجوان تھا۔ اس نے پہلے سر سے پاؤں تک ہمارا معائنہ کیا (ہم مالی کے بھیس میں تھے نا؟) اور پھر ناک چڑھا کر بولا۔ "کیا بات ہے، ہمیں کیوں روکا؟"

"ہم ٹیکسی پر سوار ہوں گے۔" ہم نے فرمان جاری کیا

"اے واہ رے ہم کی اولاد! صورت شکل سے تو مالی لگتے ہو یا موچی۔ لیکن اپنے کو 'ہم' کہتے ہو کسی بادشاہ کی ناجائز اولاد معلوم ہوتے ہو۔ کتنے پیسے ہیں پلے میں؟"

ہمارے طیش کے آتش زیر پا ہو گئے۔ کتنی بدتمیز رعایا ہے ہماری؟ جی چاہا اس کے رخسار پر طمانچہ جڑ دیں۔ لیکن مالی اور طمانچہ؟ بڑی مشکل تھی۔ اس لیے ضبط کا ایک گھونٹ بھرا اور کہا۔ "بولو۔ کتنے پیسے چاہئیں، ہزار، لاکھ، دو لاکھ، تین۔۔۔۔"

ڈرائیور نے ہم پر استہزائیہ قہقہہ لگایا اور بولا۔ "کوئی بدلیسی سمگلر لگتے ہو! میں سمگلر کو ٹیکسی میں بٹھا کر گرفتار نہیں ہونا چاہتا۔"

یہ کہہ کر وہ قہقہے کے ساتھ ٹیکسی سٹارٹ کر کے چلا گیا۔ راج محل کے باہر بادشاہ کی کتنی عزت ہوتی ہے؟ قہقہہ اس سوال کا جواب دے رہا تھا! آہ راجہ کو تو صرف راج محل ہی میں رہنا چاہیے۔ (ہم نے نشچل داس کو لاکھ لاکھ گالیاں دیں، جس نے ہمارے سربازار رسوا ہونے کا منصوبہ بنایا تھا۔)

پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک بڑھیا بیٹھی تھی اور اپنی گٹھڑی میں سے کھانا نکال کر کھا رہی تھی۔ کیا یہ درخت اس کا ڈائننگ روم ہے؟ ہمیں یہ مزاحیہ فقرہ اچانک سوجھ گیا۔ میلی چادر کے دسترخوان پر دو تین کالی کالی روٹیاں اور اچار رکھ کر بڑے مزے سے کھا رہی تھی۔ ہم اس کے قریب چلے گئے اور پوچھا "کیا تم رعایا ہو؟"

بڑھیا بولی۔ کیا مطلب؟

"میں تم سے براہ راست تعلق قائم کرنا چاہتا ہوں۔"

"کون ہو تم؟"

کیا میں اسے بتا دوں کہ میں نوشیرواں ہوں، لیکن نہیں۔ راج نیتی کی مصلحت کا تقاضا تھا کہ اپنا راز افشا نہ کروں۔ اس لئے تفریحاً کہا "میں بھی تمہاری طرح ایک رعایا ہوں۔ مہاراجہ چوپٹ ناتھ جی سے ملنے کے لئے جا رہا ہوں۔"

"بیکار ہے، وہ کوئی راجہ ہے؟ اس کے راج میں تو پیٹ بھر روٹی تک نہیں ملتی۔ اس نے میرے بے گناہ بیٹے کو جیل میں ڈال دیا۔ میں تو اس منحوس کی صورت نہ دیکھوں۔"

ڈرائیور کے بعد بڑھیا ہمیں رسوا کر رہی تھی۔ اس کے بیٹے کو کس نے جیل میں ڈالا ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا۔ ہماری معلومات کتنی ناقص تھیں۔ مزید تشریح کے لئے پوچھا "ماں! کس جرم میں تمہارے بیٹے کو جیل ہو گئی؟"

"اندھیر نگری کا جو ہوئی بیٹا! میرا بیٹا ایک زمیندار کا مزارع تھا۔ زمیندار ناجائز شراب بنانے کا دھندا کرتا تھا۔ چھاپہ جو پڑا تو زمیندار پولیس کو رشوت دے کر چھوٹ گیا

لیکن میرے بیٹے کو پھنسا دیا اور اب سنا ہے اس زمیندار نے راجہ چوپٹ ناتھ کے بیٹے کا جشن منانے کے لیے بھی ایک ہزار روپیہ دیا ہے۔ تف ہے ایسے راجہ پر جو رشوت کے پیسوں سے جشن مناتا ہے!"

بڑھیا نے ایک مشکوک نگاہ ہم پر ڈالی۔ ہمارے لباس کو دیکھا۔ کیونکہ راجہ صرف لباس ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ لباس سے وہ بالکل متاثر نہ ہوئی اور اپنے پوپلے منہ سے مسکرا کر بولی: "ہی ہی ہی! جاؤ بیٹیا) کیوں بڑھیا سے مذاق کرتے ہو؟ تم راجہ ہوتے تو ایسے گھٹیا مذاق نہ کرتے۔"

یہ کہتے کہتے اس نے گٹھڑی اپنے گھٹنے کے نیچے دبالی۔ تاکہ ہم اٹھا کر بھاگ نہ جائیں۔ اس نے ہمیں چور سمجھا تھا۔ ہمیں اپنی اس بوڑھی رعایا پر سخت غصہ آیا لیکن یہ غصہ ہم کیسے نکالیں! ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ صرف تفریحاً اسے دھمکی دی۔

"دیکھ ری بڑھیا! ہمیں راجہ تسلیم کر لے۔ ورنہ ہم تمھارے بیٹے کی طرح تمھیں بھی جیل بھجوا دیں گے!"

یہ سن کر بڑھیا نے گٹھڑی پر اپنی گرفت اور مضبوط کر دی اور واویلا مچانے لگی: "ارے کوئی بچاؤ! یہ لٹیرا میری گٹھڑی چھیننا چاہتا ہے!"

ہم گھبرا گئے اور سوچنے لگے اس ڈائن بڑھیا کے پاؤں پر گر پڑیں یا بھاگ کھڑے ہوں۔ مگر اس کا واویلا ہماری سوچ کی رفتار سے زیادہ تیز تھا۔ جسے سن کر پانچ چھ آدمی آگئے۔ بچے تماشہ سمجھ کر رک گئے۔ راہ چلتی عورتیں بھی کھڑی ہو گئیں اور اب جیسے ہم سچ مچ عوام میں گھر گئے۔

"کیا ہے مال جی؟" بہت سی آوازیں بڑھیا کی طرف لپکیں۔

"بے مُوا، مشٹنڈا، مجھے اکیلی جان کر، میری گٹھری۔۔۔"

اور ایک زنّاٹے کا طمانچہ ہمارے گال پر پڑا۔ "کیوں بے ماں کے۔۔۔ شرم نہیں آتی؟"

"اسے پکڑ کر تھانے لے چلو جی!"

"توبہ ہے! دن دہاڑے رہزنی۔ راج تھوڑے ہے، اندھیر گردی ہے!"

"ہی ہی ہی! اسے کہتے ہیں چوپٹ راجہ کا راج!"

"اور مجھے دھوکا دیتا تھا کہ میں ہی چوپٹ راجہ ہوں؟" بڑھیا نے تیل چپڑ کا اور پھر ایک اور زنّاٹے کا طمانچہ! (اس بار زیادہ پُرزور تھا۔ جبڑے تک ہل گئے)۔ اور پھر جیسے فتح کا نقارہ بجاتے ہوئے بولی! "بتاؤں تمہیں راجہ کیا ہوتا ہے؟"

"جو سرِ بازار تھپڑ کھاتا ہے۔ قہہ قہہ قہہ!"

"اور گٹھری چراتا ہے۔۔۔!"

اب ہماری پوزیشن انتہائی نازک ہو گئی تھی۔ نہ اپنے آپ کو راجہ چوپٹ ناتھ کہہ سکتے تھے اور نہ زیادہ تھپڑ کھا سکتے تھے! ایک خیال آیا، وزیرِ اعظم کو ٹیلی فون کر دیں کہ ہمیں اپنی رعایا سے نجات دلاؤ۔ لیکن وزیرِ اعظم ہماری کھلی اڑائے گا!

مگر جب چھٹا تھپڑ پڑا (ہم برابر گن رہے تھے) تو جیسے ہماری عقل کا بند ٹوٹ گیا۔ ہم نے اپنی جیب میں سے آٹھ دس کرنسی نوٹ نکالے اور ہوا میں اچھال دئے اور پھر جیسے ایک معجزہ سا ہوا۔ بچے ان نوٹوں کے پیچھے بھاگے، ریلا! کتنے ہی بھاگے اور بڑے ان بچوں کے پیچھے بھاگے۔ اور ہمارے بجائے بچوں کو تھپڑ مارنے لگے۔ ہم نے کچھ نوٹ اور اچھالے، کچھ تھپڑ اور لگے۔ یہاں تک کہ ایک نوجوان حسین دیہاتن کو بھی تھپڑ لگایا گیا۔ اب ہمیں اس تماشے میں لطف آنے لگا۔ ہم نوٹ پر نوٹ اچھالتے چلے گئے۔ ایک نے دوسرے کی گردن پکڑ لی۔ دوسرے نے تیسرے کی کلائی دبوچی۔ چوتھے نے چھرا نکال لیا۔ اور نوٹوں اور آدمیوں کو ایک ہی رفتار سے کاٹنے لگا

ہمیں ان زخمیوں پر قدرے رحم بھی آنے لگا لیکن یہ راج نیتی تھی۔ اور ہم راج نیتی کے سامنے انسانیت نہیں دکھا سکتے تھے۔ یہی لوگ جو چند منٹ پہلے رہزن کہہ رہے تھے۔ اب حاتم طائی سمجھ رہے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ اس وقت سوچ سے محروم ہو چکے تھے۔ جب انسان پیسے کے پیچھے بھاگتا ہے تو سوچ اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ لیکن ہم برابر سوچ رہے تھے کہ ہماری رعایا جن نوٹوں کی خاطر سر پھٹول کر رہی ہے، وہ دراصل ان کے اپنے ہی نوٹ تھے۔ ہم نے رعایا ہی سے وصول کئے تھے لیکن اس وقت وہ اپنی ہی چیز کو یوں لوٹ رہے تھے، جیسے وہ حرام کا مال ہو!

ہم نے رعایا کی یہ لوٹ دیکھی تو بڑھیا سے کہا "بے وقوف! اٹھ، تو بھی بڑھ کر لوٹ لے!"

بڑھیا نے رال ٹپکائی۔ بیٹا! جیتے رہو تم مجھے اپنے ہاتھ ہی سے کچھ نوٹ دیدو بھگوان تمھیں سچ مچ راجہ چوپٹ ناتھ بنا دے گا!"

ہم نے محسوس کیا ہماری ساری رعایا لیٹری ہے، مظلوم بھی لیٹرا ہے اور ظالم بھی! اور ہم ان لیٹروں کے راجہ ہیں! ہمارے منہ سے ایک فرمان اچانک نکل گیا! "بھاگ جاؤ لوٹ کر! پولیس آرہی ہے!"

اس پر جس کے جو ہاتھ لگا، لے کر بھاگ گیا اور صرف ہم باقی رہ گئے اور رہا ایک کتا کھڑا رہا، جو دم ہلا ہلا کر ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا تھا "مہاراج! صرف نوٹ ہی بانٹو گے یا روٹیاں بھی ___ روٹیاں بھی بانٹو تاکہ ایک آدھ ہم بھی لے اڑیں۔ آخر ہم بھی تو آپ کی رعایا ہیں!"

ہم نے کتے کو دھتکار دیا۔ اسے ایک ڈھیلا مارا جس کا شاید اس نے بہت برا مانا۔ کتے کے جانے کے بعد ہم تنہا رہ گئے اور پھر تنہائی سے فائدہ اٹھا کر رونے لگے۔ اپنی اور رعایا دونوں کی حالت زار پر! اور جب رو دھو کر جی کچھ ہلکا ہوا تو ہم یہ سوچ کر محل میں لوٹ آئے کہ رعایا سے تعلقات پیدا کرنے میں تصنع اور فاصلہ بھی ہے اور تقنیع زر بھی! (چوپٹ راجہ میں سے)

مسخرا

کنہیا لال کپور سے میری ملاقات کب ہوئی؟ یہ مجھے بالکل یاد نہیں۔ شاید وہ ملاقات کوئی اہم واقعہ نہ ہو جو پہلی ملاقات پر کوئی گہرا نقش چھوڑ جائے۔

لیکن اب یہ عالم ہے کہ کپور سے ملنے کے لئے طبیعت میں ابال سا اٹھنے لگتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ حسین و جمیل جسم کا مالک ہے نہ اس کے لمبے تڑنگے وزن میں کوئی کشش ہے اور نہ اس کی گفتگو اور لب و لہجہ میں کوئی جچی تلی شائستگی ہے۔ صرف ایک لیڈی کمرشہ عینک کے سوائے اس کی پوری شخصیت میں کوئی چیز چمکیلی نہیں ہے۔ بدن کے ماہرین کا خیال ہے کہ ہر شخصیت کے جسم میں سے کچھ خاص قسم کی لہریں نکلا کرتی ہیں ان لہروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک قسم کی لہریں اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ دوسری قسم کی لہریں دھکے دے دے کر اپنے سے دور پھینکتی ہیں کپور کے نصیب میں دوسری قسم کی لہریں نکلی ہیں جو جسم سے چھوٹتی ہیں تو انسان کو بھگا دیتی ہیں۔ سید سجاد ظہیر اور کپور مندرجہ بالا دونوں قسم کی لہروں کے دو الگ الگ نمائندے کہے جا سکتے ہیں

لیکن اس کے باوجود میرا عالم یہ ہے کہ میں کپور سے ملنے کے لئے مضطرب ہو اٹھتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میری اپنی لہروں میں ہی کوئی گڑبڑ ہے ورنہ کپور کے لئے مضطرب ہونا کہاں کی دانشمندی ہے؟

وہ شہروں میں رہتا ہے مگر دیہاتی خد و خال رکھتا ہے اگر وہ کسی گاؤں کے جاگیردار کا بیٹا ہوتا تو ضلع کا مجسٹریٹ بن کر اپنی دیہاتیت کو چھپا لیتا مگر وہ ایک غریب دیہاتی کا بیٹا ہے جس کی پرورش اور تربیت لائل پور کے ضلع میں جانگلی بدوؤں کے درمیان ہوئی۔ اس لئے اب چاہے وہ یونیورسٹی کا چانسلر ہی کیوں نہ بن جائے اور بورژوا سوسائٹی کے آداب ہی کیوں نہ اپنا لے لیکن محفل میں وہ ٹوس پر املیٹ رکھ کر ہاتھوں ہی سے کھانے لگے گا چھری کانٹے سے نہیں۔ کیونکہ وہ ٹھوس بستی ہوئی بنیاد کا مذاق اڑانے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ خود اس کا شکار ہونے کے لئے نہیں۔

لیکن کپور کا خیال ہے کہ وہ پھکڑ یا یوس نہیں ہے۔ اس جنم میں اسے فطرت کی طرف سے جتنی بھی چیزیں ودیعت نہیں کی گئیں وہ اگلے جنم میں مل جائیں گی اگلے جنم میں بھی نہ ملیں تو اس سے اگلے جنم میں ملیں گی۔ انسان کو کبھی چوراسی لاکھ مرتبہ جنم لینا ہے اس لئے جلنے اور کڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ "چوراسی لاکھ جنم کا آئیڈیا بہت مسرت انگیز ہے" وہ ایک تیز قہقہہ لگا کر کہتا ہے "یہ آئیڈیا سینے میں امید کی مشعلیں جلا دیتا ہے۔ چنانچہ میں آنے والے کسی نہ کسی جنم میں ہر ایک سے انتقام لوں گا۔ راجندر سنگھ بیدی سے، کرشن چندر سے، فکر تونسوی سے ہا ہا ہا۔۔"

کیا کپور یہ بات کہہ کر "چوراسی لاکھ جنم کے آئیڈیا" پر طنز کرتا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے۔ کپور کی کسی بات کا کیا اعتبار ہے کیونکہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہے کہ وہ ساٹھویں سال میں داخل ہو چکا ہے۔ جس میں سے عمر کا بیشتر قیمتی حصہ (اس کے خیال میں تین بٹہ چار حصہ) تو ضائع چلا گیا ہے۔ یعنی ایک پورا جنم

تباہ و برباد ہو گیا ہے اور اب جبکہ وہ واپسی پر راہ ہے تو اب چاہے وہ انڈیا کا پریذیڈنٹ کیوں نہ بن جائے اس سے کیا فرق پڑے گا۔ خوشی اور امنگ کے وہ لمحے تو ہاتھوں سے نکل ہی گئے۔ جبکہ وہ ایک دور افتادہ گاؤں میں سوکھے ٹکڑوں پر پیتا رہا۔ تلخیوں کے زہریلے گھونٹ پیتا رہا۔ یہاں تک کہ آٹھویں سال ہی میں ماں کی ممتا سے بھی محروم ہو گیا۔ اس لئے اب چاہے پورا بھارت اس کی ماتا بن جائے وہ اس سے محبت کی کونسی لہر کھینچ سکے گا۔

اس لئے آنے والے جسم پر بھروسہ رکھو اور قہقہے اڑاتے چلے جاؤ۔

کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے طنز نگار کپور بڑا بہادر اور جیالا انسان ہے۔ کیونکہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو ایک ہی فقرہ میں چٹکیوں سے اڑا دیتا ہے لیکن کبھی کبھی اس کی بزدلی دیکھ کر اس کے جیالے پن پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ کسی کالج میں اسے پرنسپل بننے کا یقینی چانس مل رہا تھا۔ کپور کی اپنی یہی خواہش تھی کہ اتنی عمر پروفیسری کرتے بیت گئی۔ اب اسے پرنسپل ہو ہی جانا چاہیے۔ کوالیفکیشن، تجربہ اور سفارش سبھی کچھ مکمل تھا۔ اسے انٹرویو کے لئے بلایا گیا اور اس پر سوالات کیے گئے۔

"کیوں جناب! کیا آپ سپورٹس میں دلچسپی رکھتے ہیں؟"

"جی نہیں!"

"کیا کالج میں کلچرل فنکشن کروا سکتے ہیں؟

"جی نہیں!"

کیا آپ کالج کی از سرِ نو تنظیم میں حصہ لیں گے؟"

"جی نہیں!"

اور پھر کپور نے مجھے بتایا کہ وہ یہ سن کر بے حد مسرور ہوا کہ انٹرویو بورڈ اسے نہایت نا اہل سمجھتا ہے اور اسے پرنسپل بننے کا چانس نہیں دیا جائے گا۔ اس نے جان بوجھ کر کبھی

جوابات نفی میں ہی دئے تاکہ اسے ایک ذمہ دار پوسٹ سے فرار ہونے کا لطف حاصل ہوسکے۔

یہی حالت اس کی گھریلو زندگی میں ہے۔ وہ گھر سے بھاگنا چاہتا ہے۔ حالانکہ سات بچے ایک بیوی اور ایک باپ اسے معاشی طور پر اپنے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس کا یہ فارمولا ہے کہ جب تک آدمی جیتا ہے۔ اسے گھر میں دن اور رات بھر میں زیادہ سے زیادہ ایک آدھ گھنٹہ ہی رہنا چاہیئے اور باقی وقت گھر سے باہر گزرنا چاہیئے۔ چنانچہ اگر اس کا بچہ بیمار ہے تو وہ اسے اس ڈر سے ڈاکٹر کے ہاں نہیں لے جائے گا کہ کہیں ڈاکٹر یہ نہ کہہ دے کہ بچے کا بچنا محال دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ وہ اس مفروضہ خوف سے فرار چاہنے کے لئے بیوی سے کہہ دیتا ہے کہ تم خود جا کر اسے دکھا آؤ۔ وہ یہ جانتا ہے کہ بیوی سودا سلف خریدنے کے لئے بازار جائے گی تو ڈیوڑھے دام دے آئے گی لیکن وہ اس نقصانِ مایہ کو ہنسی خوشی برداشت کرلے گا۔ وہ تو یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ اس کی پتلون کا کپڑا خریدنے کے لئے آٹھ سال کے بچے شمبھو کو بھیج دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ کتنا فرق پڑے گا؛ یہی پانچ دس بارہ روپے؛ مگر فرار تو ایک بیش قیمت چیز ہے، پانچ دس بارہ روپے سے ہزار گنا زیادہ قیمتی ـــ!!

اور اس فراریت کے حق میں اس کے پاس بڑی بڑی دلچسپ دلیلیں بھی ہیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ دنیا کی یہ ساری جدوجہد آسائش کے لئے ہے۔ آسائش اور فراریت کی سرحدیں بالکل قریب قریب ہیں۔ تم کام کس لئے کرتے ہو؟ اس لئے کہ کام کرنے کے بعد کام سے فرار حاصل کرکے پکنک پر چلے جاؤ۔ تم کام کے زیادہ بوجھ کو مشینوں پر کیوں ڈالنا چاہتے ہو؟ تاکہ تم کام سے فرار حاصل کرسکو۔ اور پھر وہ نہایت غرور سے گردن اکھاڑ لیتا ہے اور کسی حد تک جھجکتے ہوئے بے باکانہ لہجے میں کہتا ہے۔ "سوبندر دس

میں بھی تو کام کے چھ گھنٹے مقرر کیے گئے ہیں۔ آخر کیوں؟ کیا اسی لئے نہیں کہ باقی اٹھارہ گھنٹے انسان قرار کی لذت سے آشنا ہو سکے۔ گویا وہاں اٹھارہ گھنٹے قرار کے اور چھ گھنٹے کام کے ہوتے ہیں۔"

اس کا حلقۂ احباب بہت مختصر ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اس نے کوئی ایسا دوست نہیں بنایا جس پر وہ جی جان سے مرمٹے تو زیادہ مناسب رہے گا۔ یوں دیکھنے کو تو اس کے سینکڑوں دوست ہیں مگر میرا خیال ہے کہ کپور نے کسی کو اپنا دل نہیں دیا۔ اگرچہ اس میں کپور کی بدمزاجی کو دخل نہیں ہے۔ کیونکہ ٹریجڈی یہ ہے کہ اس کے پاس دل کی مقدار ہی بے حد کم ہے۔ وہ کسی کے لئے بھی بے محابا نہیں تڑپ سکتا۔ نہ اس کی یاد میں تارے گن سکتا ہے نہ آہیں بھر سکتا ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ وہ جذبات سے بالکل کورا ہے، بلکہ جھگڑا صرف مقدار کا ہے۔ وہ اگر کسی کو اپنی محبت سونپتا ہے تو دل سے نہیں بلکہ دماغ سے۔ اس کا دماغ ہی محبت کا فیصلہ کرتا ہے۔ اگر کوئی مرد ذہانت سے عاری ہے تو چاہے وہ یوسف ثانی ہی کیوں نہ ہو کپور اسے منہ نہیں لگائے گا۔ وہ کہتا ہے کہ مرد کو ذہین اور عورت کو حسین ہونا چاہیئے۔ عورت کے حسن کا فیصلہ بھی وہ دل سے نہیں دماغ سے کرتا ہے۔ علم جمالیات کے فیتے سے ہی وہ حسن نازک کو ماپتا ہے۔ پورا اُترا تو زہے نصیب ورنہ کنڈم!"

ہاں اس کے ایسے احباب کی تعداد بے شمار ہے جو کپور کو اپنا دوست سمجھتے ہیں مگر کپور انھیں بناتا رہتا ہے۔ کیونکہ اگر کپور کسی کو نہ بنائے تو اس کی زندگی اجیرن ہو جائے۔

ایک مرتبہ اس نے ایک نہایت بدصورت شاعر کو اپنا دوست بنایا۔ یہ شاعر اسے لاہور کے کافی ہاؤس میں ملا۔ وہ اسے اپنے نہایت ہی گھٹیا شعر سنا سنا کر محفل سے اپنا مذاق اڑوا رہا تھا۔ کپور نے اس کے اشعار کی تعریف۔ توصیف شروع کر دی اور نہایت سنجیدہ لہجے میں اہل محفل کے سامنے اشعار کی خوبیاں اجاگر کرنے لگا۔ بدصورت

شاعر کپور پر لٹو ہو گیا۔ دوستی کا ہاتھ آگے بڑھایا جسے کپور نے بڑے خلوصِ قلب کے ساتھ تھام لیا۔ یہاں تک کہ سبھی سمجھنے لگے کہ کپور اور بدصورت شاعر میں گاڑھی چھن رہی ہے۔

ایک بار وہی شاعر اسے مال روڈ پر مل گیا۔ علیک سلیک ہوئی۔ شاعر نے جذباتِ محبت سے چور چور ہو کر کہا "کپور صاحب! مجھے کوئی خدمت بتائیے۔ میں آپ کے کسی نہ کسی کام آنا چاہتا ہوں۔"

کپور نے کہا "رہنے دیجئے۔ دوستی میں بے تکلفی ہی اچھی رہتی ہے۔"

شاعر نے کہا "آپ میرے مخلصانہ جذبات کو ٹھکرا رہے ہیں۔"

کپور بولا "تو پھر آپ میرا صرف ایک چھوٹا سا کام کر دیجئے۔"

شاعر بولا "فرمائیے"

کپور نے نہایت سادگی سے کہا "آپ ذرا تکلیف فرما کر چند منٹ کے لئے میرے غریب خانے پر تشریف لے چلئے۔"

شاعر نے کہا "کون سا کام ہے؟"

کپور نے کہا "کچھ بھی نہیں۔ بس صرف آپ کو اپنی بیوی سے ملاؤں گا۔ اور پھر اسے بتاؤں گا کہ دیکھو تم مجھ پر خواہ مخواہ کڑھتی ہو حالانکہ دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ بدصورت آدمی موجود ہیں۔"

تو کیا وہ اس بات کے کہنے میں صرف طنز کرتا ہے اور ابلیسانہ لذت اخذ کر کے رہ جاتا ہے؟ کیا وہ اس کردار ــــ یا اس کیفیت کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے جس پر وہ اپنے طنز کا نشتر چلاتا ہے؟ نہیں! کپور یہ بات نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے اگر میں طنز کرتے وقت ہمدردی کے جذبہ کی لپیٹ میں آ جاؤں تو میرا وار خطا جائے گا اور اگر خطا نہیں جائے گا تو کیس کچھ سا واعظ ہو کر رہ جائے گا۔ میں واعظ نہیں ہوں بلکہ طنز نگار ہوں۔

چنانچہ اسی بنا پر وہ کیئوں کو بناتا رہتا ہے۔ جو لوگ اس کے طنز کا نشانہ بنتے

ہیں ان کی تین قسمیں بن جاتی ہیں۔ ایک وہ جو شکار ہی شکار رہتے ہیں اور آخری دم تک اسی سادگی کے ساتھ شکار بنے رہتے ہیں۔ ایک وہ جو اس کے طنز کے راز کو پا جاتے ہیں اور جل کر کباب ہو جاتے ہیں اور اس کے گھٹیا قسم کے انتقام لینے پر تل جاتے ہیں اور ایک وہ جو چوٹ سہہ کر اسے جب سہلانے لگتے ہیں تو شدتِ لذت سے مسکرا دیتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے تبسم آمیز آنسو بہہ نکلتے ہیں اور طنز کے اثر کی یہی معراج ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ جب وہ پہلگام کی سیاحت پر جا رہا تھا تو راستے میں اسے ایک بہت بڑے پنجابی زمیندار کے ساتھ سفر کرنے کا موقع مل گیا جسے اپنے بھدے اور بھاری گلے پر سریلے اور رسیلے ہونے کا یقین تھا۔ چنانچہ اسی مضحکہ خیز یقین کی بنا پر کپور نے اسے بتایا کہ کیا آپ نے کشمیر میں ابلتی ہوئی چائے کے تالاب بھی ملاحظہ فرمائے ہیں۔ تو زمیندار نے حیرت کے ساتھ وہ تالاب دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ کپور اس کیفیت کو اتنی سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھاتا رہا کہ بالآخر اس زمیندار کو پہلگام کے قریب گندھک کے ایک پہاڑی چشمے پر لے گیا اور اس میں سے چائے کا ایک کپ بھر کر اسے پلایا۔ جس پر زمیندار نے صرف اتنا کہا کہ یہ چائے کچھ نمکین زیادہ ہے۔ کپور نے کہا کشمیری لوگ نمکین چائے ہی پسند کرتے ہیں کیونکہ یہاں کھانڈ کی پیداوار بے حد مشکل ہے۔

اسے اپنے دبلے پتلے جسم کا شدید احساس رہتا ہے اور اسی بنا پر وہ کسی عورت کی زلفِ عشق میں گرفتار نہیں ہونا چاہتا۔ بلکہ گلی محلہ سے گزرتے ہوئے ایک نیک اور شریف بچھڑے کی طرح نکل جاتا ہے۔ وزن تولنے والی مشین سے یوں خوف کھاتا ہے جیسے شیطان لاحول سے۔ نہانے سے بہت ڈرتا ہے۔ کیونکہ نہانے میں کپڑے اتارنا پڑتے ہیں اور جسم کا تیلا پن صاف جھلک دکھانے لگتا ہے۔ سفر کرنے سے بھی گھبراتا ہے۔ کیونکہ سفر کے دوران میں دھکے لگتے ہیں ٹکٹ لینے کے لئے۔ گاڑی میں سیٹ حاصل کرنے کے لئے اسٹیشن پر اترنے چڑھنے کے لئے۔ سامان اٹھانے

اور چڑھائی کے لئے ۔ اور اس سارے عمل میں اس کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیتا ہے ۔ چنانچہ وہ سفر کو مضر سمجھتا ہے ۔ ایک مرتبہ ایک انگریز خاتون نے اس کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے کہا ۔" کپور صاحب !

"YOU ARE AS THN AS A NEEDLE"

یعنی آپ تو سوئی کی طرح پتلے ہیں ۔" کپور نے بے ساختگی سے اس چوٹ کا جواب دیتے ہوئے کہا ۔" محترمہ آپ ذرا مبالغہ سے کام لے رہی ہیں ۔ چند ایک سوئیاں مجھ سے موٹی بھی ہوتی ہیں ۔"

جسمانی کمزوری کے اس احساس نے اس میں مقابلہ کرنے کی سپرٹ کم کر دی جائے ۔ ایک مرتبہ ایک پبلشر نے اس کی کتاب شائع کر دی ۔ اور جب کپور نے اس سے رائلٹی مانگی تو پبلشر نے اسے سر بازار جسمانی مقابلے کے لئے للکارا جس پر کپور نے بڑی بے تکلف مسکراہٹ کے ساتھ کہا میں تو آپ سے مذاق کر رہا تھا اور یوں وہ کتاب پبلشر کو مفت دے دی ۔ اسی طرح ایک مرتبہ لاہور کے ایک سیاسی وکیل اور ادبی مجاہد نے اس کے ایک طنزیہ مضمون لکھنے پر ڈوئل کے لئے پکارا تو کپور نے معافی مانگ لی ۔ اس کا مقولہ ہے کہ لڑائی صرف عقلمندوں سے کرنی چاہیئے بیوقوفوں سے لڑائی کرنے میں ہڈیاں ٹوٹ جانے کا احتمال ہے جو ایک نہایت احمقانہ عمل ہے ۔ چنانچہ عقل مندوں کے ساتھ لڑائی کرنے میں اسے بے حد لطف آتا ہے ایک مرتبہ محفل جمی ہوئی تھی تو ایک انٹلکچوئیل قسم کے حضرت تشریف لائے جو کپور سے بے حد نالاں تھے ۔ چنانچہ انہوں نے باتوں باتوں میں اپنی ذہانت کا ہتھیار نکال کر کپور صاحب سے زور آزمائی شروع کر دی ۔ کپور نے کہا ۔" صاحب میں تو آپ کو بہت شریف آدمی سمجھتا تھا ۔ ان صاحب نے فوراً چوٹ کی اور کہا ۔" کپور صاحب ! میں بھی آپ کو شریف ہی آدمی سمجھتا تھا ۔" اس پر کپور بھڑک اٹھا اور بولا ۔" معاف کیجئے آپ ٹھیک کہتے تھے ، غلطی مجھ سے ہوئی ۔"

کنہیالال کپور صرف طنز نگار ہی ہے۔ بلکہ اس میں سنجیدگی اور متانت کے جراثیم بھی کافی مقدار میں ہیں۔ وہ زندگی اور سماج کے ہر مسئلہ پر اپنی ایک ___ رائے رکھتا ہے۔ مثلاً خدا کے متعلق اس کا خیال ہے کہ اس کے وجود کو تسلیم کر لینا چاہیے کیونکہ دنیا میں بیک وقت اتنی خوبصورتی اور اتنی بدصورتی پیدا کرنا کسی بہت بڑے اعلیٰ اور برتر وجود کا ہی کام ہے۔ مگر وہ کسی مذہب کو نہیں مانتا۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ کسی بھی مذہب میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں کہی گئی ہے جسے ذہین آدمی پہلے سے نہ جانتا ہو لیکن ___ وہ اچانک رومانٹک سا موڈ بنا کر کہتا ہے۔ مذہب میں جہاں جہاں بھی شعریت کے عناصر پائے جاتے ہیں وہ اسے بے حد پسند آتے ہیں۔ گیتا کے اشلوک اور قرآن کے آہنگ پر وہ جھوم اٹھتا ہے۔

وہ اردو زبان کو ایک الہامی زبان سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ دنیا کی ہر الہامی زبان کے خوبصورت ترین اور تاثر انگیز پہلو اردو زبان میں موجود ہیں۔ اس زبان کو مارنے کی کوشش بالکل ایسے ہی ہے۔ جیسے کوئی چنگیز خاں کسی بہت بڑے علمی کتب خانے کو جلا دے۔ اور اس جگہ پر ایک فوجی خیمہ گاڑ کر دے۔ "کیا اردو زبان صرف دہلی اور لکھنؤ کی زبان ہے؟" میں نے اس سے ایک بار پوچھا تو اس نے بھڑک کر جواب دیا لکھنؤ میں ___ لکھنؤ میں تو اردو زبان بے حد غلط بولی جاتی ہے انھیں تو ابھی اتنا بھی شعور نہیں کہ بلبل مذکر ہے یا مونث۔

جب اس کے احباب اسے بتاتے ہیں کہ تم ادبی اعتبار سے سٹیفن سن سے مشابہت رکھتے ہو تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا لیکن جب اسے یہ خیال آتا ہے کہ سٹیفن سن تپ دق سے مرا تھا تو وہ گھبرا جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ سٹیفن سن بالکل نہیں بنے گا۔

حالانکہ ایک ماہر پامسٹ نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ تمہاری موت ہاضمے کی خرابی کے باعث ہوگی۔

پیاز کے چھلکے

مگر خط اس کو لکھوائے کوئی تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور دھر کر کان پر گھر سے قلم نکلے

بچے کتنے ہونے چاہئیں؟

کچھ عقل مند لوگ کہہ رہے ہیں کہ کرنسی کا پھیلاؤ بڑھ رہا ہے۔ مگر میرا خیال ہے بچوں کا پھیلاؤ بڑھ رہا ہے۔ یا شاید یوں ہے۔ کہ دونوں ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی بڑھ رہے ہیں یا بچے اور کرنسی دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ مثلاً ادھر گورنمنٹ اپنی ٹکسال میں سے ایک نوٹ چھاپ کر بھیجتی ہے ادھر والدین ایک بچہ مارکیٹ میں ارسال کر دیتے ہیں۔ گورنمنٹ کو اس بات پر بڑا غصہ آتا ہے کہ یہ بچہ سالا کھائے گا کہاں سے؟ چنانچہ وہ غصے میں آ کر ایک نوٹ اور چھاپ دیتی ہے۔ جب یہ دوسرا نوٹ چھپنے کی خبر پہنچتی ہے تو ایک اور بچہ جھانک کر کہتا ہے۔ "آداب عرض ہے"

اور یوں کرنسی اور بچوں میں ایک ریس جاری ہے۔

اس ریس سے گھبرا کر گورنمنٹ جو اپنے آپ کو عقل مند بھی کہتی ہے، چلا کر کہتی ہے، فیملی پلاننگ کرو! فیملی پلاننگ کرو!۔ چنانچہ والدین بھی جو اپنے آپ

کو نہیں مالکہ گورنمنٹ کو ہی عقل مند سمجھتے ہیں۔ سوچنے لگتے ہیں۔ کہ بچوں کہ پلان کر کے ہی پیدا کرنا چاہیئے۔ ورنہ سماج واد پیدا نہیں ہوگا، بچے ہی پیدا ہوا کریں گے۔

مگر میرا خیال ہے۔ کہ جو لوگ کم بچے پیدا کرنے کے نعرے لگاتے ہیں۔ وہ پڑھے لکھے جاہل ہیں۔ کیونکہ بچے پیدا کرنے کا تعلق سماج واد سے نہیں ہے۔ صرف سماج سے ہے۔ مثلاً کم سے کم بچے کا مطلب یہ ہے۔ کہ صرف ایک بچہ پیدا کیا جائے کیونکہ ایک بچے سے کم بچے پیدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ ایک بچہ نالائق نکل آئے۔ تو آپ کیا کریں گے۔ کیونکہ تاریخ کہتی ہے کہ ہر گھر میں ایک نہ ایک بچہ ضرور نالائق نکلتا ہے۔

اس لئے اگر بچہ ہی ایک ہو تو نالائق ہونے کی ذمے داری بھی اسے ہی اٹھانا پڑے گی۔ لہٰذا ایک نالائق بچے کے مقابلے پر ایک لائق بچہ پیدا کرنا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ بوڑھا باپ اپنے پڑوسی سے کہہ سکے "اجی رکھو نا تم جی! وہ تو مجھے میرا نصیب اچھا تھا۔ کہ چھوٹا لڑکا عقل مند نکل آیا۔ ورنہ بڑے نے تو گھر کی لٹیا ہی ڈبو دی تھی۔

یعنی اب کم سے کم بچوں کی تعداد دو بچے ہو گئی۔ جو گویا سماج کی بنیادی ضرورت ہے مگر یہ دونوں بچے، لڑکے ہونے چاہئیں۔ کیونکہ اگر ان میں سے ایک لڑکا ہو۔ جو نالائق ہو اور دوسری لڑکی ہو۔ جو بیاہی جائے تو آپ کے پلے کیا باقی رہا۔ لہٰذا دو لڑکے ضرور ہونے چاہئیں۔ ایک نالائق دوسرا لائق۔ اور دو راکھی کے لئے تیسرا بچہ ایک بہن ہونی چاہیئے تاکہ بھیا کو راکھی باندھ سکے۔ بھیا کی یاد میں گیت گا سکے۔ اور ہر گھوڑے کی ٹاپ، ہر موٹر کے ہارن اور ہر بائیسکل کی گھنٹی سن کر سمجھے کہ میرا بھیا آرہا ہے۔

اور یوں سماج کی ضرورت کے لئے تین بچوں کا کوٹا منظور کرنا ہی پڑے گا۔ جب یہ تینوں بچے بڑے ہو جائیں گے۔ تو ظاہر ہے، کم بخت زمانے کی مار کھا کر

سیریس بھی ہو جائیں گے۔ اور والدین کو بور کرنے لگیں گے۔ اس سیریس پن کی بوجھل
فضا کو توڑنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ ایک ننھی ننھی سی سادہ اور معصوم، توتلی سی
آواز گھر کے آنگن میں گونجتی رہے۔ اور یوں بھی، جب والدین ادھیڑ عمر کو پہنچ
جاتے ہیں۔ تو ایک ننھے بچے کی مدھر غوں غوں سننے کی تمنا ضرور کرتے ہیں۔ والدین
جو زمانے کے تھپیڑے کھا کھا کر بلڈ پریشر کا عام شکار ہو جاتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ
ایک توتلی آواز انھیں لوری دے کے سلا سکے۔ اور اگر اپنا بچہ نہیں ہو گا۔ تو پڑوسی
کے ننھے کو سینے سے لگائے پھریں گے۔ مگر دوسروں کے بچے کا اعتبار ہے۔
آجائے تو قریب آجائے۔ نہ آئے تو دور سے انگوٹھا دکھا دے۔ اور اونچی آواز میں
کہے۔ "ممی! یہ آدمی مجھے مارتا ہے۔"

اس لئے پڑوسی کے بچے کی انسلٹ سے بچنے کے لیے چھوٹا، اپنا، ننھا
بچہ بے حد ضروری ہے۔

میں جوں جوں زیادہ سوچتا ہوں بچے بھی زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر
میں نے باقاعدہ حساب لگا کر سوچا ہے کہ آٹھ سے کم بچوں کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا
مثلاً فرض کیجئے کہ آپ کے آٹھ بچے ہوں۔ تو ان میں سے ایک لڑکا تو گھر سے ضرور
بھاگ جائے گا۔ کیونکہ تیرہ اور سترہ برس کی عمر کے درمیان ہر لڑکا گھر سے بھاگتا
ہے۔ اس لئے ریزرو سٹاک میں سے ایک بچہ الگ ضرور کر لینا چاہیے، تاکہ وہ بھاگ
سکے۔ بھگوڑے لڑکے پر پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ سماج
میں بڑا آدمی بننے کے لئے ہی بھاگتا ہے۔ صرف بھگوڑے لڑکے ہی ہوتے
ہیں۔ جو فلم کے ہیرو بن جاتے ہیں۔ میں نے اکثر بھگوڑے لڑکوں کو شاعر،
ایڈیٹر، فلاسفر بنتے دیکھا ہے۔ حتیٰ کہ آج کل جو ہمارے نیشنل لیڈر ہیں
وہ بھی گھر سے بھاگے ہوئے لڑکے ہیں۔ اور اگر لیڈر نہیں بنتے تو بڑے ہو کر

ڈاکو بن کر ابھرتے ہیں۔ مگر ابھرتے ضرور ہیں۔

چنانچہ آٹھ میں سے ایک بچہ تو آپ کو ڈاکو اور لیڈر وغیرہ بننے کے لئے سپلائیز کرنا پڑے گا۔ آٹھ میں سے ایک خارج۔ باقی رہ گئے سات۔ ان میں سے لڑکیوں کو تو ایک دم نکال ہی دیجئے۔ کیونکہ وہ پرایا دھن ہوتی ہیں۔ بینک آپ کا دھن دوسروں کا۔ وہ ضرور بیاہی جائیں گی۔ لیکن یہاں ایک احتیاط ضرور کر لیجئے کہ وہ ساتوں کی ساتوں لڑکیاں نہ ہوں۔ ورنہ سارا دھن پرایا ہو جائے گا۔ اور بینک دیوالیہ ہو جائے گا۔ کم از کم دو یا زیادہ سے زیادہ تین لڑکیاں ہی ایسی ہوں جو دامادوں کے گلے میں مڑھ دی جائیں۔ ورنہ میرے ایک دوست ہیں۔ جن کی نو لڑکیاں ہیں۔ اور ان کا گھر بالکل گرلز اسکول معلوم ہوتا ہے ایک دن میں نے ان سے کہا۔ "جناب عالی! یہ کرکٹ کی ٹیم کی کپتانی کس لئے؟"

وہ ایک گز لمبا سانس بھر کر بولے۔ "بھائی! ایک بیٹا پیدا کرنے کی خواہش میں یہ ٹریفک چل پڑا ہے۔ اور اب نان سٹاپ رکتا ہی نہیں۔"

ہاں! زیادہ بچے پیدا کرنے کے حق میں یہ مضبوط دلیل ہے۔ کہ بیٹا ضرور پیدا کیا جائے۔ ورنہ لڑکیاں چاہے لاکھ بہادر ہوں۔ مگر ہر لڑکی جھانسی کی رانی نہیں بن سکتی!" اب آپ لگائیے حساب — ایک لڑکا بھاگ گیا۔ تین لڑکیاں بیاہی گئیں۔ باقی رہ گئے صرف چار لڑکے۔ ان میں سے ایک لڑکا اس حساب میں رکھئے کہ اسے پٹائی کی جاتی رہے۔ کیونکہ ہر گھر میں ایک بچہ ایسا ضرور ہونا چاہئیے۔ جس پر ماں باپ اور بھائی بہن اپنے ہاتھ سینک سکیں۔ اور گالیاں وغیرہ دے سکیں کیونکہ گالیوں کا شور اگر پیدا نہ کیا جائے اور پٹائی نہ کی جاتی رہے۔ تو وہ گھر بالکل ڈل لگتا ہے۔ سونا سونا سا۔ پٹائی اور گالیوں سے گھر میں یوں لگتا ہے۔ جیسے یہاں

کافی ایکٹویٹی ہو رہی ہے اور گھر آباد ہے۔

اور ان آٹھوں میں سے ایک بچہ ایسا بھی ضرور ہونا چاہیئے۔ جسے سارا گھر پیار کر سکے۔ کیونکہ ہر بچے کو پیار کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے صرف ایک بچہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ جو گھر کا چراغ کہلاتا ہے۔ اگر سبھی چراغ ہوں۔ تو دیوالی سی ضرور لگتی ہے۔ لیکن تیل کا خرچہ اتنا بڑھ جاتا ہے۔ کہ گھر دیوالی مناتے مناتے دیوالیہ ہو جاتا ہے اس لئے گھر کی روشنی کے لئے صرف ایک ہی چراغ کافی ہوتا ہے۔ باقی بچے اگرچہ چراغ ہوتے ہیں۔ مگر صرف نام کے چراغ۔ کسی میں تیل نہیں ہوتا ہے تو کسی کی بتی غائب ہوتی ہے۔

یعنی اب گنتی ہو گئی چھ۔ باقی رہ گئے دو لڑکے۔ جو مس لینیٹس کے لئے ہونے چاہئیں مثلاً کوئی ایمرجنسی آن پڑے۔ جیسے دیش کی رکھشا کا مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ تو اسے فوج میں بھرتی کے لئے بھیج دیا جائے۔ فوج کی بجائے اسے جیل میں بھی بھیجا جا سکتا ہے۔ پنجاب کے ایک شہر میں پانچ بھائی ناجائز شراب بیچنے کا دھندا کرتے تھے، اور ان میں سے ایک بھائی باری باری جیل میں ہی رہتا تھا۔ نمبر تین چھوٹ جاتا تو نمبر چار کو ہتھکڑی پہننے کے لئے آگے کر دیا جاتا۔ اس طرح دھندا بھی جاری رہتا اور جیل بھی آباد رہتی۔

اور اگر لائق بیٹا کہیں شہر سے باہر نوکری کے لئے چلا جائے تو دوسرے بیٹے کو لیاقت کی ڈیوٹی پر لگا دی جائے۔ اور تیسرے کو پڑوسیوں سے دنگا فساد کرنے اور لاٹھی چارج وغیرہ کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ اور دنگے کے بعد اس سے گھر کے دوسرے کام کاج کروائے جائیں۔ مثلاً بستر بچھاؤ، حقہ بھر لاؤ، دوڑ کر شیو کا بلیڈ خرید لاؤ۔ اور لوٹتے ہوئے راشن ڈپو والے کو ملاوٹی گیہوں بیچنے پر گالیاں وغیرہ بھی دے آیا۔

غرض جو آدمی مجھے ان آٹھ بچوں میں سے ایک بھی کم یا غیر ضروری ثابت کر کے دکھا دے میں اس کا بیٹا بننے کے لئے تیار ہوں۔

کاغذ کا لباس

یورپ سے ایک "ہپی برانڈ" قسم کی خبر آئی ہے۔ کہ وہاں کاغذ کے لباس تیار کرنے کا تجربہ کیا جا رہا ہے، ظاہر ہے۔ یہ یورپ کی ایک اور ترقی کا ثبوت ہے۔ ورنہ وجہ کوئی نہیں تھی۔ کہ جب افریقہ میں ابھی انسان نے کپڑے کا لباس پہننا ہی نہیں سیکھا اور "نیچرل" بن کر گھوم رہا ہے یورپ کاغذ کے لباس تک جا پہنچا ہے۔

ہم ہندوستانی چونکہ یورپ کی نقل کرنے کو اپنے باپ دادا کا حق سمجھتے ہیں اس لئے چند سال بعد یہ کاغذی لباس ہندوستان میں پہنچ جائے گا۔ اور ویسے بھی یورپ اپنی ہر ایجاد اور ا کو ایکسپورٹ کر دیتا ہے۔ مثلاً صاحب بہادر، کالی میم، ہپی کتا راک اینڈ رول، ہنا ہو سپ جاسوسی ناول، بلیو فلمیں اور ادھ ننگے ہپی اور ہپیں۔ اس لئے کاغذی لباس بھی جلد ہی بمبئی کی بندرگاہ پر اترے گا۔ اور کناٹ پلیس کے تمام کلاتھ مرچنٹس اپنے بورڈ پر نیوارائیویل NE WARAIVEL کے نام سے چاک کے ذریعہ کاغذی لباسوں کی فہرست لکھ دیں گے۔

(۱) ۔ آرٹ پیپر کی لبش شرٹیں۔ جس پر ریتا ہیورتھ کی سہ رنگی تصویر بھی چھپی ہوئی ہے۔

(۲) ٹیرز پیرنٹ بش شرٹیں ہندوستان کے صرف مفلس باشندوں کے لئے بستی اور ایک دن کی پائیدار

(۳) بٹر پیپر کے دوپٹے۔ کالج کی مکھن ایسی حسین لڑکیوں کے لئے۔ جو صرف ایک پھونک سے پتنگ کی طرح اُڑ جائیں۔

(۴) پوسٹر پیپر کے کرتے۔ سیاسی لیڈروں کے لئے۔ جن پر سیاسی جلسے کا اعلان بھی چھپا ہوا ہو گا

نوٹ: اپنے آرڈر فوراً بک کرادیں۔ ورنہ مال ختم ہو گیا۔ تو دوسرے جہاز کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اور خطرہ ہے کہ اسرائیل اور مصر کی جنگ شروع ہو گئی۔ تو جہاز نہر سویز میں ڈبو دیا جائے گا۔

اگر ہندوستان میں ہپیوں کی طرح کاغذی لباس کا رواج بھی عام ہو گیا تو روئی کی صنعت پر برا اور کاغذ کی صنعت پر اچھا اثر پڑے گا۔ یعنی روئی اتنی سستی ہو جائے گی۔ کہ امیر لوگ شرم کے مارے اس کا استعمال ہی ترک کر دیں گے۔ اور بہت سے کھدر بھنڈار جو آج کل امیر زادیوں کے فیشن کے بل بوتے پر چل رہے ہیں بند ہو جائیں گے۔ لیکن دوسری طرف کاغذ جو پہلے ہی مہنگا ہو چکا ہے، مزید اتنا مہنگا ہو جائے گا۔ کہ بلیک کے پیسے سے بھی نہیں ملے گا۔ اور خطرہ ہے کہ بچوں کی سکول کی کاپیاں اور سکاچ وہسکی کے ریٹ ایک سطح پر آجائیں گے کاغذ کے فضول استعمال پر سرکار کی فضول پابندیاں لگ جائیں گی۔ اور شاید یہ ایک سخت دردناک لمحہ ہو گا۔ کہ سرکار اپنے اوپر پابندیاں لگائے۔ اور یہ جو سماج واد کی پبلسٹی کے لئے آئے دن خشک اور بوجھل رسالے

پمفلٹ اور دستاویزات چھاپ چھاپ کر ردی کے انبار لگاتی رہتی ہے۔ انھیں کلینیاً بند کر دے۔ اور جنتا سکھ کا سانس لے۔ کہ سماج داد سے پنڈا چھوٹا البتہ ردی کے سوداگر آہ وزاری کریں گے۔ کہ ہمارا کاروبار چوپٹ کر دیا گیا

دوسرا اثر اخباروں پر پڑے گا۔ یعنی ان کے صفحات کم اور قیمت زیادہ ہو جائے گی۔ صبح آپ کو اخبار کا پرچہ ملے گا۔ جو صرف رومال سائز کے دو صفحوں پر مشتمل ہو گا۔ اور قیمت دو روپے ہو گی۔ امیر لوگ تو اسے پڑھ کر پھینک دیں گے مگر غریب لوگ جب اسے پڑھ چکیں گے۔ تو بطور رومال جیب میں ڈال لیں گے۔ اور بوقت ضرورت نکال کر پسینہ پونچھ لیا کریں گے۔ اور جو غریب پاشالہ پتلونوں کے قائل ہوں گے۔ وہ پندرہ دنوں کے اخبار جمع کر کے درزی کے حوالے کر دیں گے۔ کہ ان سے ایک پاجامہ بنا دو — اور اگر کچھ کتر نیں بچ سکیں تو ان سے منھے کا "انڈرویئر" بھی سی دینا۔

ابھی کاغذی لباس مینوفیکچر نے یہ نہیں بتایا۔ کہ کاغذ کا لباس کتنی دیر چلے گا مثلاً صبح آپ نے کاغذ کی ایک پتلون پریس کرائی۔ پہن کر باہر نکلے تو بارش میں بھیگ گئی۔ اور کاغذ گل کر دھجی دھجی ہو گیا۔ لہٰذا ضروری ہے۔ کہ کاغذی پتلون پہننے کے بعد کار میں ہی باہر نکلا جائے۔ لہٰذا کاغذ اور کار لازم ملزوم ہو جائیں گے اور بے کار لوگ آوٹ آف پکچر ہو جائیں گے۔

مگر ایک بات ظاہر ہے۔ کہ کاغذی لباس بے حد سستا تیار ہو جائے گا۔ موجودہ سٹینڈرڈ کے مطابق قمیص پتلون پر دو اڑھائی روپے کا کاغذ لگے گا۔ اسے دھونے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ گویا صابن کی بھی بچت ہو جائے گی۔ ایک کھاتا پیتا شخص ہر روز نیا لباس پہن سکتا ہے۔ غریب آدمی ہفتے میں ایک بار اور درمیانہ کلاس والے ہفتے میں دو بار۔ لیکن اگر بابو صاحب بس پر چڑھنے کے لئے

دھکم پیل کا نشانہ بن گیا۔ تو قمیص اور پتلون دونوں پھٹ جائیں گی۔ صرف بنیان پہن کر ہی گھر جائے گا۔ اور انڈر ویئر۔ لیکن کاغذ کی بھی کئی اقسام ہوتی ہیں بالکل ایسے جیسے انسانوں کی کئی اقسام ہوتی ہیں۔ مثلاً کئی سمگلر ہیں۔ کئی بلیک مارکیٹئے، کئی سرکاری سیٹھ کئی کرپٹ افسر اور کئی غنڈے۔ اس لیے ہر قسم کا انسان اپنی ہی قسم کا کاغذی لباس پہنا کرے گا۔ اہل زر لوگ آرٹ پیپر کے سوٹ تیار کروائیں گے۔ سفید پوش شرفا، وائٹ پرنٹ کاغذ جس پر کتابیں چھپتی ہیں۔ اور جنہیں پہنے ہوئے وہ انسان کی بجائے کتابیں معلوم ہونگے لکھنؤ کے بانکے جو ململ کا کرتا، موتیے کے ہار اور کان میں بیڑی اٹکائے نکلتے ہیں۔ وہ ٹیپنگ کا کاغذ استعمال کریں گے۔ لیٹر ہیڈ کے کاغذ کے کوٹ صرف افسر لوگ پہنا کریں گے۔ تاکہ ذرا کلرکوں پر رعب پڑے۔ اور کلرک لوگ یا تو اخبار کی کاغذ سے ہی قمیص بنوائیں گے۔ اور یا اس کرافٹ پیپر سے جن سے سودا سلف لانے والے لفافے بنائے جاتے ہیں۔

البتہ وہ اپنی نکٹائی ابری پیپر کی خریدیں گے۔

اور فکر تونسوی جو پیٹر الین کا عاشق بنا پھرتا ہے اور جس کے نام بڑے اور درشن چھوٹے ہوتے ہیں۔ وہ پوسٹر پیپر کا سہارا لے گا اور دور سے آتا ہوا یوں لگے گا۔ جیسے کسی ٹریڈ یونین کا پوسٹر چلا آرہا ہو۔

ہاں انسانوں کی طرح کاغذی لباسوں کے بھی الگ الگ طبقے بن جائیں گے۔ دکانوں پر کپڑوں کے تھان کی بجائے کاغذ کے تہہ کیے ہوئے تھان رکھے نظر آئیں گے۔ ان کاغذی کپڑوں کے بھی مختلف نام ہوں گے۔ مثلاً بزاز آپ سے پوچھے گا"

"جناب! آپ کونسے کاغذ کا نائٹ سوٹ بنانا پسند کریں گے"

"اجی، جناب وہی جس پر فلمی میگزین چھپتے ہیں۔"

"فلمی میگزین تو ان پاپولر ہو گئے ہیں۔ باہر کی چمک دمک زیادہ۔ اندر سے کھکھڑوں کوں۔ آج کل تو نائیلٹ سوٹ کے لئے وہ کاغذ پسند کیا جا رہا ہے جس پر کیلنڈر چھاپے جاتے ہیں، ایک نائیلٹ سوٹ پندرہ دن چل جائے گا۔ گارنٹی ہے۔"

"چلو، وہی دے دو۔ کیا اس پر نئے سال کا کیلنڈر چھپا ہوا ہے؟"

"ہاں!"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ کم از کم پندرہ دن تک تاریخیں دیکھنے کی آسانی رہے گی۔"

شادیوں کے سہرے

دو چار دن گذرے ، دہلی میں ہر طرف شادیوں کے ہنگامے تھے۔ جسے دیکھو وہ شادی کر رہا تھا یا شادی کی دعوت پر جا رہا تھا۔ جس گلی سے گذرتے، یہ ریکارڈ زور شور سے بجتا سنائی دیتا ؎

اب آبھی جا کہ تیری راہ میں کھڑے ہیں ہم

یعنی مطلب یہ کہ لڑکی والے، لڑکے والوں کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہوتے کہ آپئے برات کا ٹائم تو آٹھ بجے رکھا تھا۔ مگر آپ آئے ہی نہیں — سوا نو بج رہے ہیں۔ کیا کارن ہے؟ ہم نے آپ کی سیوا کے لئے پائن ایپل کی پانچ سو بوتلیں منگا رکھی ہیں۔

اِدھر لڑکے والوں کے ہاں یہ جوابی ریکارڈ بج رہا ہوتا ہے ؎

ایک ندی کے دو کنارے ملنے سے مجبور

یعنی مطلب یہ کہ وہ لڑکے والوں سے مخاطب ہو کر کہتے کہ ہائے! ہم کیسے

پہنچیں، شادیاں اتنی زیادہ ہیں کہ ہمیں براتی ہی نہیں ملتے۔ دولہا کے لئے ننھا سنگھ تانگہ بان سے گھوڑی مانگی تھی، لیکن وہ گھوڑی دوسرے دولھوں کو ہی "منزل دلہن" تک پہنچانے میں مصروف ہے، ابھی فارغ ہو کر ہی نہیں آئی، مگر گھبرائیے نہیں۔ پائن ایپل کی بوتلیں واپس نہ کیجئے، کیونکہ ہم کسی نہ کسی طرح "براتی" اکٹھے کر کے لے ہی آئیں گے۔ ہر طرف آدمی دوڑا رکھے ہیں۔

براتیوں اور گھوڑیوں کی حوصلہ شکن ـــــ قلت ـــــ تو تھی ہی۔ (اگرچہ اس کے باوجود سارے بیاہ ہو گئے) لیکن ایک اور کرائسس بے حد گہرا تھا اور وہ تھا سہرا نویس شاعروں کا کرائسس۔ یوں تو دلی میں کوئی سی اینٹ اٹھا دو اس کے نیچے سے ایک شاعر نکل آتا ہے جو اپنے ہاتھ میں چھپا ہوا سہرے کا کاغذ لئے بیٹھا رہتا ہے اور اینٹ اٹھاتے ہی آپ سے پوچھتا ہے۔

"ہاں جی فرمایئے! آپ کو کس کا سہرا لکھوانا ہے؟"

"برخودار طول عمرہٗ عزیزی پروین کمار کا؟"

"دلہن کا نام لکھوایئے۔"

"عزیزہ پرا پھول کماری۔"

"تو سنئے۔ عرض کیا ہے کہ ؎

چاند کی مالن نے گوندھا سہرۂ پروین ہے
اور سہرے میں جو دھاگا ہے بڑا مہین ہے
ہے ادھر پرا پھول خوش اور ادھر پروین خوش
دونوں کی جوڑی کہو اک شہد ہے اک چین ہے

اور پھر سہرے میں دولہا کے باپ، تایا، ماموں، ممانی، بھاوج، خالہ، بوا،

حتیٰ کہ دولھا کے پسندیدہ سائیکل " ریلے " کا نام بھی 'ڈلوا' کر سہرا لکھوانے والا چلا جاتا ہے۔ اور شاعر پندرہ روپے (شاعر ذرا ہلکا ہو تو دس روپے) جیب میں ڈال کر پھر اسی اینٹ کے نیچے بیٹھ جاتا ہے اور یہ سوچ کر بے حد خوش ہوتا ہے کہ سہرا لکھوانے والے کو مصرعوں کے وزن کی سوجھ بوجھ کم تھی، ورنہ بڑی مشکل پیش آتی۔ کیونکہ لفظ "مہین" بڑی ذلیل کن حد تک بے وزن ہو گیا تھا۔ لیکن پروین کے ساتھ مہین کا ہی قافیہ چل سکتا تھا۔ کم بخت دولھوں کے بھی آج کل عجیب واہیات نام چل پڑے ہیں "پروین کمار" —— اب پروین کے باوزن قافیے کہاں سے تلاش کیے جائیں۔ "مہین" کا ایک قافیہ تھا۔ اگرچہ بے وزن تھا "دھاگے" کے ساتھ آنے سے بات میں بات پیدا ہو گئی، ورنہ "ٹین" کا قافیہ بھی چل سکتا تھا، مثلاً یوں کہ ——

پرا پھول ہے ڈبو کا آٹا، پروین خالی ٹین ہے

انہی دنوں میرے ایک دوست کے ناخلف بیٹے کی شادی تھی (دراصل میرا دوست اس کی شادی کروا کر اسے باخلف بنانا چاہتا تھا) چنانچہ میرے دوست نے مجھ سے کہا "یار ذکر تونسوی! ایک سہرا انہیں بھی لکھوانا ہے —— کوئی شاعر بتاؤ۔"

میں نے کہا "چلو، کہیں سے ڈھونڈتے ہیں، شاعروں کی کمی نہیں ہے، ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔"

چنانچہ ہم شاعر ڈھونڈنے نکلے۔ ایک تو اڑی سے [illegible] ایک شاعر صاحب گھو بچہ یادلوی ہر روز میری دکان پر بیٹھا کرتے [illegible] سے کم ہے، مگر صاحب ایسا غضب کا سہرا لکھتے کہ چاند توڑ لاتا ہے۔

"تو وہ کوئی روسی راکٹ ہو گا، شاعر نہیں ہو گا۔" میں نے کہا

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ سامنے سائیکل رکشا پر سے جناب گھونچو بادلوی گذر رہے، بینوا اڑسی نے آواز دی "ارے گھونچو کے بچے! ادھر آؤ سالے! یہ بابو صاحب سہرا لکھوانا چاہیں تم سے۔"

چنانچہ گھونچو نے دور ہی سے ہوا میں ہاتھ لہرایا اور بولے: "ہمیں فرصت نہیں پنڈت جی! کتنے روپے والا سہرا لکھوانا چاہتے ہیں؟"

"پانچ روپے دیں گے" میں نے شرح کا اعلان کیا،

اوں ہوں! ــ ابھی ابھی ساڑھے سات روپے کا ایک سہرا دے کر آ رہا ہوں اور آٹھ روپے کا ایک اور سہرا دینے جا رہا ہوں۔"

"تو ہمارے پان سگریٹ کی ادھار تو چکائے جا۔ اتنا کما رہا ہے۔" بینوا اڑسی نے موقع غنیمت سمجھا۔

"شادیاں ختم ہو لیں پنڈت جی تو پھر بات کریں گے تم سے۔ ٹاٹا!"

× × ×

دو چار اور شاعروں کی خدمت میں حاضر ہوئے، مگر کسی نے کھل کر بات نہ کی۔ ایک شاعر کی بیوی نے تو ہم پر حملہ بھی کر دینا چاہا اور گرج کر بولی ــ "میں نہیں جانتی کون فکر تونسوی شو نسوی ہے۔ پیسے دو اور سہرا لکھواؤ۔ بیس روپے سے کم نہیں لگیں گے۔ ہم نے کوئی لنگر نہیں کھول رکھا۔"

اچانک تھک ہار کر مجھے خیال آیا کہ کسی چھاپہ خانہ میں چلا جائے۔ شاید وہاں سے کسی، لنگر چلانے والے شاعر کا پتہ چل جائے۔ پریس میں پہنچے تو پریس کے مینیجر نے کہا،

"فکر صاحب! آپ بھی کتنے جاہل ہیں" (آجکل مجھے اس لفظ "جاہل" پر کبھی

غصہ نہیں آتا، جتنے سہرے چاہئیں ہم سے لیجئے۔ ہمارے پاس اس وقت کم از کم مختلف قسم کے ساڑھے چار سو سہرے موجود ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک انتخاب کر لیجئے۔"

چنانچہ میں نے ساڑھے چار سو سہروں کے ہجوم میں ڈبکی لگا دی اور ایک سہرا نکال لایا، جس پر لکھا تھا ۔ "زرنگار سہرا"

بتقریب شادی خانہ آبادی عزیزی کھوبت رائے ولد لالہ حکومت رائے ریٹائرڈ انجینئر آف تلہ گنگ"

اور نیچے شاعر کا نام لکھا تھا۔ پیش کردہ از طرف جناب بے ڈھب پانی پتوی۔ سہرے کا پہلا شعر تھا ؎

واہ کھوبت رائے کی کھو کی زینت بنا ہے آج سہرا
اور حکومت رائے کی پگڑی کا رہا ہے راج سہرا

میں نے کہا "مگر منیجر صاحب! ہمارے دولہا کا نام تو کھوبت رائے نہیں ہے بلکہ کلونت سنگھ ہے۔ اس لئے یہ سہرا نہیں چل سکتا۔"

"واہ چل کیوں نہیں سکتا؟" منیجر نے کہا "مصرعہ میں سے کھوبت رائے کو نکال کر کلونت سنگھ رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً اب مصرعہ یوں بنے گا ؎

واہ کلونت سنگھ کی کل کا زینت ہے یہ آج سہرا

میں مسکرا دیا اور بولا "بس زینت کی بجائے انت کر دیا جائے۔ مثلاً یوں کہ ؎

واہ کلونت سنگھ کی کل کا انت ہے یہ آج سہرا

"یہ بالکل ٹھیک ہے۔" منیجر نے کہا "یہی سہرا! اس بار کئی آدمی لے گئے ہیں۔ ہر ایک نے کھوبت رائے کا نام بدل کر اپنے دولہا کا نام رکھ دیا۔ اور دیکھئے

جی! یہ شاعری بھی کیا کمال کی چیز ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ کسی بیڈھب پانی پتوی نے یہ سہرا لکھ کر دیا تھا۔ اب ہر ایک دولہا کے لئے فٹ ہو رہا ہے۔ یہ ہے شاعری کا جادو!"

شاعری کے جادو سے متاثر ہو کر ہم نے سہرا چھپنے کا آرڈر دے دیا۔ اور یقین مانیے براتیوں نے اس سہرے پر اتنی تالیاں بجائیں کہ جگر مرادآبادی کو بھی اتنی داد کاہے کو ملی ہو گی۔

مکانوں کے نمبر

میں نے مکان نمبر سی - پانچ سو چار کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہاں ایک صاحب نے مجھے ڈنر پر بلایا تھا۔ یہ صاحب شاعری بھی کرتے تھے اور سکوٹروں کی بلیک مارکیٹنگ بھی۔ مگر مجھے انھوں نے شاعری کے سلسلے میں دعوت دی تھی — شاعری میری کمزوری تھی اور بلیک مارکیٹنگ ان کی۔

کھٹ کھٹ سن کر ایک محترمہ برآمد ہوئیں (بالکل غزل مسلسل معلوم دے رہی تھیں) میں نے عرض کیا — گردور صاحب تشریف رکھتے ہیں؟

وہ مصرع طرح گنگناتے ہوئے بولیں — یہاں کوئی گردور صاحب تشریف نہیں رکھتے۔ یہ تو رستوگی جی کا مکان ہے۔

میں نے رستوگی جی کی خوش نصیبی پر رال ٹپکائی جو اس حسین غزل میں تخلص کے طور پر لگا ہوا تھا۔ اور پوچھا — کیا یہ مکان نمبر سی۔ پانچ سو چار نہیں ہے؟

"جی نہیں" یہ مکان نمبر سی بٹہ دو، پانچ سو چار ہے

سوری! میں نے آپ کو خواہ مخواہ ڈسٹرب کیا۔ حالانکہ جی چاہتا تھا کہ گردر کا مکان مجھے ملے یا نہ ملے لیکن اس تمنا کہ اسی طرح ڈسٹرب کیے جاؤں — لیکن وہ جلدی سے گواڑ بند کر کے چلی گئی۔ اور اپنے پیچھے اپنا دلکش آہنگ۔ اور میری حسرتیں چھوڑ گئی۔

میں آگے بڑھ گیا۔ سی بٹہ دو کی پوری قطار طے کر ڈالی۔ پھر سی بٹہ تین، پھر سی بٹہ چار — مگر خالص سی کہیں ملا ہی نہیں۔ ایک دو آدمیوں سے پوچھا بھی کسی نے بتایا کہ سی بلاک اس کالونی کے شروع ہوتے ہی گندے نالے کے پاس ہے کسی نے شرمندہ کرتے ہوئے کہا سی بلاک تو اس کالونی میں ہے ہی نہیں —

ایک صاحب نے جو شاید ایک ریٹائرڈ بوڑھا تھا۔ اور سوائے ٹشکام سیو ا کے اسے اور کوئی کام نہیں رہا تھا۔ میرے کاندھے پر شفقت بھری تھپکی دیتے ہوئے بولا۔ آپ کونسی کالونی میں یہ مکان ڈھونڈنے کے لئے نکلے ہیں؟

"سینیا کالونی میں۔"

مگر یہ تو سینیا کالونی ہے۔ اور سنیتا اور سینیا دو الگ الگ عورتوں کے نام تھے۔ ہاں یاد آیا، سیتیا کالونی میں واقعی ایک سی بلاک موجود ہے۔ آپ وہاں جا کر معلوم کیجیے۔"

"سیتیا کالونی کہاں ہے؟"

"جہاں سنیتا کالونی ختم ہوتی ہے۔ سیتیا کالونی شروع ہو جاتی ہے۔"

اور اب یہ مت پوچھیے کہ سیتیا کالونی کہاں ختم ہوتی، ختم ہوتی بھی کہ نہیں اور سیتیا کالونی شروع ہوتی تو معلوم ہوا کہ یہ تو اس کا ایکسٹینشن ایریا ہے۔ پرانی سیتیا کالونی تو ان کھنڈروں کے پاس ہے جنہیں مغل بادشاہ اپنے زوال کی نشانی کے طور پر چھوڑ گئے تھے۔ بہرکیف تین بھی بے حد ڈھیٹ ثابت ہوا۔ اور آخر جو ئندہ یابندہ، سی

بلاک تلاش کر ہی لیا۔ اور جب سی نمبر پانچ سو تین والے مکان تک پہنچا تو بلاک ختم ہو گیا۔ وہ سی بلاک کا آخری مکان تھا۔ اور مجھے مکان نمبر پانچ سو چار کی تلاش تھا۔

میں نے پھر ایک صاحب سے پوچھا — "یہ مکان نمبر پانچ سو چار کہاں پر واقع ہو گا جناب!"

جناب نے اطلاع دی۔ اس سی بلاک کا بقیہ حصہ ڈی بلاک کے عقب میں بنا ہوا ہے۔ پانچ سو کے بعد کے نمبر وہاں سے شروع ہوتے ہیں۔ اور وہ بقیہ حصہ اصل سی بلاک سے تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔

شاید ستاروں کی چال میرے ساتھ تھی۔ یا میں نے پچھلے جنم میں کسی اندھے فقیر کو سڑک پار کرائی تھی۔ کہ میں واقعی مکان نمبر سی، پانچ سو چار کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مکان سے ایک محترمہ باہر نکلیں۔ (کانی بے وزن شعر معلوم دے رہی تھیں) — میں نے پوچھا — گردوار صاحب تشریف رکھتے ہیں؟

"جی نہیں۔ وہ سی پانچ سو آٹھ والے گردوار صاحب کے ہمراہ تھانے تک گئے ہیں۔ ان کا مالک مکان کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ اسے ذرا سمجھانے گئے ہیں۔"

"مگر جی! مجھے انھوں نے ڈنر پر بلایا تھا۔"

"ہاں، ہاں، وہ سی پانچ سو دس والے سے کہہ تو رہے تھے کہ آج میرے گھر میں ایک بہت بڑا ادیب کھانے پر آ رہا ہے، اندر تشریف لائیے۔ میں نے سی پانچ سو ایک والے کے لڑکے کو مچھلی لانے کے لئے بھیج دیا ہے۔ ان کی واپسی تک ڈنر تیار ہو جائے گا۔"

اور مجھے مچھلی اور کھانے سے زیادہ اس بات میں دلچسپی ہونے لگی۔ کہ یہ ماڈرن زمانے کے انسان اپنے نام سے نہیں پہچانے جاتے۔ بلکہ مکان کے نمبروں سے پہچانے جاتے بلکہ مکان کے نمبروں سے پہچانے جاتے ہیں۔ جیسے ہم انسان نہیں ہیں مکان

ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ سامنے گردور صاحب کھڑے ہیں۔ بلکہ یہ کہ مکان نمبر سی پانچ سو چار والے کھڑے ہیں۔ انھیں مکان سی پانچ والے نے دھمکی دی ہے کہ اگر آپ نے سی چھ والے کے حق میں گواہی دی تو سی سات والا اپنے سی آٹھ والے بہنوئی کو لے کر سی دس والے کے پاس نتنکا بینت لے کر پہنچ جائے گا۔ اور سارے ناک میں آپ کی تھڑی تھڑی ہو جائے گی۔

ہاں۔ یہ ہم نئے زمانے میں سانس لینے والے انسانوں کی پرابلم ہے کہ آپ کسی انسان کا نام لیں۔ تو آپ کے ذہن میں اس نام سے کوئی چہرہ نہیں ابھرتا لیکن مکان کا نمبر پکاریں۔ تو وہاں رہنے والے کی تصویر ابھر آتی ہے۔ کہ اچھا وہ صاحب جن کی ناک پکوڑا سی ہے۔ اور اگلا ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ اس کا نام گردور ہے۔ مگر صرف گردور کہنے سے خدوخال نہیں بنتے۔ کیونکہ مکان نمبر سی پانچ سو چار میں بھی گردور رہتا ہے اور سی پانچ سو آٹھ میں بھی اور پندرہ میں بھی) ۔۔ اس لئے پندرہ نمبر مکان کا گردور الگ ہو گا۔ یعنی وہ ایئر ڈویژن میں کلرک ہو گا۔ مگر دس نمبر مکان والا گردور ناجائز چرس کا دھندا کرتا ہو گا۔

غرض ہمارا اصلی کیریکٹر مکان کے نمبر کے ساتھ مخصوص ہے نام کے ساتھ نہیں۔

اور پھر شاید سوشلزم وغیرہ لانے کے لئے نئی کالونیوں کے سبھی مکان ایک ہی ٹائپ کے بنائے گئے ہیں۔ کیونکہ مکان بناتے وقت اس پرانے شعر کو مدنظر رکھا گیا کہ:

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

مجھے یاد ہے۔ ایک مرتبہ میرے ایک پڑوسی کے گھر ڈاکیہ ایک ٹیلی گرام دے گیا کہ آپ کے انکل انتقال فرما گئے ہیں۔ چنانچہ اس گھر میں رونے پیٹنے کے لئے ایک بڑا در

چھا دی گئی اور ماتم پرسی کرنے والوں کا انتظار کیا جانے لگا۔ آدھ گھنٹے تک دوپہر بیتے جانے کے بعد ڈاکیہ لوٹ آیا۔ اور بولا۔ معاف کیجئے۔ وہ تار مکان نمبر بی تراسی کا تھا۔ مگر آپ کے مکان کا نمبر تو بی اکیاسی ہے۔ اور آپ کے نام کا تو ایک منی آرڈر ہے۔ غلطی سے منی آرڈر مکان نمبر بی تراسی کو دے آیا تھا۔

اور یوں انکل کے آنسو منی آرڈر کی مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئے۔ اور رونا دھونا مکان نمبر بی تراسی کی طرف منتقل ہو گیا۔

میں نے مشتعل ہو کر ڈاکیے سے پوچھا۔ "ہیڈ بیٹھے ؟ یہ فاش غلطی تم نے کیوں کی ؟"

وہ گڑگڑا کر بولا ـــ اجی کیا کریں ان مکانوں کے ڈیزائن اور رنگ روپ ایک جیسے لگتے ہیں ان کی الگ الگ کوئی پہچان ہی نہیں ہے۔ نمبر والے نمبروں کے۔ اور نمبر کم بخت بہت مدھم پڑ گئے ہیں۔ صحیح پڑھے ہی نہیں جاتے ـــ مرنے والوں کے گھر منی آرڈر پہنچ جاتے ہیں اور منی آرڈر والے کے گھر میں سیاپا شروع ہو جاتا ہے۔

منی بس

دہلی میں منی بسیں چلتی ہیں تو یوں لگتا ہے منی سکرٹ پہنے فلم "بوبی" کی ہیروئن ٹھمکتی جا رہی ہے اور تکمیل شوق کی دعوت دیتے ہوئے کہہ رہی ہے۔ "آؤ آؤ! تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں۔ نظام الدین، کھوگل، لاجپت نگر۔"

اور جب آپ اپنی تمناؤں کی رال ٹپکاتے ہوئے۔ اس منی سکرٹ کا دامن پکڑتے ہیں اور بس میں داخل ہو جاتے ہیں تو آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ خود داخل نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ کسی نے آپ کو بالوں سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا ہے۔ آپ چلا اٹھتے ہیں۔ "روکو بس میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے باہر نکلنے دو۔"

اور کنڈکٹر جواب دیگا۔ "اب مشکل ہے صاحب! ہماری منی بس میں جو ایک بار اندر آگیا وہ نہ اندر کا رہا نہ باہر کا۔ نکالئے پیسے کہاں جانا ہے آپ کو؟"

"جہنم میں"

"تو ساڑھے پیسے نکالئے!"

"مگر مجھے تو یہاں پاؤں ٹکانے کے لئے ایک انچ جگہ نہیں مل رہی — میں باہر نکلنا چاہتا ہوں۔"

"باہر جانے کی ٹکٹ بھی ساٹھ پیسے میں ملتی ہے۔ نکالئے ساٹھ پیسے!"

اور آپ ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں اور خاموش ہوجاتے ہیں۔ ٹھنڈی سانس کو بھی نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ کیونکہ منی سکرٹ کے کئی شیدائیوں نے گیٹ کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔ لہٰذا سانس شیدائیوں سے ٹکرا کر آپ کے پاس ہی لوٹ آتی ہے یا آپ کے قریب کھڑی سواری کے کندھے پر جا بیٹھتی ہے۔ اور سواری کہتی ہے۔

"یہ کیا ہے؟"

"میرا ٹھنڈا سانس!"

"اوہ، میں سمجھا، کوئی مکھی ہے۔ دیکھیے، اپنی چیز اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھئے۔ دوسرے پر بوجھ مت ڈالئے۔ ورنہ میری ٹانگوں کا توازن بگڑ جائے گا دیکھتے نہیں، میں کتنی کوشش سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہوں۔"

"کنڈکٹر! کنڈکٹر صاحب جی۔ مجھے اس بلیک ہول سے باہر جانے دو!"

اور کنڈکٹر یعنی یو پی کی ہیروئن، منہ سے وسل بجا کر گنگنائے گی۔ ہم تم، اک کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے۔"

اور آپ مایوس ہو کر اپنے گردوپیش کا جائزہ لیں گے۔ منی سکرٹ کے طول و عرض پر نگاہ دوڑائیں گے تو آپ کو ایک دم معلوم ہوگا کہ آپ کا ایک پاؤں تو اس بوٹ پر رکھا ہے جو آپ کا نہیں ہے۔ تھوڑی سی تشریح کے بعد آپ کو بتایا جاتا ہے کہ یہ بوٹ ایک عینک والے بوڑھے کا ہے۔ مگر اس بوڑھے، بوٹ کے نیچے تین بوٹ اور ہیں۔ جنہوں نے ایک دوسرے کے پاؤں کو اپنے لئے سیڑھی بنا لیا ہے۔ اور جو بوٹ سب سے نیچے ہے وہ ایک ڈیڑھ کوئنٹل وزن والی دیوی جی کا

ہے اور حسرت سے کہہ رہا ہے ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

اور میرا دوسرا پاؤں کہاں ہے؟ آپ حیران ہو کر ارد گرد کھڑے لوگوں سے پوچھتے ہیں۔

"جی۔ وہ میری پتلون کے پائنچے کے ساتھ لٹک گیا ہے" ایک مہربان انسان آپ کو تسلی دیتا ہے۔

"مگر یہ میری گٹھری پر کس کا پاؤں ہے؟ میری گٹھری میں کیلے ہیں" ایک ادھیڑ عمر دیہاتی نما شہری چلا اٹھتا ہے۔

پتلون کے پائنچے والے کے پاؤں نے اپنے نیچے کیلوں کا گداز جسم محسوس کیا تو پہلے دو سیکنڈ کے لئے تو اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا لیکن پھر آنکھیں پھیر لیں بلکہ آنکھیں بند کر لیں اور جیسے یاد خدا میں مصروف ہو گیا۔

اتنے میں بس کو ایک جھٹکا سا لگا تو آپ کا ہاتھ جو بس کے ڈنڈے کی بجائے ایک نوجوان کی بغل میں دبائے ہوئے اخبار کو پکڑ کر اپنا سہارا بنائے ہوئے تھا ایک دم اخبار سے الگ ہو لیا۔ اور وہ فارغ البال ہاتھ نیا سہارا ڈھونڈنے کے لئے جو ہوا میں ٹانک ٹوئیاں مارنے لگا تو ایک محترمہ کی ساڑھی کے پلو کو پکڑ لیا۔ جو اس محترمہ کے خاوند نے پکڑ رکھا تھا۔ چونکہ ایک ساڑھی پر وہ ہاتھ ایسے تھے جیسے ایک میان میں دو تلواریں سمانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس لئے خاوند نے دانت پیس کر کہا۔

"آپ کو شرم نہیں آتی!"

خاوند دانت پیسنے کی بجائے دراصل آپ کے منہ پر طمانچہ لگانا چاہتے تھا۔ لیکن طمانچہ والا ہاتھ منی بس کی چھت کو سنبھالنے میں مصروف تھا۔

اس لئے وہ ہاتھ طمانچہ بننے کے اہل نہیں رہا تھا ۔ اگر وہ طمانچہ بن جاتا تو خاوند صاحب خود بھی قریب والی ایک اور کالجیئٹ حسینہ پر جا گرتے اور چھت ان پر گر جاتی ۔ ــــ اور پھر کالجیٹ حسینہ کے پہلو میں اپنے آپ کو "ایڈجسٹ" کئے ہوئے اس کا ایک بوائے فرینڈ بھی کھڑا تھا جس کی بغل میں ایک ہاکی تھی ۔

آپ نے محترمہ کے خاوند سے کہا آپ کا لہجہ شریفانہ اور مظلومانہ تھا " دیکھئے آپ کا یہ کہنا بجا ہے کہ مجھے شرم آنی چاہیئے اور جواباً میرا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ مجھے شرم آ رہی ہے ۔ لیکن شرم ان منی بس والوں کو آنی چاہیئے ۔ جو ہمیں انسان نہیں بھیڑ بکریاں سمجھتے ہیں ۔"

اور آپ کو حالات کا شکار ہو کر واقعی شرم آ گئی ۔ جو کسی حد تک جائز بھی تھی کیونکہ آپ نے سوچا کہ اگر یہ محترمہ میری بہن یا بیوی یا بیٹی ہوتی ۔ اور اس کی ساڑھی کا پلو کسی یا گڑ بڑ قسم کے جاٹ کے ہاتھ میں آ جاتا تو ...... ؟ اور آپ نے ہاتھ چھوڑ دیا جس سے توازن بگڑنے لگا ۔ آپ پیچھے ہٹ گئے ۔ تاکہ اپنا ہاتھ منی بس کی بائیں دیوار سے ٹکا دیں ۔ جہاں پہلے ہی کئی ہاتھ اپنی سلطنت قائم کئے ہوئے تھے ۔

جونہی آپ پیچھے ہٹے تو ایک طفلانہ آواز آئی ۔ " ڈیڈی ! میری ٹوپی اس نیلے سوٹر والے نے نیچے گرا دی ۔"

ڈیڈی ٹوپی اٹھانے کے لئے نیچے جھکا ۔ تو اس کا سر ایک اور سواری کی بغل میں جا گھسا ۔ بغل میں دو تین سر پہلے بھی گھسے ہوئے تھے ۔ انھوں نے پروٹسٹ کیا "اسے اسے ! کدھر بھاگا آتا ہے ۔ یہ ہماری سرحد ہے ۔ مائنڈ یور اون سرحد !"

اور پھر ننھے کی ٹوپی پر ایک نیم فوجی قسم کا زبردست بوٹ آ پڑا ۔ اور ٹوپی کو گھسیٹتا ہوا گیٹ تک لے گیا ۔ کیونکہ ایک بس سٹاپ آ گیا تھا اور کنڈکٹر کہہ رہا تھا چلو انکم ٹیکس دفتر یعنی ہیرا پھیری کا دفتر ۔" اور جیسے کمرے کی چابی مل گئی اور دروازہ

کھل گیا۔ پندرہ بیس سواریاں نیچے اترنے کے لئے اور بیس پچیس سواریاں اوپر چڑھنے کے لئے ایک دوسرے پر چاند ماری کر رہی تھیں، بلکہ کئی سواریوں کو تو اس دھکا پیل میں یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ انھیں اترنا ہے یا چڑھنا ہے۔ اور اترنے اور چڑھنے والوں کے درمیان کنڈکٹر کا پل تھا۔ جو کہے جا رہا تھا۔ "بغیر ٹکٹ کے جو اترے گا، اسے ننگم بودھ گھاٹ لے جاؤں گا۔ ہم بے ایمانی نہیں چاہتے۔ پیسے چاہتے ہیں۔"

اور وہ ٹکٹیں کم کاٹ رہا تھا اور پیسے زیادہ لے رہا تھا۔ ایک سواری ٹرنک لے کر اتر رہی تھی دوسری سواری ٹرنک لے کر چڑھ رہی تھی۔ دونوں ٹرنک میرے آمنے سامنے ہوئے تو دونوں ٹرنک آپس میں ٹکرا گئے۔ کنڈکٹر نے کھینچ کر ایک ٹرنک گرا دیا، ایک چڑھا دیا۔ اور پھر سیٹی دے دی۔ اور گانے لگا ؎

"ہم تم اک کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے۔"

اور دو منٹ بعد اچانک ٹرنک والی سواری چلائی۔ "روکو روکو بس! میرا ٹرنک اس جانے والے سے بدل گیا ہے جو نیچے اتر گیا ہے۔"